قرآن اور فنون لطیفہ

عطاء اللہ پالوی

دوست ایسوسی ایٹس
پرنٹرز۔ پبلشرز۔ سپلائرز
الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور

جملہ حقوق محفوظ

1999ء
محمد شاہد عادل نے
عالمین پریس سے چھپوا کر
دوست ایسوسی ایٹس اردو بازار لاہور
سے شائع کی۔
100 روپے

فہرست

تمہید	5
تصویر کشی و مجسمہ سازی	49
ڈراما	89
رقص و موسیقی	155
شعر و شاعری	210
حاصل کلام	219

تمہید

دین "اسلام" ایک ارتقاء پذیر تصور حیات (IDEOLOGY) ہے ساکن و جامد "مذہب" (RELIGION) نہیں۔ لہٰذا وہ ارتقاء کا حامی' عالمگیر نظریات کا معلن اور آفاقی معراج کا مبلغ ہے۔ اسلام میں دنیاوی اور روحانی زندگی' دو جداگانہ چیزیں نہیں۔ اس کی تمام قدریں (VALUES) بیک وقت مادی بھی ہیں اور روحانی بھی۔ دینی بھی ہیں اور دنیوی بھی۔ آپ کسی پیغمبر صادق اور حامل وحی برگزیدہ ہستی کی حیات مبارکہ کو لے لیجئے۔ وہ ہرگز یکطرفہ نہیں نظر آئے گی بلکہ وہ مادی و روحانی دونوں دنیاؤں سے یکساں وابستہ نظر آئے گی۔ پھر ظاہر ہے کہ زندگی کے لئے صرف کسی صوفی کی خانقاہ اور کسی عالم کا خلوت کدہ مخصوص نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے کس سائنسدان کی تجربہ گاہ اور کسی ماہر صنعت و فن کا کارخانہ بھی ویسی ہی اہمیت رکھتا ہے۔

پیکر انسانی روح اور مادہ دونوں کا مجموعہ ہے۔ انسان محض کھانے پینے سے زندہ نہیں رہ سکتا بلکہ روح کی نشوونما بھی ضروری ہے۔ اس کے احساسات و جذبات' ذہنی مطالبات اور دماغی ضروریات کی تسکین کے لئے "فنون لطیفہ" یعنی مصوری و نقاشی' مجسمہ سازی و سنگ تراشی' موسیقی اور شاعری وغیرہ کا وجود بھی از بس لازم ہے۔ تمدن عالم سے فنون لطیفہ کبھی جدا بھی نہیں ہو سکتے اور یہ ناممکن ہے کہ جو قوم اپنے کو قوم کہتی ہو اور متمدن ہونے کا بھی دعویٰ کرتی ہو وہ علمی و عملی طور پر فنون لطیفہ سے جاہل و کنارہ کش رہے اور اس کا تمدن بھی قابل ذکر لائق فخر اور دوسری قوموں کے لئے مثالی اور نمونہ ہو' اسلام جب عالمگیریت و آفاقیت کا دعویٰ دار ہے اور قرآن و محمدؐ جو کسی ایک زمانے' ایک ملک اور ایک قوم کے لئے نازل و مبعوث نہیں ہوئے بلکہ ابد تک ہر ملک اور ہر عہد کے ہر فرد کے لئے بلکہ میرے نزدیک ان ساتوں کروں (سبع مثانی یا سبع سموت) کے لئے' جن میں آبادیاں ہیں' ذریعہ ہدایت و رسالت ہیں'

تو یہ ناممکن ہے کہ ان کا مسلک فنون لطیفہ کے بارے میں وہ ہو جو کسی ناواقف فطرت انسانی کا ہو سکتا ہے۔ اس لئے ایک لمحے کو بھی، وہم و گمان میں بھی، یہ بات نہیں لائی جا سکتی کہ اسلام اور اس کے دستور العمل قرآن حکیم اور اس کے حامل، حکمت مآب، برگزیدہ انسان محمد رسول اللہؐ نے، مسلمانوں کے لئے فنون لطیفہ (مصوری، موسیقی، مجسمہ سازی اور شاعری وغیرہ) کو حرام یا ممنوع قرار دیا ہو، مگر اس کا کیا جواب ہے کہ آج ساری متمدن دنیا میں من حیث قوم صرف مسلمان ہی ہیں جو فنون لطیفہ میں نرے جاہل ہیں اور ہنوز عام مسلمانوں کو یہی معلوم ہے اور انہیں باور ہی کرایا جا رہا ہے کہ اسلام نے فنون لطیفہ کو حرام قرار دیا ہے اور آنحضرتؐ نے موسیقی، نقاشی، مجسمہ سازی اور شاعری وغیرہ کو ناجائز قرار دے دیا ہے اور جو مسلمان ان فنون لطیفہ کی طرف توجہ کرے وہ گمراہ ہے۔ حضرت علامہ ابوالکلام آزاد نے اپنی مشہور کتاب تذکرہ کے ص ۲۰۷ پر فرمایا ہے۔

"مدتوں تک غور کرنے کے بعد یہ حقیقت کھلی کہ امت اسلامیہ کے تمام مفاسد و مصائب کی اصلی جڑ دو ہی چیزیں ہیں جن کو یونانیت اور عجمیت سے تعبیر کرنا چاہئے سارے برگ و بار اور ثمرات فساد کو انہیں سے ظہور و نمو ہوا۔"

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے دین فطرت کا علم بردار قرآن اپنے پاس رکھتے ہوئے بھی اپنے فطری جذبات کو کچلنے کے لئے چند صدی کے بعد ہی دیگر پیروان مذہب کا مسلک اختیار کر لیا۔ اسلام سے پہلے عیسائیت میں بھی یہی کچھ ہوا۔ ڈاکٹر ایچ، ڈبلیو، ہیگڈ نے ایک جگہ عیسائی راہبوں اور پادریوں کے بارے میں لکھا ہے۔

"ابتدائی زمانے کے عیسائیوں نے فطری جذبے کو مذہبی جوش میں تبدیل کر کے ترویج مذہب کی کوشش کی۔ خیر مذہبی جوش کی گرمی تو کم ہو گئی مگر لوگوں کا جذبہ جنس باقی رہ گیا اور اس کے ساتھ پاک بازی کے تصور نے تجرد پسندی کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ انہوں نے اخلاق کو صرف جنسی پاکیزگی میں محدود کر لیا اور پاک زندگی کی بجائے انسان کے سارے فطری

جذبے کی نفی' کا نام "مذہب" رکھ لیا۔ گویا "مذہب" کا یہی کام تھا کہ فطری جذبوں کی جڑ کاٹ دے۔ آخر انہوں نے گھریلو زندگی کو خیرباد کہہ دی اور زاہد خشک ہو کر تارک الدنیا ہو گئے۔ وہ فطری جذبات کو دبانے کے لئے طرح طرح کی پابندیاں عائد اور قسم قسم کی جسمانی تکلیفیں برداشت کرنے لگے۔ یہاں تک کہ غسل اور حجامت تک سے پرہیز کرنے لگے۔ جسمانی صفائی تک کو روح کی نجاست سمجھنے لگے...... تاآنکہ یہی گندے' گھناؤنے' دبلے پتلے' خود پسند راہب جو علم و فن اور حب وطن سے ناآشنا اور فطری جذبات سے بے بہرہ تھے اور اپنی زندگی ایک طویل' بے کار' بے رحمانہ رسمی اذیت جسمانی میں گزارنا ثواب سمجھتے تھے عیسوی مذہب کے مقدس ولی (سینٹ) بن گئے۔ دوسرے مرد و عورت ان کے نقش قدم پر چلنا اچھا سمجھتے اور ان کی پاک دامنی شاہی سے بہتر سمجھی گئی۔ یہی زاہد خشک بے علم و عقل اور ناکارہ افراد' دعوی تقدس کے مستحق اور آخرت میں نجات کے امید وار بلکہ ذمہ دار گردانے گئے"۔

بالکل یہی حال مسلمانوں کا ہوا۔ اسلام ہمہ گیر اثرات و عالمگیر قوت کا ضامن اصول حیات تھا۔ مگر اس کے جسم کو آہنی کوزہ میں بند اور اس کی روح کو حجری روزن میں مقید کر دیا گیا۔ یہ ایک ایسا نظام زندگی تھا جو آسمان سے زمین تک محیط اور مشرق سے مغرب تک محیط تھا۔ مگر اسے افسردہ و مردہ بنا کے رکھ دیا گیا۔ عقلیت و عملیت' سماعت و بصارت اور جنبش و حرکت ساری چیزوں پر کڑی پابندی عائد کر دی گئی' پہرہ بٹھا دیا گیا۔ مسلمانوں سے عقل و علم چھین کر حماقت و جہالت ان کے سپرد کر دی گئی۔ دین و دنیا' مادہ روح خلوت و جلوت کی الگ الگ تقسیم ہوئی اور دین' روح اور خلوت انہیں عطا ہوا۔ دنیا مادہ اور جلوت دوسروں کا حصہ قرار پایا۔ مجمیت نے مسلمانوں کو دین سے ہٹا کر مذہب اور قرآن سے ہٹا کر روایت پر لا ڈالا اور یہ خیال بطور خاص سامنے رکھا کہ مسلمانوں کو علم و فن اور حکمت و عقل کے تمام شعبوں سے ایک دم علیحدہ کر دیا جائے کیونکہ یہ وہ چیزیں ہیں جو اس دنیا میں ترقی و عروج کا ذریعہ ہیں اور اگر اس میں مسلمانوں کا دخل عمل رہا تو یہ قوم کبھی مردہ نہ ہو گی۔ چنانچہ جس طرح

کھانے پینے کی لاتعدد چیزوں اور اس کے مواقع کو ممنوع بنایا اور حرام بتایا گیا ہے۔ اسی طرح فنون لطیفہ کو بھی محرمات کی فہرست میں داخل کر دیا گیا اور روایتیں گھڑ گھڑ کر ان کے ذریعے سے مسلمانوں کو فنون لطیفہ سے باز رکھنے کی کوشش کی گئی۔ پھر جب تک یہ روایتیں زبانی رہیں' ان کے تباہ کن اثرات نے خوفناک صورت اختیار نہ کی مگر جب انہوں نے کتابوں میں مستقلاً جگہ پالی تو پھر انہوں نے دینی ماخذ کا درجہ بھی حاصل کر لیا۔ روایات کی ابتدائی کتابوں کے مدونین و محدثین کی نیک نیتی قابل اعتماد ہو تو بھی ان کا مطمع نظر "دینی" ہرگز نہیں بلکہ سو فیصدی "تاریخی" تھا۔ نیز سب کے سب "نبی" اور "معصوم" نہیں بلکہ معمولی انسان تھے اور ذرائع تحقیق و تفتیش محدود' وہ کہاں تک اصل اور نقل میں تمیز کر کر کے چھانٹ کاٹ سکتے تھے؟ جہاں تک انسانی بساط نے ساتھ دیا۔ انہوں نے اصل اور نقل کو الگ کرنے کی کوشش کی مگر پھر بھی بہت کچھ رہ گئیں اور جو رہ گئیں انہوں نے اصل اور دینی ماخذ کا رتبہ پا لیا۔ "انسائیکلو پیڈیا اوف دی سوشل سائنس" میں "اسلام" سے متعلق مضمون کا مقالہ نگار لکھتا ہے۔

> "رسول اللہ کے بعد یہودی' عیسائی اور ایرانی تصورات نے اسلامی عقائد و نظریات کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ اسلام کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ ایک منفرد مذہب ہے (قرآن کا دعویٰ مذہب کے منفرد ہونے کا نہیں بلکہ دین کے منفرد ہونے کا ہے) اب ان حالات کے تحت اسے اس دعویٰ کو برقرار رکھنے کے لئے اس کے سوا چارہ ہی نہ تھا کہ وہ ان غیر اسلامی اثرات کے متعلق یہ اعلان کر دے کہ یہ روایات خود رسول اللہ سے منتقل ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ اس طرح پہلی چند صدیوں میں جو کچھ اسلام میں باہر سے داخل ہوا وہ سب "احادیث نبوی" کی مہر لگ کر عین اسلام بنتا چلا گیا۔ نویں صدی عیسوی (تیسری صدی ہجری) میں انھیں روایت کے مجموعے مرتب ہو کر اسلام کا مستقل ماخذ بن گئے"۔

چنانچہ اس کے تباہ کن اثرات نے تمام مسلمانوں کو آہستہ آہستہ علم و فن اور عقل و بصیرت کے سنگھاسنوں سے ہٹا کر جس طرح جہالت و فلاکت کی چٹائیوں پر سلا

دیا وہ کسی صاحب علم سے مخفی نہیں اور افسوس ہے کہ وہ ابھی تک چونکنے پر آمادہ نہیں۔

حضرت علامہ جمال الدین افغانی نے لکھا ہے۔

"مسلمانوں نے اپنے مذہبی دور ارتقاء میں جو کامیابیاں دیکھیں وہ تفصیل سے مستغنی ہیں ــــــ لیکن بعد میں کچھ قومیں دین کا لباس پہن کر سامنے آئیں اور انہوں نے دین میں بدعت وضلالت پیدا کر کے اصول دین میں ایسے مسائل شامل کر دیئے جو درحقیقت اس میں شامل نہ تھے .... جھوٹے راویوں نے احادیث وضع کر کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیں اور ان کو احادیث کی کتابوں میں ملا دیا۔ ان احادیث کے مہلک اثرات بہت دور رس تھے اور ان سے اذہان میں جو مسائل راسخ ہو گئے۔ انہوں نے ہمتوں میں کمزوری اور عزائم میں فتور پیدا کر دیا۔ بلا شبہ اہل حق نے تحقیق کر کے صحیح و موضوع احادیث کے درمیان تمیز کی اور ہر موضوع حدیث کے متعلق وضع کی تصریح کر دی مگر یہ کوشش کوئی زیادہ کارگر ثابت نہ ہوئی کیونکہ عوام میں اس کے اثرات پھیل چکے تھے اور تعلیم کے طریقوں میں اتنا نقص پیدا ہو گیا تھا کہ دین کے جو سچے اصول اور استوار بنیادیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے مسلمانوں کی ہدایت کے لئے چھوڑی تھیں۔ ان کو عوام تک پہنچانے سے حاملین شریعت قاصر تھے۔ دین کا صحیح اور حقیقی بنیادوں پر مطالعہ صرف مخصوص حلقوں اور چند کمزور افراد کی جماعت تک محدود تھا۔ شاید ان کی حرکت ارتقائی کے سکون پذیر ہونے بلکہ رجعت قہقری کرنے کا سبب یہی ہے اور یہی وہ مرض ہے جس کی تکلیفات اور مشقتیں آج بھی ہم برداشت کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دست بدعاء ہیں کہ ہمیں اس سے نجات دے اور ہمیں سلامت رکھے"۔ (مضامین جمال الدین افغانی" صفحہ نمبر ۱۲۰' نمبر ۱۲۱)

چنانچہ افغانی نے قوم کو مشورہ دیا ہے کہ۔

"قوم کا ہر فرد" اپنے عقائد کو محکم دلیلوں اور عقلی براہین پر قائم کرے کہ نقوش کی پہلی تختی عقل ہے۔ عقائد کے بارے میں ظن اور قیاس کی پیروی نہ کرے۔ صرف اپنے آباؤ اجداد کی تقلید پر قانع نہ ہو۔ دین اسلام واحد دین ہے جو بے دلیل عقائد اور ظنون کی اتباع کی مذمت اور اندھی تقلید پر سرزنش کرتا ہے۔ دینی اور دنیاوی امور میں عقل اور دلیل کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ تمام سعادتوں کو عقل اور تمام گمراہیوں کو بے عقلی کا نتیجہ ثابت کرتا ہے۔ ان اصولوں پر جو عموی فائدہ رکھتے ہیں۔ عقل و خرد کی روشنی میں نوع انسانی کی رہنمائی کرتا ہے بلکہ اپنے احکام کو فوائد اور حکمتوں کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ قرآن شریف کی طرف رجوع کیجئے۔"
(مقالات جمال الدین افغانیؒ صفحہ نمبر ۳۱)

مکتبہ نشاۃ ثانیہ (حیدر آباد) نے ایک کتاب "تصویر" کے نام سے شائع کی ہے۔ اس میں دو مقالے ہیں۔ ایک طویل تر اور دوسرا مختصر۔ اس دوسرے مختصر مقالے میں' جو مودودی صاحب کا نتیجہ فکر ہے۔ اگر کچھ ہے تو وہ پہلے ہی مقالے کی مہین سی صدائے بازگشت ہے۔ اس لئے قابل اعتنا نہیں۔ پہلا مقالہ جو طویل تر ہے اور کتاب کا اصل مواد' محترم علامہ محمد اسحاق صاحب سندیلوی کا ہے جس میں حرمت تصویر سے بحث کر کے تصویر کشی' تصویر سازی' تصویر بنی سبھی کو اسلام میں حرام اور ناجائز بتایا گیا ہے۔ ص ۹ پر ہے کہ۔ "چونکہ ہم ہر شئے پر اسلامی نقطہ نظر سے غور کرنے کے لئے بحیثیت مسلم مجبور ہیں۔ اس لئے ہمیں یہ معلوم کرنا ہو گا کہ اسلام نے اس کے لئے کیا حد بندی کی ہے؟" اس کے بعد ص ۴۴' ۴۵ پر ہے کہ "شریعت اسلامیہ نے انسان کو بینہ حکیمانہ تعلیم دی ہے یعنی اس نے ذی روح اشیاء کی تصاویر کو ممنوع اور حرام قرار دے دیا ہے اور غیر ذی روح اشیاء کی تصاویر کو جائز و مباح کر دیا اور انسانوں کو موقع دیا کہ وہ اس کے فوائد اور منافع سے متمتع ہوں۔ تصویر کے بارے میں ذی روح اور غیر ذی روح اشیاء کا یہی وہ فرق ہے جو ذیل کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

"حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ میرے پاس جبرائیلؑ

آئے اور کہا میں آپ کے پاس کل شب بھی آیا تھا لیکن تین باتوں کی وجہ سے گھر میں داخل نہیں ہو سکا (ایک تو یہ کہ) دروازے پر تصویریں تھیں (دوسرے) مکان کے اندر جو پردہ تھا۔ اس پر بھی تصویریں تھیں اور (تیسرے) گھر میں ایک کتا بھی تھا (تو آپ یہ کیجئے) کہ جو تصویر گھر کے دروازے پر ہے۔ اس کا سر کٹوا دیجئے تاکہ اس کی شکل درخت کی سی ہو جائے (جاندار کی نہ رہے) اور گھر کے اندر جو پردہ ہے اس کے ٹکڑے کروا کر اس کے گدے بنوا لیجئے جو زمین پر رہیں' اور پیروں کے نیچے آئیں اور کتے کو نکلوا دیجئے۔ چنانچہ آنحضرت نے ایسا ہی کیا۔" (مشکوۃ بحوالہ ترمذی و ابوداؤد)

اس حدیث سے جاندار اشیاء کی تصویر کی حرمت اور جاندار و بے جان اشیاء کی تصاویر کا فرق دونوں باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ اب یہ بھی ملاحظہ فرمایئے کہ جاندار اشیاء کی تصاویر بنانے والے کے لئے کس قدر سخت وعید ہے۔

"حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آنحضور صلعم نے فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب ان لوگوں کا ہو گا جو اللہ تعالیٰ کی (صفت) خلق سے مماثلت پیدا کرنا چاہتے ہیں (یا مخلوق الہی کے مماثل چیز بنانا چاہتے ہیں)"۔ (مشکوۃ)

علامہ موصوف کی اس تحریر میں ہے کہ "شریعت" اسلامیہ نے جاندار اشیاء کی تصاویر کو حرام قرار دیا ہے اور کتا ناپاک ہے۔ ثبوت میں ایک روایت پیش کی ہے۔

دنیا کے معاملات میں بھی لوگ کسی بات کو بلا تحقیق و تلاش اور غور و فکر نہیں مانا کرتے پھر دین کا معاملہ تو کہیں زیادہ اہم ہے۔ خود قانون حیات قرآن کی رہنمائی یہ ہے۔

لیھلک من ھلک عن بینۃ ویحی من حی عن بینۃ (انفال ۵)

ترجمہ: کہ جس کو ہلاک ہونا ہے وہ بھی دلیل سے ہلاک ہو۔ اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل سے جئے"۔

اسحٰق صاحب نے تو ایک "روایت" پیش کی ہے۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ اگر نصیحت و تذکیر کے لئے آیات الٰہی بھی تمہارے سامنے پیش ہوں تو اندھے بہرے ہو کر

ان پر نہ گر پڑنا۔ یعنی سمجھ بوجھ اور دیکھ بھال کے بعد انہیں قبول کرنا۔ مسلمانوں کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے کہ۔

والذین اذا ذکروا بایات ربهم لم یخروا علیها صما وعمیانا ○ (فرقان)

ترجمہ: وہ ایسے ہیں کہ جب ان کو ان کے پروردگار کی آیات کے ذریعہ بھی نصیحت کی جاتی ہے تو وہ ان پر بہرے، اندھے ہو کر نہیں گر پڑتے"۔

لہٰذا ضروری ہے کہ محترم اسحٰق صاحب نے جو کچھ ہمارے سامنے پیش کیا ہے ہم ان پر غور و فکر کریں اور انہیں تحقیق و تدقیق کے بعد ہی قبول کریں۔

سب سے پہلے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "شریعت" کسے کہتے ہیں؟ اور یہ کون بناتا ہے؟ اور یہ کہ کیا "روایتوں" کی حیثیت ایسی ہے کہ وہ اسلام کے اہم اصولی مسائل کے لئے دینی ماخذ قرار دی جا سکیں۔ علامہ غلام احمد پرویز نے اپنے خط بنام سلیم میں اس موضوع پر نہایت عمدہ پیرائے میں لکھا ہے۔ ذیل میں اس کا کچھ حصہ ملاحظہ فرمایئے۔

"تم آفاقِ کائنات (OUTER UNIVERSE) میں غور کرو سلیم تم دیکھو گے کہ وہاں کوئی چیز خود فیصلہ نہیں کرتی کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ ان سب کیلئے پہلے سے اصول مقرر ہیں جن کی پابندی از خود ہوتی جا رہی ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ کسی صبح سورج یہ فیصلہ کرے کہ میرا فائدہ اس میں ہے کہ میں دیر سے طلوع ہوں اور زمین یہ فیصلہ کر لے کہ میں آج کچھ دیر کے لئے آرام کر لوں۔ ان کے لئے اصول اور قوانین متعین ہیں اور ان کی فطرت کے اندر داخل ہیں۔ ایک بکری کی فطرت میں ہے کہ وہ گھاس کھائے اور گوشت کی طرف نگاہ اٹھا کے بھی نہ دیکھے۔ لیکن اس باب میں انسان ان سب سے الگ ہے۔ اس کی فطرت کے اندر کوئی اصول ودیعت کر کے نہیں رکھا گیا ـــــــ اس کی زندگی کا جتنا حصہ حیوانی سطح (LEVEL ANIMAL) سے متعلق ہے۔ وہاں وہی طبعی قوانین (LAWS PHYSICAL) جبلی طور پر (BY INSTINCT) کار فرما ہیں جو

دوسرے حیوانات میں عمل پیرا ہیں۔ بھوک کے وقت کھانے کا تقاضا' پیاس میں پانی کی طلب' تکان کے بعد آرام اور نیند کی خواہش طبعی قوانین کے مطابق پیدا ہوتی رہتی ہے۔ لیکن جہاں تک اس کی زندگی کی انسانی سطح (HUMAN LEVEL) کا تعلق ہے۔ اس کی فطرت میں کوئی اصول اور قوانین نہیں رکھے گئے جن کی پابندی از خود فطرتاً" (NATURE (BY) ہوتی جائے......... اس سے لازماً" یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان کو بے اصولا ہی چھوڑ دیا گیا ہے؟ نہیں' ایسا نہیں کیا گیا۔ ایسا کرنا تو اس پر بڑی زیادتی ہوتی۔ اسے بھی زندگی کے غیر متبدل اصول دیئے گئے ہیں لیکن ان کے دینے کا ذریعہ مختلف اختیار کیا گیا ہے وہ ذریعہ یہ ہے کہ انسانوں میں سے بعض کو چن لیا جاتا اور انہیں ان محکم اصولوں کا علم دے دیا جاتا۔ ایسے انسانوں کو "نبی" اور اس ذریعہ علم کو "وحی" کہا جاتا ہے۔ جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وحی نہ تو عقل کی پیداوار ہو سکتی ہے اور نہ یہ نبی کی فطرت ہی کے اندر ہوتی ہے جو ایک وقت کے بعد نمودار ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ نبی انسان ہوتا ہے اور (یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ) ایسے اصولوں کا علم انسان کی فطرت کے اندر موجود نہیں۔ اس حقیقت کو دوسرے لفظوں میں یوں سمجھوں کہ وحی اکتسابی شے نہیں' وہبی ہے یعنی یہ نہیں کہ وحی کا امکان (POSSIBILITY) انسان کی فطرت کے اندر ہوتا ہے اور جو انسان چاہے اس صلاحیت (FACULTY) کو نشوونما دے کر (DEVELOPE) کر کے ایک دن نبی بن جائے .... ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا سلیم کہ انسانوں کو "غیر متبدل اصول زندگی" کا علم دینے کے لئے انداز یہ اختیار کیا گیا کہ بعض برگزیدہ انسانوں کو یہ علم "وحی" کے ذریعے سے عطا کر دیا گیا اور انہیں اس پر مامور کر دیا کہ وہ اس علم کو دوسروں تک پہنچا دیں۔ اس علم (وحی) کے ملنے کو "نبوت" کہتے ہیں اور اسے دوسروں تک پہنچانے کو "رسالت"۔ نبوت ختم ہو چکی ہے' کیونکہ انسانیت کے لئے جس قدر محکم اصولوں کی ضرورت تھی انہیں آخری مرتبہ ایک کتاب

(قرآن) میں محفوظ کر کے دے دیا گیا"۔

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ "شریعت" نام ہے ان غیر متبدل اصول زندگی اور قوانین الٰہی کا جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لئے مقرر فرماتا اور انہیں ایک پیغمبر پر بذریعہ وحی نازل کرتا ہے اور وہ نبی ان قوانین کو ایک کتاب میں مدون و منضبط کر کے خدا کے بندوں تک پہنچاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طور پر شریعت مقرر کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے کسی انسان کا نہیں' چاہے وہ رسول ہی کیوں نہ ہو۔ خدا جو شریعت مقرر کر کے اپنے رسول کو دیتا ہے' رسول کا فرض اسے خدا کے بندوں تک پہنچانا' نافذ کرنا اور اس پر عمل کر کے خدا کے بندوں کو دکھا دینا ہوتا ہے تاکہ وہ اسے عملی چیز سمجھ سکیں۔ کسی رسول کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خود شریعت بنائے۔ علامہ سید سلیمان ندوی سیرۃ النبی جلد ۴ ص ۳۴۶ (بڑی تقطیع) پر فرماتے ہیں۔

"عموماً" اہل مذہب پیغمبروں کو شارع مستقل سمجھتے ہیں لیکن یہ ایک قسم کا شرک ہے۔ شریعت کی تاسیس' حلال و حرام کی تعیین جائز و ناجائز کی تفریق' امر و نہی کے احکام' یہ سب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں۔ پیغمبر صرف مبلغ' پیغام رساں اور تعلیم الٰہی سے ان احکام کے شارح اور بیان کرنے والے ہیں۔"

قرآن سے اس خیال کی پوری پوری تصدیق ہوتی ہے۔ سورۃ انعام کے دسویں رکوع میں حضرات نوحؑ' ابراہیمؑ' لوطؑ' اسمعیلؑ' اسحٰقؑ' یعقوبؑ' داؤدؑ' سلیمانؑ' ایوبؑ' یوسفؑ' موسیٰؑ' ہارونؑ' الیسعؑ' الیاسؑ' یونسؑ' زکریاؑ' یحییٰؑ اور عیسیٰ علیہ السلام کے اسماء گرامی اور ان کے مختصر اوصاف بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ۔

اولئک الذین اتینھم الکتب ○ (یونس)

ترجمہ: "یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب دی تھی"۔

پھر سورۃ شوریٰ کے دوسرے رکوع میں فرمایا جاتا ہے۔

(ا) شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحا والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ

ابراهیم وموسی وعیسی (شوریٰ ۲۰)

ترجمہ : دین میں اس نے وہی شریعت تم لوگوں کے لئے متعین کی ہے جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جو تم پر وحی کی ہے اور جس کا ابراہیم' موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا گیا تھا"۔

(۲) جعلنک علی شریعتہ من الامر فاتبعہا ولا تتبع اھواء الذین لا یعلمون ○ (جاثیہ ۲)

ترجمہ : ہم نے دین کے معاملے میں تجھے ایک شریعت دے دی ہے۔ سو تو بس انہیں کا اتباع کر اور ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی ہرگز نہ کر جو کچھ نہیں جانتے لا علم ہیں۔

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ حضرت نوحؑ سے آنحضرت تک کی شریعت ایک ہی تھی اور وہ خود اللہ تعالیٰ نے متعین فرمائی تھی اور اللہ تعالیٰ ہی کی متعین شریعت آنحضرت پر وحی ہوئی اور ہم لوگوں تک پہنچی ہے۔ یہ متعین شریعت کہاں ملے گی؟ " قرآن" میں اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم دونوں کا قول موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

(۱) اتبع ما اوحی الیک من ربک (انعام ۱۳)

تو اس کی پیروی کر جو تجھ پر' تیرے پروردگار کی طرف سے وحی کیا گیا ہے"۔

(۲) اوحینا الیک ھذا القران (یوسف ۱)

"اور ہم نے جو کچھ تجھ پر وحی کیا ہے وہ یہی قرآن ہے"۔

(۳) ما فرطنا فی الکتب من شئی (انعام ۴)

"ہم نے اس کتاب میں کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے"۔

(۴) وکل شئی فصلنہ تفصیلا (بنی اسرائیل)

"اور ہم نے اس ہر چیز کو خوب تفصیل سے بیان کر دیا ہے"۔

خود جناب رسالتمآب صلعم نے بھی' بہ الفاظ وحی' اعلان کیا ہے کہ۔

(۱) ان اتبع الا ما یوحی الی (انعام ۵)

"میں اور کسی کی پیروی نہیں کرتا بجز اس کے جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے"۔

(۲) اللہ شھید بینی وبینکم واوحی الی ھذا القران (انعام ۲)

"میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے کہ مجھ پر تو یہی قرآن وحی کیا گیا ہے"۔

(۳) ولا رطب ولا یابس الا فی کتب مبین ○ (انعام ۷)

"اور کوئی رطب و یابس ایسا نہیں جس کا اس واضح کتاب میں ذکر نہ ہو"

(۴) ھو الذی انزل الیکم الکتب مفصلا (انعام ۱۴)

"وہ اللہ ایسا ہے جس نے تم لوگوں کے لئے ایسی کتاب نازل کی ہے جو مفصل ہے"۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ "شریعت" اللہ تعالیٰ متعین فرماتا ہے۔ اس لئے شریعت اسلامیہ بھی اللہ تعالیٰ ہی نے متعین فرما کر جناب رسالتمآب پر وحی کی جو آپ نے "قرآن" کی شکل میں مدون کرا کے بصورت کتاب خدا کے بندوں کے حوالے کی۔ خود "صحیح بخاری" کی ایک روایت سے بھی ظاہر ہے کہ حضورؐ کو صرف "قرآن" ملا تھا۔

"عبداللہ ابن عمر کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلعم کو فرماتے سنا کہ لوگو! گزشتہ قوموں کی نسبت تمہاری زندگی بالکل عصر و مغرب کے درمیانی وقت کی طرح ہے اہل تو رات کو "توراۃ" دی گئی۔ اور انہوں نے اس پر عمل کیا۔ جب دوپہر ہو گئی تو وہ لوگ عاجز آگئے۔ اس لئے انہیں ایک ایک قراط ثواب عطا کیا گیا۔ پھر اہل انجیل کو "انجیل دی گئی اور انہوں نے نماز عصر تک عمل کیا لیکن وہ عاجز آگئے اور انہیں ایک قیراط ثواب ملا۔ اس کے بعد

"قرآن مجید" دیا گیا اور ہم نے غروب آفتاب تک عمل کیا۔" (حدیث نمبر ۳۲۴۔ تجرید البخاری صفحہ ۹۱)

یہی قرآن رسولؐ اللہ نے مرتب و مدون صورت میں ہم مسلمانوں کو دیا ہے۔

(۱) انہ لقرآن کریم ○ فی کتب مکنون لا یمسہ الا المطہرون ○

"یقیناً" یہ قرآن کریم ہے جو ایک محفوظ کتاب میں درج ہے اور اس کو وہی لوگ چھوتے ہیں جو نہایت صاف ستھرے ہوں"

(۲) و کتب مسطور ○ فی رق منشور ○

"قسم ہے اس کتاب کی جو باریک جھلی کے کاغذ پر لکھی ہوئی ہے"۔

یہ لکھا ہوا کتابی شکل میں مرتب و مدون قرآن جناب رسالتمآب ہمیں دے گئے جو شریعت اسلامی کا مفصل و مکمل قانون ہے۔ نہ صرف اتنا بلکہ قرآن اس بات کا بھی دعویٰ دار ہے کہ اگر کوئی انسان "شریعت" بنا کے دے تو وہ مشرک ہے۔

ام لھم شرکواء اشرعوا لھم من الدین مالم یاذن بہ اللہ ط (شوریٰ۔ ۲۱)

کیا لوگوں نے ایسے شریک مقرر کر رکھے ہیں جو انہیں ایسے دین کی شریعت متعین کر کے دیتے ہیں جس کا اللہ نے حکم نہیں دیا؟"

اس سے ظاہر ہوا کہ "شریعت" متعین کرنے کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور اگر کوئی انسان کوئی "شریعت" متعین کرے یا کرائے تو وہ مشرک ہے۔ چنانچہ حضرت نوحؑ سے آنحضرتؐ تک جو پیغمبر بھی "شریعت" لایا وہ اللہ تعالیٰ کی متعین کی ہوئی تھی اور وہ ایک ہی تھی۔

(۱) ما یقال لک الا ما قد قیل للرسل من قبلک ط (حم سجدہ۔ ۴۳)

"اے رسول! تم سے بھی وہی کچھ کہا جا رہا ہے جو تم سے پہلے والے رسولوں سے کہا گیا تھا"۔

(۲) وانہ لتنزیل رب العلمین ○ ...... بلسان عربی مبین ○ وانہ لفی زبر الاوّلین ○ (شعراء۔ ۱۱)

"اور یہ قرآن رب العلمین کا نازل کیا ہوا ہے ...... صاف عربی میں اور یہی کچھ اگلی کتابوں میں بھی تھا"۔

اس لئے "شریعت اسلامیہ" قرآن کے اندر ہے۔ قرآن میں اصولی طور پر ہر چیز بیان کر دی گئی ہے۔ یعنی جن فروعات میں، زمانہ اور ماحول کی تبدیلی سے بھی کسی تغیرو تبدل کی ضرورت نہ تھی۔ انھیں تو خود "قرآن" میں منجانب اللہ مستقلاً" طے کر دیا گیا اور اب وہ تفصیلات، جزئیات، اور فروعات بھی ہمیشہ ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے، مگر جن فروعات اور جزئیات میں زمانہ اور ماحول کے تقاضے کے مطابق تغیرو تبدل ضروری متصور تھا۔ ان کے "قرآن" میں صرف اصول طے کر دیئے گئے ہیں اور ان کے جزئیات و تفصیلات چھوڑ دی گئی ہیں تاکہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشورے سے خود مرتب اور طے کریں۔

حلال و حرام اور جائز و ناجائز کا مسئلہ فروعی اور معمولی نہیں بلکہ اصولی ہے اور بہت اہم ہے اور جیسا کہ محترم علامہ سید سلیمان ندوی نے بھی تسلیم کیا ہے۔ اس کا حق رسول اللہؐ کو بھی نہیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور رسول اللہؐ کو شریعت اسلامی اور قانون خداوندی میں حک و اضافہ اور ترمیم و تنسیخ کا کوئی اختیار اور حق حاصل نہ تھا اور نہ اس کی کوئی ضرورت ہی تھی اور نہ پناہ بخدا انہوں نے کبھی ایسا کیا۔

(۱) وتمت کلمت ربک صدقا وعدلاً لا مبدل لکلمتہ (انعام۔ ۱۴)

"اور آپ کے رب کا کلام واقفیت اور اعتدال کے اعتبار سے کامل ہے۔ اس کے کلام کا کوئی بدلنے والا نہیں"۔

(۲) <u>ما فرطنا فی الکتب من شئی</u> (انعام ۴)

"ہم نے اس کتاب میں کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے"

(۳) انزل الیکم الکتب مفصلا ۔(انعام ۱۴)

"ہم نے تمہارے پاس ایک مفصل کتاب بھیج دی ہے"۔

(۴) الحمد للہ الذی انزل علی عبدہ الکتب ولم یجعل لہ عوجا ○ (کہف۔ ۱)

"تمام خوبیاں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے اپنے بندے پر یہ کتاب نازل کی اور اس میں ذرا بھی پیچیدگی نہیں رکھی"۔

(۵) قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقای نفسی۔ ان اتبع الا ما یوحی الی۔ (یونس۔ ۲)

"اے رسول! کہ دو کہ میں کون ہوتا ہوں کہ میں اپنی طرف سے اس کتاب میں کوئی ترمیم کر دوں؟ میرا کام تو صرف یہ ہے کہ میں اس کی پیروی کروں۔ میری طرف وحی ہوتی ہے"۔

یعنی قرآن شریعت اسلامیہ کا ایک مفصل اور ایسا صاف و صریح دستور العمل ہے جو بالکل مکمل ہے۔ اس میں نہ کوئی کمی ہے اور نہ کہیں کوئی پیچیدگی۔ اور رسول اللہؐ کو کوئی اختیار تھا اور نہ ضرورت کہ وہ اس میں کوئی ترمیم و تنسیخ یا حک و اضافہ کریں۔ چنانچہ قرآن آیا اور آتا رہا۔ رسول اللہؐ ان احکام الٰہی اور قوانین زندگی کو خدا کے بندوں اور قرآن کے اولین مخاطبین تک پہنچاتے اور نافذ کرتے رہے۔ اور لوگ انہیں بخوبی سمجھتے اور ان پر عمل کرتے رہے۔ اگر کبھی کسی مسئلے میں لوگوں نے کسی حکم کی تفصیل و وضاحت چاہی یا از خود کسی معاملے میں کبھی خدائی حکم معلوم کرنا چاہا اور رسول اللہ کی خدمت میں پیش کیا تو آنحضرت نے کبھی کوئی وضاحت اصولی طور پر اپنی جانب سے نہیں کی بلکہ خدا کے بندوں نے خدا کے جس حکم میں جب بھی' اصولی حیثیت سے کسی وضاحت کی خواہش ظاہر کی یا کسی بھی اصولی معاملے میں خدائی منشاء جاننا چاہا تو خود اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی تشفی کی کسی انسان کو ضرورت نہ پڑی کہ وہ اپنے جی سے کوئی اصول متعین کر دے یا کسی حکم کی اہم وضاحت خود کر لے۔ جناب

رسالت مآبؐ سے جب بھی کوئی اہم وضاحت چاہی گئی تو اس سچے پیغمبر نے کبھی اپنی مرضی کو دخیل نہ کیا۔ خدا کے بندوں نے، خدا کی مرضی، خدا کے رسول سے پوچھی تو خود خدا نے انہیں سنا اور اس نے قرآن ہی کے ذریعے سے اس کی وضاحت کر دی یا اپنی مرضی ظاہر کر دی۔ قرآن میں متعدد مسئلوں کا بیان یا وضاحت کی ابتدا اس لفظ سے ہے۔

"یسئلونک" "لوگ تم سے دریافت کرتے ہیں؟"۔

یہ لفظ ہی صاف بتا رہا ہے کہ لوگ جب کسی اصولی حکم کی تفسیر تفصیل اور تشریح یا کسی نئے معاملے میں مرضی الٰہی کی تحصیل کے لئے رسول اللہؐ سے رجوع کرتے تھے تو رسول اللہؐ اس بارے میں اپنی طرف سے کوئی جواب دیتے ہی نہ تھے بلکہ زیر دریافت وضاحت و حکم بھی قرآن ہی کے ذریعے سے آیا تھا۔ علامہ شبلی نعمانی، حضرت امام ابو حنیفہ کی سوانح عمری میں، حضرت شاہ ولی اللہ کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"ابن عباس کہتے ہیں کہ میں نے کسی قوم کو رسول اللہ کے اصحاب سے بہتر نہیں دیکھا۔ انہوں نے رسول اللہ کی تمام زندگی میں تیرہ مسئلوں سے زیادہ نہیں پوچھے۔ جو سب کے سب قرآن میں موجود ہیں"۔(سیرۃ النعمان ص ۱۴۴)

ظاہر ہے کہ جب قرآن کے کسی حکم کی وضاحت و تشریح بھی خود قرآن ہی کرتا تھا۔ یا نئے دریافت کردہ مسئلوں میں بھی آنحضرت اپنے دل سے کچھ نہ فرماتے تھے بلکہ قرآن ہی آتا تھا تو پھر "روایات" کو قرآن کی تشریح و تفسیر بھی کیونکر کہا اور مانا جا سکتا ہے؟ اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ "روایات" کی حیثیت قرآنی آیات کی تشریح کی ہے تو ظاہر ہے کہ اس "شرح کے لئے کوئی متن" بھی ہونا ضروری ہے۔ کوئی اصولی حکم قرآن میں موجود ہو اور اسکی فروعی تشریح میں کوئی روایت کی جائے تو ایک بات بھی ہے۔ مگر جب کسی اصولی مسئلے میں قرآن کا متن ہی موجود نہ ہو یا متن موجود ہو اور اس کے خلاف کوئی روایت ہو تو اسے قرآنی آیات کی شرح کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے اور اصولی معاملوں میں کوئی روایت تو دین کا ماخذ بن ہی نہیں سکتی کیونکہ شریعت کا

مدار "نص قطعی" پر ہوتا ہے اور روایتیں محض ظنی و قیاسی ہیں اور قرآن ظن و قیاس کی پیروی کرنے سے قطعی روکتا ہے۔ محض کسی روایت کی بنا پر تو حرام و حلال یا جائز و ناجائز کے اصولی مسئلے کا فیصلہ ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ بقول امام الہند حضرت ابوالکلام آزاد۔

اس تیرہ سو برس کے اندر کسی مسلمان نے بھی راویان حدیث کی عصمت کا دعوٰی نہیں کیا ہے اور نہ امام بخاری و مسلم تک کو معصوم تسلیم کیا ہے۔ کسی روایت کے لئے بڑی سے بڑی بات جو کہی گئی ہے۔ وہ اس کی صحت ہے عصمت نہیں اور صحت سے بھی مقصود صحت مصطلحِ فن ہے نہ کہ صحت قطعی و یقینی مثل صحت قرآن۔ پس ایک روایت پر صحت کی کتنی ہی مہریں لگ چکی ہوں لیکن بہرحال غیر معصوم انسانوں کی ایک شہادت اور غیر معصوم ناقدوں کا ایک فیصلہ ہے۔ ایسا فیصلہ ہر بات کے لئے مفید حجت تو ہو سکتا ہے۔ مگر یقینیات و قطعیات کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ جب کبھی ایسا ہو گا کہ کسی راوی کی شہادت، یقینیات قطعیہ سے معارض ہو جائے گی تو یقینیات اپنی جگہ سے نہیں ہلیں گے۔ غیر معصوم کو اپنی جگہ چھوڑنی پڑے گی...... جو کچھ ہے ان کی صحت کا اعتقاد ہے یعنی ایسی صحت کا جیسی اور جس درجے کی صحت ایک غیر معصوم انسان کے اختیارات کے ہو سکتی ہے"۔

حضرت علامہ ابوالکلام آزاد منکر حدیث نہیں مگر روایات کے بارے میں آپ نے ان کی رائے سن لی۔ اب "قرآن" کے بارے میں بھی ان کی رائے سن لیجئے۔ "تذکرہ" ان کی مشہور ترین کتاب ہے۔ اس میں انہوں نے بہت سی روایتیں بھی پیش کی ہیں، مگر صفحہ نمبر ۲۰۲ پر فرمایا ہے۔ "یہ کتنی عجیب بات ہے کہ قرآن پہنچانے والے کے ہر قرآنی لفظ کو تو حرف بہ حرف صحیح تسلیم کیا جاتا ہے لیکن خود اسی قرآن پہنچانے والے کے منصب رسالت و تعلیم کتاب و حکمت اور اس کی تشریح و توضیح کو تسلیم کرنے سے گریز کیا جاتا ہے"۔

"گریز و اجتناب کی بات ہرگز نہیں اور نہ ضرورت ہے اور نہ واقعی "قول رسول" سے کسی مسلمان کو پناہ بخدا کبھی انکار ہو سکتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ جسے " قول رسول" ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ ان سے کہا گیا کہ آپ قول رسول کا انکار کرتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ۔

"مقدس حدیث جس وقت ہمارے پاس پہنچے گی تو سر آنکھوں پر"۔

پھر دریافت کیا گیا کہ جب ایسا ہے تو آپ روایتوں کا انکار کیوں کرتے ہیں جو " قول رسول" ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ میں "قول رسول" کا نہیں۔ "قول راوی" کا انکار کرتا ہوں۔

امام ابو حنیفہ نے "روایات" کو "قول رسول" نہیں مانا اور "قول راوی" قرار دیا تھا تو اس کی بھی خاص وجہ تھی کہ ان کی قرآن پر بڑی گہری نظر تھی۔ اور وہ جانتے تھے کہ "قرآن ہی کا دوسرا نام "قول رسول" بھی ہے۔ "قول" ان بامعنی الفاظ کو کہتے ہیں جو دونوں لبوں کے درمیان سے نکلیں اور سنے جائیں۔ قرآن نہ تو اللہ تعالیٰ کے لبوں سے نکلا اور نہ سنا گیا۔ بلکہ آنحضرت صلعم کے مبارک لبوں کے درمیان سے نکل کر نشر ہوا۔ اس لئے قرآن کو "قول رسول" بھی کہا گیا۔ قرآن بے شک "کتاب اللہ" ہے۔ "منزل من اللہ" ہے اور "کلام اللہ" ہے۔ اس لئے کہ وہ الفاظ ہی وحی ہیں، مگر وہ "قول اللہ" نہیں ہے۔ اسی لئے قرآن کو گرچہ بہت سے ناموں اور صفتوں سے قرآن میں یاد کیا گیا ہے مگر اس کو ایک جگہ بھی قول اللہ نہیں کہا گیا ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے لبوں کے درمیان سے نہیں نکلا اور نہیں سنا گیا۔ ہاں مگر اس کو "قول رسول" ضرور کہا گیا ہے کیونکہ وہ آنحضرت صلعم کے لبہائے مبارک کے درمیان سے نکل کر نشر ہوا اور سنا گیا۔ بقول مولوی رومی۔

گفتہ او گفتہ اللہ بود   گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ کو اس امر پر حلفاً کس قدر اصرار ہے کہ قرآن "قول رسول" بھی ہے۔ سورۃالحاقہ (۴۳ ـ ۳۸) میں ہے۔

"سو میں قسم کھاتا ہوں ان تمام چیزوں کی جو تمہیں نظر آتی ہیں اور ان چیزوں کی بھی جو تمہیں نظر نہیں آتیں' کہ یہ رسول کریمؐ کا قول ہے اور کسی شاعر کا قول نہیں ہے۔ کیا ہی کم تم ایمان لاتے ہو اور یہ کسی کاہن کا بھی قول نہیں ہے' کیا ہی کم تم نصیحت حاصل کرتے ہو' یہ تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا ہوا ہے"۔

غور فرمایئے! فرمایا گیا ہے کہ یہ قرآن نہ تو کسی شاعر کا قول ہے اور نہ کاہن کا' بلکہ یہ رسول کریمؐ کا قول ہے اور ایسا "قول رسول" ہے جو اپنے جی کا بنایا ہوا نہیں بلکہ رب العلمین کا نازل کیا ہوا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔

"سو میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹنے والے' چلنے والے اور چھپنے والے ستاروں کی۔ اور قسم ہے رات کی جب وہ جانے لگے' اور قسم ہے صبح کی جب وہ آنے لگے' کہ یہ رسول کریم کا قول ہے (اس رسول کریم کا) جو طاقت والے صاحب عرش کے نزدیک بڑے رتبے والا ہے۔ اس کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور اس کا لقب امین ہے اور دیکھو تمہارا یہ ساتھی ہرگز دیوانہ نہیں ہوا ہے' (سورۃ التکویر)

آنحضرتؐ نے بعثت کے بعد جب قرآن نشر فرمانا شروع کیا تو لوگ آپ کو شاعر' کاہن مجنوں وغیرہ لقب دینے لگے۔ لہٰذا ان کی تردید کی گئی' کہ یہ قرآن نہ تو کسی شاعر کا قول ہے اور نہ کسی کاہن کا اور نہ وہ دیوانہ ہو گیا ہے' بلکہ یہ اس رسول کا قول ہے جو کریم ہے' جو عرش والے' خدا کے نزدیک بڑے مرتبوں والا ہے۔ جس کی اطاعت کو فرض کیا گیا ہے اور جس کو امین کہا جاتا ہے۔ اور وہ جو "قول" پیش کرتا ہے وہ اپنے جی کا گھڑا نہیں' بلکہ رب العلمین کا نازل کیا ہوا ہے۔ اس حقیقت کو دوسری جگہ یوں کہا گیا۔ سورہ نجم میں کہا ہے کہ

"قسم ہے ستارہ کی جب وہ غروب ہونے لگے کہ تمہارا یہ ساتھی ہرگز گمراہ نہیں ہوا اور نہ ہے اور نہ وہ اپنی خواہش نفس سے بولتا ہے بلکہ جو کچھ پیش کرتا ہے وہ صرف وحی ہے جو اس کی طرف کی جاتی ہے اور اس کو مضبوط قوتوں والے نے تعلیم دی ہے"۔

پھر جب امام ابو حنیفہ اس حقیقت سے باخبر تھے کہ قرآن ہی کا دوسرا نام "قول رسول" بھی ہے تو وہ روایات کو کس طرح "قول رسول" مان لیتے جبکہ وہ "قول راویان در راویان ہے"؟۔

بالکل اسی طرح امام ابو حنیفہ نے روایت کے "حدیث" ہونے سے بھی اس لئے انکار کیا ہو گا کہ وہ قرآن کے عالم تھے اور جانتے تھے کہ قرآن ہی "حدیث" بھی ہے۔ اس کے سوا دوسری کوئی "حدیث" نہیں۔ آپ خود ملاحظہ فرمایئے کہ قرآن اپنے حدیث ہونے پر کس قدر شدت سے اصرار ہے۔

انہ لقران کریم ○ فی کتب مکنون ○ لا یمسہ الا المطھرون ○ تنزیل من رب العلمین ○ افبھذا الحدیث انتم مدھنون ○ وتجعلون رزقکم انکم تکذبون (الواقعہ ۷۷)

بے شک یہ قرآن کریم ہے جو ایک محفوظ کتاب میں درج ہے۔ سوائے پاک لوگوں کے کوئی اس کو نہیں چھوتا۔ یہ رب العلمین کی طرف سے نازل کیا ہوا ہے۔ تو کیا تم لوگ اس حدیث کی مداہنت کرتے ہو؟ اور تکذیب کو اپنی غذا بناتے ہو؟ [۱]

ملاحظہ فرمایئے! جس کو اوپر "قرآن کریم" کہا گیا ہے' اسی کو نیچے حدیث کہا گیا ہے اور اس حقیقت کی تکذیب کو' باعث تباہی بتایا گیا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔

اللہ نزل احسن الحدیث کتبا متشابھا مثانی ○ (الزمر) "اللہ تعالیٰ نے کیا

---

[۱] (اس کے بعد بھی لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کو آنحضرت صلعم (پناہ بخدا) یوں ہی لکڑی' چمڑہ' پتہ وغیرہ پر ادھر ادھر لکھا' غیر مرتب اور منتشر حالت میں چھوڑ گئے تھے اور حضرت عمر کے مشورہ سے حضرت ابوبکر نے کتابی شکل میں جمع کرایا تھا۔ حالانکہ جو مرتب شدہ نہ ہو اس کو کتاب کہا ہی نہیں جاتا۔ دوسری جگہ ہے۔

وکتب مسطور فی رق منشور (طور۔ ۱)

"قسم ہے اس کتاب کی جو باریک جھلی کے کاغذ پر لکھی ہوئی ہے"۔

میں درج ہے۔ سوائے پاک لوگوں کے کوئی اس کو نہیں چھوتا۔ یہ رب العلمین کی طرف سے نازل کیا ہوا ہے۔ تو کیا تم لوگ اس حدیث کی مداہنت کرتے ہو؟ اور تکذیب کو اپنی غذا بناتے ہو؟

عمدہ حدیث نازل کی ہے جو ایسی کتاب ہے کہ اگلی کتابوں سے ملتی جلتی ہے۔ بار بار دہرائی گئی ہے"۔

جس کتاب کو "متشابہ" اور "مثانی" کہا گیا ہے۔ وہ قرآن ہے جس میں بار بار کہا گیا ہے کہ "یہی کچھ پہلی کتابوں میں بھی تھا"۔ مثلاً"۔

ان ھذا لفی الصحف الا ولیٰ ○(الاعلیٰ) "بے شک یہی سب کچھ اگلے صحائف میں بھی تھا"۔

اسی قرآن کو "مندرجہ بالا آیت میں "حدیث" کہا گیا ہے۔ ذرا اس چیلنج کو ملاحظہ فرمایئے۔

(ا) **ام یقولون تقولہ...... فلیا توا بحدیث مثلہ ان کا نوا صدقین** (سورہ الطور)

"کیا وہ کہتے ہیں کہ یہ خود گھڑ لیا گیا ہے؟...... تو یہ لوگ اس جیسی حدیث لے آویں اگر سچے ہیں"۔

(۲) **ام یقولون افترہ ○ قل فا توا بسورۃ مثلہ...... ان کنتم صدقین○** (سورہ یونس)

"کیا یہ کہتے ہیں کہ اسے افترا کہا گیا ہے؟ ان سے کہو کہ اس جیسی ایک سورۃ ہی لے آؤ اگر تم لوگ سچے ہو"۔

ملاحظہ فرمایئے۔ کہ قرآن اور حدیث ایک ہی چیز کے دو نام ہیں یا دونوں دو چیزیں ہیں؟ اور سنئے۔

(ا) **ما کان ھذا القران ان یفتری** (سورہ یونس) "یہ قرآن کوئی افترا کیا ہوا نہیں ہے"۔

(۲) **ما کان حدیثا یفتری** (سورہ یوسف) "یہ حدیث کوئی افترا کی ہوئی نہیں ہے"۔

(۳) **فبای حدیث بعد اللہ وا یتہ یومنون○** (سورہ جاثیہ) "بھلا اللہ اور اس کی

آیات کے بعد کون حدیث ہے جس پر لوگ ایمان لائیں گے؟"

تینوں آیتوں پر غور فرمائیے۔ خاص طور پر پہلی اور دوسری آیتوں پر۔ کیا اب بھی اس میں شک ہے کہ قرآن و حدیث ایک ہی چیز کے دو نام ہیں؟ اور تیسری آیت تو سارا جھگڑا ہی چکا دیتی ہے۔ آنحضرت صلعم سے خطاب ہوتا ہے کہ۔

(۱) فلعلک باخع نفسک علی اثارھم ان لم یومنوابھذا الحدیث اسفا (کہف ۱)

"تو کیا تم ان کے پیچھے، غم میں اپنی جان دے ڈالو گے۔ اگر وہ اس حدیث پر ایمان نہ لاویں گے؟

(۲) فبای حدیث بعدہ یومنون ○(الاعراف ۲۳)

تو پھر اس کے بعد کون حدیث ہے جس پر یہ ایمان لاویں گے؟

(۳) فذرنی ومن یکذب بھذا الحدیث سنستدرجھم من حیث لا یعلمون (القلم ۲)

"تو تم مجھ کو، اور جو اس حدیث کو جھٹلاتے ہیں، ان کو رہنے دو۔ ہم انھیں تدریجا اس طرح پکڑیں گے جس کی ان کو خبر نہیں"۔

ان آیات پر سنجیدگی سے غور فرمائیے تاکہ آپ فیصلہ کر سکیں کہ "حدیث" کس کو کہتے ہیں اور سنئے۔

ومن الناس من یشتری لھو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم (لقمٰن ۱)

"اور بہت سے ایسے لوگ ہیں جو بغیر علم کے اس حدیث کے خریدار بنتے ہیں جو اللہ کی راہ سے غافل کرنے والی ہے"۔

فبای حدیث بعدہ یومنون ○(المرسلت ۲)

بھلا اس کے بعد اور کون حدیث ہے جس پر یہ ایمان لائیں گے۔؟"

غالبا" اس قدر آیتیں کافی ہیں۔ یہ جاننے اور سمجھ لینے کے لئے کہ قرآن ہی کا

دوسرا نام "حدیث" بھی ہے۔ اور بقول خود قرآن' اس کے سوا دوسری کون حدیث ہے جس پر ایمان لایا جائے گا؟"

روایتوں کو دینی حجت ماننے سے امام ابو حنیفہ کے انکار کی اور بھی بہت سی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً" کہا جاتا ہے کہ قرآن میں "اطیعو اللہ واطیعو الرسول" آیا ہے۔ اس کے "اطاعت" دوہوئی۔ ایک اللہ کی اور دوسری رسول کی۔ اللہ کی اطاعت قرآن کا اتباع ہے اور رسول کی اطاعت' روایات کی پیروی ہے۔ اگر کوئی روایت کی پیروی کو ضروری نہیں سمجھتا تو وہ اطیعو الرسول کے حکم کی تعمیل سے انکار کرتا ہے اور مومن نہیں رہتا۔ مگر امام ابو حنیفہ جانتے تھے کہ ایسا قطعی گمراہی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اللہ اور رسولؐ میں کسی قسم کی تفریق کو "کفر" قرار دیا ہے۔ یہ صریح نص ہے کہ۔

ان الذین یکفرون باللہ ورسلہ ویریدون ان یفرقو بین اللہ ورسلہ(النساء ۲۱)

"وہ لوگ بلا شبہ کفر کرتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسولوں کے ساتھ اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان' تفریق کریں"۔

جب اللہ تعالیٰ خود بہ نص قطعی اللہ اور رسول کو الگ الگ کرنے کو کفر قرار دیتا ہے تو اطاعت کو دو جگہ تقسیم کر کے اللہ کی اطاعت اور روایات کی پیروی کو رسول کی اطاعت قرار دینا' صریحا کفر اور گمراہی ہے۔ اللہ اور رسول کی اطاعت دو نہیں بلکہ ایک ہی ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ۔

من یطع الرسول فقد اطاع اللہ(النساء ۸)

جس نے رسول کی اطاعت کی تو اس نے درحقیقت اللہ کی اطاعت کی۔

چونکہ خود رسول اللہ صلعم قرآن کی پیروی کرتے تھے۔ اس لئے قرآن کی پیروی ہی اطاعت اللہ و رسول ہے اور پیروی سنت رسول اللہ بھی بھلا امام ابو حنیفہ اطاعت کی تقسیم اور روایت کو تسلیم کس طرح کر سکتے تھے؟

امام ابو حنیفہ اس سے بھی باخبر تھے کہ لوگ "روایات" کو "وحی" قرار دیتے ہیں۔

یعنی لوگ قرآن کو "وحی جلی" یا وحی متلو اور روایات کو "وحی خفی" یا وحی غیر متلو" بتاتے ہیں۔ بھلا امام اعظم سے زیادہ کون جان سکتا تھا کہ "وحی" کی یہ تقسیم بھی۔ "اطاعت رسول" کے لئے روایات کو حجت نہیں منوا سکتی۔ کیونکہ اگر "روایات" بھی "وحی" ہیں۔ اور منزل من اللہ جیسا کہ کہا گیا ہے تو اس کی پیروی بھی "اللہ کی اطاعت" کہلائے گی نہ کہ رسول کی۔ اور اگر س دوسری وحی کی پیروی اطاعت رسول ہو جاتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ پہلی وحی قرآن کی پیروی' اطاعت رسول نہ کہلائے۔ پھر امام ابو حنیفہ یہ سمجھنے سے بھی قاصر تھے کہ وحی "جلی" کیسی ہوتی ہے؟ "جلی" کے معنی تو ظاہر کے ہیں۔ اور قرآن "وحی جلی نہیں بلکہ "وحی خفی" ہے وہ رسول اللہ صلعم کے قلب پر نازل ہوتی تھی۔ جو ظاہر چیز نہیں۔ وحی تو ہمیشہ "خفی" ہوتی ہی ہے۔ کیا قرآن کو جبرائیلؑ چیخ چیخ کر آسمان سے سناتے تھے کہ وہ "وحی جلی" ہوئی اور روایت کو چپکے سے کان میں کہہ جاتے تھے کہ وہ "وحی خفی" ہوئی؟۔

بہر کیف! امام ابو حنیفہ کے نزدیک "قرآن" ہی حدیث' قول رسول' وحی خفی' وحی جلی غرض سب کچھ تھا۔ کیونکہ وہ منزل من اللہ ہے اور اسی کی اطاعت خود آنحضرت صلعم پر' صحابہ کرام اور ہم آپ سب پر فرض ہے۔ بفرض محال اگر یہ نہ بھی ہو کہ قرآن ہی کو "قول رسول" اور "حدیث" یا "سنت" سمجھا جائے۔ تو امام ابو حنیفہ کی نگاہ سے یہ حقیقت تو مخفی نہ تھی کہ قیامت کے دن رسول اللہ صلعم بارگاہ الٰہی میں یہ شکایت کبھی نہ کرینگے کہ میری امت نے "قول رسولؐ" یا "حدیث" یا "سنت" یا "روایات" کو چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ آپ ہی بات کہیں گے کہ۔

یرب ان قومی اتخذو ا ھذا القران مھجورا(الفرقان ۳)

اے میرے پروردگار میری قوم نے اس قرآن کو بالکل ہی چھوڑ دیا تھا"۔

لہٰذا امام ابو حنیفہ کبھی بھی قرآن کے سوا کسی اور لٹریچر کو "دینی حجت" نہیں مان سکتے تھے اور جو لوگ اپنے کو تقلیداً "حنفی" کہتے ہوں' ان کا بھی یہی مسلک ہونا چاہیئے بلکہ سارے مومنوں کا۔

مصیبت یہ ہے کہ دو اڑھائی سو برس تک عوام کے منہ در منہ اور راوی در راوی

بیان ہونے والے الفاظ و اقوال کو "قول رسول" ماننے اور "حدیث" جاننے کو کہا جاتا ہے۔ نہ صرف اتنا ہی بلکہ "روایات" کے "منزل من اللہ" اور قرآن کی طرح "وحی" ہونے پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ رسالہ "اہلحدیث (کراچی) اپنے حدیث نمبر" میں یہ اصرار وعویدار ہے کہ۔

(۱) "اللہ تعالٰی نے اپنے نبی (صلعم) پر دو وحی اتاری ہیں۔ اور ان دونوں پر ایمان لانا اور عمل کرنا اپنے بندوں پر واجب کر دیا ہے۔ وہ دو وحی کیا ہیں؟ ایک قرآن ہے دوسری حدیث ہے"۔ (صفحہ نمبر۴۹)

(۲) "حدیث کا نزول' جبرائیل علیہ السلام کی معرفت اسی طرح ہوا تھا جس طرح کہ قرآن مجید کا۔ امام حازمی اپنی کتاب "ناسخ و منسوخ میں لکھتے ہیں کہ .... جبرائیل علیہ السلام حدیث کو لے کر آسمان سے اترتے تھے اور آنحضرت صلعم کو سکھاتے تھے......" (صفحہ نمبر۷۸)

(۳) "حدیث کا نزول اگرچہ اعلانیہ نہیں ہوا ہے اور نہ اس کی تلاوت نماز میں کی جاتی ہے۔ لیکن وہ ہے بالکل اسی قسم کی "وحی" جیسے کہ قرآن وحی ہے"۔ (صفحہ نمبر ۱۸۴)

(۴) "اہل اسلام کے اتفاقی اصول دو ہیں۔ قرآن اور حدیث .... وہ جیسے قرآن کو وحی و الہام جانتے ہیں ویسے ہی حدیث کو وحی و الہام مانتے ہیں......" (صفحہ نمبر۸۴)

اب ہمارے لئے مشکل یہ ہے کہ اس سلسلے میں متقدین' محدثین' محققین اور مورخین ہمارے سامنے جو کچھ سرمایہ تاریخ پیش کرتے ہیں وہ اس قدر متضاد اور عجیب ہے کہ روایت کو "قول رسول" اور "حدیث" قرار دینے کے لئے بقول مصری فاضل ڈاکٹر طہٰ حسین۔

> "ہمارے حصے میں معصومیت اور بھولا پن کافی مقدار میں آنا ضروری ہے تب جا کر ہم روایت کی تصدیق کر سکتے ہیں"۔ (ادب الجاہلی ص ۸۴ ترجمہ محمد رضا انصاری)

میں اس سلسلے میں چند اہم حقائق اور ضروری باتیں بڑے بڑے معتقدین حدیث اور اکابر و مسلم علماء کی زبان عرض کئے دیتا ہوں۔ اس کے بعد آپ خود فیصلہ کیجئے کہ کیا کرنا چاہئے؟ روایات کو "قول رسول" اور اسے قرآن کی طرح "دینی حجت" ماننے کو کہا جاتا ہے۔ مگر یہ "قول رسول" خود رسولؐ اللہ کے عہد میں قرآن کی طرح لکھا نہیں گیا تھا۔ مدرسہ اہلحدیث (دربھنگہ) احمدیہ سلفیہ" کے پرنسپل محترم علامہ عبید الرحمٰن صاحب عاقل "رحمانی" اسدی (دربھنگہ) کے "بخاری نمبر" میں ص ۲۲ پر فرماتے ہیں۔

"یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلعم کے عہد بابرکت میں مسائل شریعت' احادیث' رسولؐ اور احکام اسلامی کو کسی کتاب یا نسخے میں باضابطہ قلمبند کرنے کا رواج نہ تھا۔ اس وقت نہ تو کسی نے حدیث کی کوئی کتاب لکھی' نہ کسی صحابی نے شرعی احکام جمع کئے اور نہ کسی دوسرے علوم و فنون کے اصول و قواعد مدون و مرتب ہوئے"۔

یہ تو عہد نبوی کی بات ہوئی کہ کسی نے اقوال رسولؐ کو نہیں لکھا۔ اب آگے کی بات سنئے۔ رسالہ "اہلحدیث" کراچی کے "حدیث نمبر" ص ۳۹۵ پر محترم علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں۔

"ہجرت کی پہلی صدی تک احادیث نبوی کے گنجینے' مقدس سینوں میں مدفون رہے۔ احادیث کی تدوین بصورت کتاب مخصوص کی ابتدا' اموی خلیفہ اعظم کے اشارے سے ہوئی اور سب سے پہلے مدون حدیث ابوبکر بن خرم متوفی ۱۲۰ھ ہیں"۔

یعنی رسول اللہ کے عہد ہی میں نہیں' سو برس بعد تک یہ روایات لکھی نہیں گئیں بلکہ صرف زبانی رہیں۔ امام ابو حنیفہ کا یہی دور ہے اور انہیں صحیح روایت نہ ملیں اور انہوں نے روایتوں کو "قول راوی" قرار دیا۔ علامہ ندوی موصوف نے فرمایا ہے کہ احادیث کے سب سے پہلے مدون ابوبکر بن خرم ہیں مگر علامہ سید احمد رکن "ندوۃ المصنفین" نے روایتوں کی صحت و حجت منوانے کے لئے جو کتاب "فہم قرآن"

کے نام سے لکھی ہے' اس کے ص ۲۹ پر لکھتے ہیں کہ۔

افسوس ہے کہ ـــــ اس وقت بھی تدوین کا کام انجام نہیں پا سکا یہی وجہ ہے کہ ابوبکر کے مجموعہ احادیث کے وجود کا پتا اب تک کہیں نہیں مل سکا ہے اور نہ جامعین حدیث میں سے کسی نے اس کا ذکر کیا ہے"۔

غور فرمایئے' یہ حضرات خود فرماتے ہیں کہ موجودہ اقوالِ رسولؐ کو نہ تو رسول اللہ نے لکھوایا تھا نہ ان کے عہد میں لکھا گیا تھا۔ سو برس کے بعد جس مجموعہ کا مرتب ہونا بیان کیا جاتا ہے وہ لاوجود ہے۔ نہ تو وہ مجموعہ تیسری صدی ہجری کے "صحاح ستہ" لکھنے والوں کو ملا نہ اس کے بعد کبھی کسی نے اس کو دیکھا۔ اگر واقعی روایات قولِ رسول" ہیں' قرآن کی تشریح ہیں' دینی ماخذ ہیں' حجت ہیں تو خود رسول اللہ یا صحابہ کرام یا تابعین عظام نے انہیں لکھ اور لکھوا کیوں نہیں لیا تھا؟ اس کا جواب دیو بند کے شیخ الحدیث حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ سے سنئے۔ وہ "فیض الباری" مطبوعہ مصر جلد نمبر ا ص ۲۰۸ پر لکھتے ہیں۔

"اگرچہ سر سری نظر سے عہد زمانہ پیغمبر میں احادیث کا جمع ہو جانا زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن پیغمبر اسلام کی یہ منشا ہی نہ تھی کہ قرآن کی طرح حدیث کو جمع اور حفظ کیا جائے۔ پیغمبر اسلام نہ یہ چاہتے تھے کہ حتمی اور یقینی ہونے میں حدیث قرآن کے برابر ہو جائے۔ نہ قرآن کی طرح پیغمبرانہ الفاظ کے ساتھ اہتمام کرنا پسند تھا بلکہ مقصد ہی یہ تھا کہ قرآن کی طرح نہ حدیث کو مرتب کیا جائے نہ حفظ کیا جائے"۔ (بحوالہ طلوع اسلام جون ۵۰ء)

یہ وجہ تھی کہ روایات کو نہ تو خود رسول اللہ نے لکھوایا اور نہ ان کی حیات مبارک میں یا ان کی رحلت کے بعد کسی صحابی یا اس کی اولاد نے لکھا۔ صرف زبانی روایتیں چلتی رہیں۔ حافظہ کتنا ہی قوی ہو مگر کوئی بات ہمیشہ کسی کو لفظ بہ لفظ صحیح طور سے یاد رہ ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ "صحیح بخاری" ہی میں ہے کہ۔

"سفیان' جو اس حدیث کے راویوں میں سے ایک راوی ہیں' کہتے ہیں کہ

حدیث میں تین باتیں تھیں۔ ایک میں نے خود بڑھا دی ہے اور مجھے یہ یاد نہیں کہ وہ کون سی بات تھی"۔ (روایت نمبر ۲۰۴۶ تجرید البخاری ص ۴۴۰)

غور فرمایئے یہ خود صحابی کی روایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک تو میں بھول گیا اور دوسرے روایت میں ایک بات میں نے خود بڑھا دی ہے۔ اب سوچئے کہ جب روایات دو اڑھائی سو برس تک لکھی نہ گئیں تو لوگ کیا کیا کچھ نہ بھول گئے ہوں گے؟ یا کیا کیا کچھ نہ اپنی طرف سے لوگوں نے بڑھایا ہو گا؟ علامہ شبلی نعمانی "سیرۃ النعمان" میں لکھتے ہیں۔

"سینکڑوں، ہزاروں بلکہ لاکھوں حدیثیں دانستہ لوگوں نے وضع کر لیں۔ حماد بن زید کا بیان ہے کہ چودہ ہزار حدیثیں صرف ایک زندیق نے وضع کر لیں۔ عبدالکریم وضاع نے خود تسلیم کیا تھا کہ چار ہزار حدیثیں اس کی موضوعات سے ہیں۔ بہت سے ثقات اور پارسا تھے جو نیک نیتی سے فضائل اور ترغیب میں حدیثیں وضع کرتے تھے۔ حافظ زین الدین عراقی لکھتے ہیں کہ ان حدیثوں نے بہت ضرر پہنچایا کیونکہ ان واضعین کی ثقاہت اور تورع و زہد کی وجہ سے یہ حدیثیں مقبول ہو گئیں اور رواج پا گئیں"۔

حضرت علامہ ابوالکلام آزاد اپنی مشہور کتاب "غبار خاطر" میں ص ۱۷۳ پر کہتے ہیں۔

تاریخ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جن لوگوں نے بے شمار جھوٹی حدیثیں بنائیں۔ ان میں ایک گروہ دیندار واعظوں اور مقدس زاہدوں کا بھی تھا۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل کو کہنا پڑا کہ حدیث کے واضعوں میں سب سے زیادہ خطرناک گروہ ایسے ہی لوگوں کا ہے...... مسلمانوں میں وعاظ و قصاص کا...... گروہ بھی...... سینکڑوں روایتیں برجستہ گھڑ لیا کرتا تھا اور پھر وہی قید کتابت میں آکر ایک طرح کے نیم تاریخی مواد کی نوعیت پیدا کر لیتی تھیں......"

سینوں کی روایتیں تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں اور شیعوں کی روایتیں چوتھی

اور پانچویں صدی ہجری میں مرتب و مدون ہوئی ہیں۔ محدثین کے سامنے کوئی تحریری مواد نہ تھا بلکہ انھوں نے لوگوں سے پوچھ پوچھ کر روایتیں جمع کی تھیں۔ چنانچہ صرف امام بخاری کو چھ لاکھ روایتیں ملی تھیں۔ جس وجہ سے سوال یہ پیدا ہوا کہ ان میں سے کون صحیح ہیں اور کون غلط؟ کون اصلی قول رسول ہے اور کون جعلی اور بناوٹی روایت؟ چنانچہ معیار صحت خود روایت نہیں بلکہ راوی قرار پائے اور اس اعتبار سے جس روایت کے تمام راوی سچے معلوم ہوئے وہ روایت صحیح قرار پائی۔

ذرا سوچئے اور بتایئے کہ مدونین روایت نے خود جس شخص سے روایت سنی۔ اس کے کردار تو وہ جانچ اور پرکھ سکتے تھے مگر اس سے اوپر والے سلسلے کے مردہ راویوں کی صداقت اور ان کے کردار کو جانچنے کا انکے پاس کون سا آلہ تھا جب کہ ان راویوں کو دیکھنے والا کوئی فرد بشر موجود نہ تھا؟ آپ جانتے ہوں گے کہ قانون شہادت کی رو سے' چاہے وہ قرآنی ہو یا آج کل کی عدالتی یا مروجہ گواہی "ہم نے فلاں سے سنا" قطعاً" ناقابل اعتبار ہے۔ ہر جگہ چشم دید گواہ طلب کیا جاتا ہے اور ذاتی طور پر اہل آدمی سے سنی ہوئی گواہی مانی جاتی ہے۔ اللہ میاں تک ہمارے کو لکھوا رہے ہیں تاکہ قیامت کے دن تحریری شہادت ہر شخص کے سامنے پیش کی جائے۔ پھر محض زبانی شہادت کو امام بخاری وغیرہ نے حتمی اور یقینی کس طرح سمجھ لیا؟ آج بھی محض زبانی دعویٰ کہیں کسی جگہ عدالت میں یا عدالت سے باہر تسلیم نہیں کیا جاتا بلکہ ہر جگہ تحریری شہادت طلب کی جاتی ہے۔ پھر ان زبانی سنی سنائی روایتوں کا جو ذخیرہ ملا بھی تھا وہ بقول خود امام بخاری' چھ لاکھ تھا جس میں سے بقول ان کے صرف وہ چھ ہزار روایتیں انہیں صحیح معلوم ہوئیں جو انھوں نے "صحیح بخاری" میں درج کیں۔

اب غور فرمایئے کہ چھ لاکھ روایتوں میں صرف چھ ہزار صحیح روایتیں ملیں یعنی ننانوے فی صد روایتیں غلط تھیں۔[1] بھلا جس بچ میں ننانوے

---

[1] (تقریباً" یہی حال سارے مجموعہ روایات کا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے "سیرۃ النعمان" صفحہ نمبر ۸۵ میں کہا ہے۔ "امام مالک نے اول جب موطا لکھی تو اس میں دس ہزار حدیثیں تھیں۔ پھر امام مالک زیادہ تحقیق کرتے گئے تو یہ تعداد کم ہوتی گئی۔ یہاں تک چھ سات سورہ گئیں"۔ شاید
باقی صفحہ 34

فی صد جھوٹ مل گیا ہو وہ کہاں تک لائق اعتماد ہے۔ نہ صرف اتنا بلکہ خود یہ معیار کہاں قابل اعتبار ہے۔ اس کا ذکر بھی علامہ شبلی نعمانی سے سنئے۔ وہ "سیرۃ النعمان" میں لکھتے ہیں۔

(۱) جس طرح ایک فقیہ کسی مسئلے کو قرآن یا حدیث سے استنباط کر کے اپنی دانست میں صحیح سمجھتا ہے اور اس کی صحت یقینی نہیں ہوتی۔ کیونکہ استنباط میں جن مقدمات سے کام لیا ہے اکثر اس کے ظنیات ہیں۔ اسی طرح حدیث کا حال ہے کسی حدیث کو صحیح سمجھنا محدث کے ظنیات و اجتہادات پر مبنی ہے"۔ (ص ۹۹)

(۲) اصول حدیث کے ظنی اور اجتہادی ہونے ہی کا اثر ہے کہ محدثین کو احادیث کی صحت و عدم صحت میں اختلاف ہوتا ہے۔ ایک محدث ایک حدیث کو نہایت صحیح' مستند اور واجب العمل قرار دیتا ہے۔ دوسرا اسی کو ضعیف بلکہ موضوع کہتا ہے"۔ (ص ۹۹)

(۳) سب سے بڑا ضروری اور اہم مسئلہ رجال کی تنقید ہے۔ اخبار احاد کا تمام تر مدار رجال پر ہے۔ لیکن خود رجال کی تنقید و توثیق ایسا ظنی مسئلہ ہے، جس کا قطعی فیصلہ نہایت مشکل اور قلیل الوجود ہے۔ ایک شخص کو بہت سے لوگ نہایت ثقہ نہایت متدین' نہایت راستباز کہتے ہیں۔ اسی شخص کو دوسرے اشخاص ضعیف الروایت' غیر ثقہ ناقابل اعتبار خیال کرتے ہیں...... بخاری و مسلم میں گو ایسا سخت اختلاف نہیں۔ تاہم بہت سے رواۃ ہیں جن کو ان دونوں اماموں سے ایک قابل حجت سمجھتا ہے اور دوسرا نہیں سمجھتا"۔ (ص ۱۰۱)

(۴) "جن وسائل اور طریق سے رجال کے حالات قلمبند کئے گئے اور کئے جا سکتے تھے۔ ان کا مرتبہ ظن غالب یا محض ظن سے فائق نہیں ہو سکتا۔

بقیہ نوٹ:- وہ چند سال اور زندہ رہ جاتے تو یہ بھی غلط قرار پا کر کاٹ دی گئی ہوتیں۔ واقعی اکبر الہ آبادی کا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ۔

قرآن کے اثر کو روک دینے کے لئے
ہم لوگوں پر راویوں کا لشکر ٹوٹا)

اس لئے اس پر یقینیات اور قطعیات کی بنیاد قائم نہیں ہو سکتی"۔ (ص ۱۴۱)

(۵) روایت کی صحت و عدم صحت کا مدار بھی ہمیشہ راویوں کے اعتبار پر نہیں ہوتا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک واقعے کی روایت جس سند سے بیان کی جاتی ہے اس کے تمام راوی ثقہ اور قابل اعتبار ہوتے ہیں لیکن واقعہ صحیح نہیں ہوتا حدیث میں اس کی سینکڑوں مثالیں ملتی ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ صرف رواۃ کی بنا پر احادیث کا فیصلہ نہ کیا جائے بلکہ یہ بھی دیکھا جائے کہ وہ اصول درایت کے مطابق ہیں یا نہیں"۔ (ص ۹۰)

غور فرمایئے' یہ سارا بیان اور یہ کل تحقیق ان لوگوں کی ہے جو مستند اکابر اور معتقد حدیث علماء ہیں۔ ان میں سے کوئی بیان کسی منکر حدیث کا نہیں جس پر شک کیا جائے تحقیق بھی ان بیانات کی صداقت تسلیم کرتی ہے۔ اب سوچئے کہ ایسی غیر یقینی صورت میں کسی روایت کو "قول رسول" سمجھ کر اس پر کسی دینی اہم مسئلے کا مستقلاً فیصلہ کیونکر درست ہو سکتا ہے۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ "صحیح مسلم" میں روایت ہے۔ اور جب "صحیح" میں ہے تو شاید غلط ہو نہیں سکتی کہ ایک دن حضور نے حکم دیا کہ قرآن کے سوا جس شخص نے جو کچھ بھی مجھ سے لکھا ہو' اس کو ضائع کر دے۔ چنانچہ صحابہ نے غیر از قرآن' جو کچھ لکھا تھا وہ جلا دیا۔

"ابی سعید خدری سے روایت ہے کہ (ایک روز) رسول اللہ صلعم نے فرمایا "قرآن کے سوا مجھ سے کچھ اور نہ لکھو اور اگر کسی نے مجھ سے قرآن کے سوا کچھ اور لکھا ہے تو وہ اس کو مٹا دے۔" (صحیح مسلم)

اس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ جو کچھ روایتیں آنحضرت کے عہد مبارک میں لکھی بھی گئی تھیں۔ وہ خود رسول اللہ کے حکم سے ضائع کر دی گئی تھیں۔ آنحضرت صلعم کوئی حکم اپنے دل سے نہیں دیتے اور دے سکتے تھے۔ اس لئے یقیناً آپ نے یہ حکم قرآن کی اس آیت کے نزول کے بعد دیا گیا ہو گا۔

یا ایھا الناس قد جاء تکم موعظتہ من ربکم و شفاء لما فی صدور ○ وھدی و رحمتہ للمومنین ○ قل بفضل اللہ و برحمتہ فبذلک فلیفرحوا ○ ھو

خیر مما یجمعون ○ (یونس ٦)

اے لوگو! تمہارے پاس، تمہارے رب کی طرف سے ایک ایسی چیز آئی ہے جو نصیحت ہے اور دلوں میں جو روگ ہیں، ان کے لئے شفا ہے اور رہنمائی کرنے والی ہے اور رحمت ہے ایمان والوں کے لئے۔ اے رسول ان سے کہہ دیجئے کہ انھیں خدا کے اس انعام و رحمت پر خوشی منانا چاہئے اور وہ اس سے بدرجہا بہتر ہے جس کو وہ لوگ جمع کر رہے ہیں"۔

صحابہ کرام قرآن کے سوا جو کچھ جمع کر رہے ہوں گے، وہ دو ہی چیز ہو سکتی ہے۔ ایک دولت، دوسرے رسول اللہ کی باتیں۔ دولت کا جمع کرنا تو مستبعد ہے۔ اس کو تو سب کے سب رسول پر، دن رات بے دریغ لٹا رہے تھے۔ لہٰذا لامحالہ وہ رسول اللہ کی باتیں تھیں چنانچہ آپ نے غیر از قرآن رسول اللہ کے متعلق ساری چیزیں ضائع کرنے کا حکم دے دیا اور صحابہ کرام نے اس حکم کی تعمیل میں سب کچھ جلا بھی دیا۔ پھر بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ ایک اور بھی مشکل سامنے ہے۔ ایک طرف تو ہمارے سامنے یہ حقیقت تاریخ پیش کی جاتی ہے کہ ایرانیوں کو عربوں سے ہمیشہ نفرت رہی اور آمد قرآن کے بعد جب عربوں نے ایران پر حملہ کیا اور ایرانیوں کی ہزاروں سالہ کیانی و ساسانی سلطنت کا دنیا سے نام و نشان مٹا دیا تو ایرانیوں کی نفرت میں عداوت بھی شامل ہو گئی اور اس نفرت و عداوت نے خوفناک صورت اختیار کر لی۔ انھیں نہ صرف عربوں بلکہ ان کی ہر چیز سے ازلی و ابدی نفرت و عداوت ہو گئی۔

۲۳ھ یعنی عہد حضرت عمرؓ اور ابتدائے فتح عراق و فارس سے ۶۵۰ھ یعنی عباسی خلیفہ المستعصم تک کی ایرانی تاریخ نہایت سخت انتقامی خونریزی ہی کی نہیں بلکہ اس امر کی بھی شاہد ہے کہ ایرانیوں نے عربوں کی حکومت اور ان کے دین کے خلاف ہمیشہ بغاوت کی۔ اور جب ذرا بھی موقع ملا انتقام سلطنت کی کوشش کی اور مذہب اسلام کے خلاف لاتعداد مذاہب نے یہیں سے جنم لیا۔ اس طور پر عربوں کی حکومت اور ان کے دین دونوں کے خلاف ہمیشہ ایرانی صف آرا رہے اور انھیں نیست و نابود کر دینے کے کوشاں اسلام کو مٹا ڈالنے، بدل دینے یا خراب کر دینے کی مختلف تحریکیں بھی، المثلث،

المقنع ابن انقرافر اور بابک خرمی وغیرہ کی قیادت میں ایران ہی سے اٹھیں اور اسی ڈھائی سو برس کے اندر غرض ایرانیوں نے عربوں کی حکومت اور عربوں کے دین دونوں کو بظاہر تو مانا تھا مگر بہ باطن ان کے سخت دشمن تھے اور انہیں مٹا ڈالنے کے ہمیشہ در پے۔ حد یہ ہے کہ ایرانیوں نے حکومت عرب کی زبان تک کو نہیں اپنایا۔ بجز ایران نے کوئی ملک ایسا نہیں جہاں کی' عربوں کی فتح کے بعد' عربی زبان نہیں ہو گئی اور یہ تمام بیانات کچھ غیر مسلم مؤرخوں ہی کے نہیں بلکہ تمام کے تمام مسلم مورخین کا بھی یہی کہنا ہے۔ آپ کسی بھی تاریخ کو اٹھا لیجئے۔ اس میں اس حقیقت کا اعتراف موجود ملے گا۔ حد یہ تو یہ ہے کہ جو ادارے اور مؤرخین معتقد حدیث ہیں وہ بھی یہی کہتے ہیں۔ محترم علامہ سید سلیمان ندوی نے "تفسیر جواہر" اردو ترجمے کے مقدمے میں ایک جگہ فرمایا ہے کہ۔

"اس وقت دنیائے اسلام کے وسیع رقبے کی ترجمانی دو ہی ملک کر رہے ہیں۔ ہندوستان اور مصر۔

تفصیل کا موقعہ نہیں مگر آیئے' متذکرہ بالا تاریخی حقیقت کے متعلق ان دونوں ملکوں کے بعض اکابر کی رائے سن لیجئے۔ میں بہت سی تاریخوں سے اقتباسات پیش کر سکتا ہوں مگر شاید سمجھا جائے کہ وہ مسلم مورخین مذہبی اور معتقد حدیث نہ تھے۔ اس لئے میں نے انہیں نظر انداز کر دیا۔ البتہ "دارالمصنفین" (اعظم گڑھ) کے رکن محترم شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی اور "ندوۃ المصنفین (دہلی) کے رکن محترم سعید احمد صاحب ایم۔ اے دو مشہور و معروف خود معتقد حدیث اور معتقد حدیث مذہبی اداروں کے خوشنام رکن ہیں۔ حدیث کو حجت منوانے کے لئے کتابیں لکھ چکے ہیں۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ یہ دونوں بزرگ اگر ایرانیوں کو عربوں کا سیاسی و دینی مخالف و دشمن بتائیں تو بہ نسبت دوسرے مسلم مورخین کے' زیادہ قابل اعتبار ہوں گے۔ محترم شاہ معین الدین احمد صاحب نے "تاریخ اسلام" جلد دوم ص ۲۵۹ میں فرمایا ہے۔

"اسلام نے جن اقوام و مذاہب کو مغلوب کیا تھا ان میں مخفی مگر نہایت سخت منتقمانہ جذبات موجود تھے۔ انہوں نے خلافت کو درہم برہم کرنے کے لئے

سازش کا نہایت وسیع جال بچھا دیا"۔ [15]

اور ص ۳۱۵ پر فرماتے ہیں ہیں کہ۔ " عجمیوں کے دل سے ان کی حکومت کے زوال کا داغ نہ مٹا تھا اور ان کے دماغ میں ہمیشہ عربوں سے انتقام کے خیالات پرورش پاتے رہے۔ لیکن ان کے مقابلے میں علانیہ اٹھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس لئے خفیہ سازشیں کیا کرتے تھے اور عربی حکومت کو نقصان پہنچانے والی جو تحریک بھی شروع ہوئی تھی اس میں شریک ہو جاتے تھے اور اس کے مبلغ بن جاتے تھے۔ چنانچہ اس قسم کی اکثر تحریکیں عجم ہی سے اٹھیں یا کم از کم انہیں فروغ یہیں حاصل ہوا"۔

محترم سعید احمد صاحب نے مسلمانوں کے عروج و زوال میں "عجمی" مسلمانوں کے اثرات" کے عنوان سے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے ص ۴۴ پر فرمایا ہے کہ۔

"معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو اس کا احساس پہلے سے تھا......... چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ "اے کاش! ایران اور عرب کے درمیان آگ کی دیوار حائل ہوتی"۔

اور عہد بنی عباس پر روشنی ڈالتے ہوئے ص ۸۱ پر لکھتے ہیں۔

---

[15] مولانا عبدالحلیم شرر "دلگداز" نمبر ۵ جلد نمبر ۱۲ میں لکھا ہے۔

" عجمیوں نے اسلامی پبلک اور عربوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے بظاہر دین اسلام کو قبول کر لیا تھا لیکن حقیقتاً ملحد و بے دین تھے اور دین اسلام اختیار کرنے میں ان کی غرض صرف یہ تھی کہ اس سچے دین الٰہی کو ضرر پہنچائیں نہ یہ کہ اس سے کوئی روحانی فائدہ اٹھائیں......... خراسان و فارس کے نو مسلموں......... کے افعال سے صاف پتا چلتا ہے کہ وہ عربی حکومت کی فرمانبرداری نہیں گوارا کر سکتے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح مکر و فن سے پھر اپنی قومی سلطنت قائم کر لیں اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جب بھی کوئی ایسا شخص پیدا ہوتا تھا تو نومسلم عجمی اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جاتے تھے۔)

"اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ مسلمان ہمیشہ اپنی اس بد قسمتی پر روئیں گے کہ آنحضرت صلعم کو دنیا سے تشریف لے گئے ابھی پورے سوا سو برس بھی نہیں ہوئے تھے کہ مسلمانوں نے ایک ایسی حکومت قائم کی جس کی بنیاد محض جوش انتقام' عربوں سے نفرت و عداوت اور خود غرضی پر قائم تھی اور اس بنا پر اسے قائم کرنے اور اسے مضبوط بنانے کے لئے وہ سب کچھ کیا گیا جو اسلامی شریعت میں ناجائز و ناروا تھا"۔

ص ۷۸ پر فرماتے ہیں۔

"خراسانیوں کی گرز ابرز شکن نے بنو امیہ کے قصر حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجادی تو اس کے کھنڈروں پر خلافت بنی عباس کی شاندار عمارت قائم ہوئی۔ یہ عمارت شاید اس وقت تک مضبوط اور پرہیبت و جلال نہیں ہو سکتی تھی جب تک کہ اس کی مٹی کو بنی امیہ کے خون سے نہ گوندھا جاتا اور اس کی بنیاد بے شمار انسانوں کے سروں اور ان کے اعضاء بریدہ پر نہ رکھی جاتی۔ نہر زلب کے کنارے پر اموی لشکروں کے ہزاروں آدمی مارے گئے۔ اس کے علاوہ عراق اور خراسان کے دوسرے مقامات پر بے شمار انسانوں کا خون بہایا گیا۔۔۔۔۔ مگر ان لوگوں کی آتش انتقام پھر بھی سرد نہ ہوئی"۔

غالباً ان دو مقتدر ہندوستانیوں کی رائے یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ ایرانی عربوں کی اور ان کی ہر چیز کے سخت دشمن تھے۔ اب آیئے' دو جلیل القدر مذہبی مصریوں کی رائے ملاحظہ فرمایئے۔ علامہ احمد امین مصری استاذ کلیتہ الاداب بالجامعہ المصریہ' اپنی کتاب "ضحی السلام" جلد دوم میں "اسلام پر مختلف غیر اسلامی تقاضوں کے اثرات" کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

(ا) اس کے اثرات پہلی صدی ہجری کے اواخر میں ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے چنانچہ مختلف مذاہب اور فرقوں نے جنم لینا شروع کر دیا تھا۔ جسے ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ شاید یہی وہ چیز تھی جس کا فتوحات کے وقت حضرت عمرؓ کو سخت اندیشہ تھا۔۔۔۔۔ جنگ جلولا میں مسلمانوں کو اس قدر مال

غنیمت حاصل ہوا کہ اس کے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اور جنگی قیدی بھی کثیر تعداد میں ملے جن میں شرفاء فارس کی لڑکیاں بھی تھیں ــــــ ان لوگوں کی ایک خاص عصبیت تھی جو عربی عصبیت سے نہ صرف الگ ہی تھی بلکہ سخت مخالف بھی تھی۔ ان کی اپنی دینی تقلیدات تھیں جن کی طرف ان کا جھکنا لازمی تھا اور اس رجحان اور جھکاؤ کے ساتھ یقیناً وہ اسلام کی عربی سادگی کے برخلاف ہی اپنا راستہ بنا سکتے تھے"۔

(۲) اس طرح زبان عربی پر عجمی الفاظ' عجمی ترکیبیں' عجمی خیالات اور عجمی مضامین نے اپنا تسلط جما لیا۔ یہی کچھ تم دین کے متعلق کہہ سکتے ہو ــــــ اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلمان فرقوں میں بٹ گئے اور مختلف مذاہب کی بنیادیں پڑنے لگیں۔ حتیٰ کہ قرآن کی شرحیں ان بیانات سے ہونے لگیں جو دوسروں کے یہاں موجود تھے"۔ لے

(۳) انہوں نے عربی زبان سیکھ لی تھی۔ حتیٰ کہ ان کی دوسری نسل عربی زبان میں اسی طرح گفتگو کر سکتی تھی۔ جیسا کہ خود اہل عرب کی اولاد گفتگو کر سکتی تھی۔ لیکن وہ کلیتہً اپنے عقائد میں عربوں کی مثل نہ بن سکے۔ نہ ہی انکی عقلیت' اہل عرب کی عقلیت کو اختیار کر سکی بلکہ ان لوگوں نے اسلام کی حلقہ بگوشی اختیار تو کر لی مگر خود اسلام کو اپنے فارسی رنگ میں رنگ دیا اور اپنے پرانے دین کے تمام عقائد اور تقلید سے علیحدہ نہیں ہو سکے۔ اسلام کو انہوں نے اتنا ہی سمجھا جتنا کہ ان کے قدیمی دین نے سمجھنے کی اجازت دی جسے ان کی قوم نے پشتہا پشت سے قبول کر رکھا تھا"۔

یہ ایک مصری مصنف کی رائے تھی جو کلیتہ الاداب کے مشہور استاد ہیں۔ اب ڈاکٹر طہٰ حسین' مصر کے مشہور مصنف اور وزیر تعلیم مصر سے کچھ سنئے۔ انہوں نے اپنی کتاب "ادب الجاہلی" کے تیسرے باب میں عجمی تعصب سے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔

لے (قرآن کے سب سے پہلے مفسر ابن جریر ہیں جو ایران کے صوبہ طبرستان کے رہنے والے تھے ان کا سنہ ولادت ۲۲۵ھ اور سنہ وفات ۳۱۰ھ ہے۔ یہ تفسیر صرف روایتوں پر مبنی ہے۔ بعد کی تمام تفسیریں اسی کو سامنے رکھ کر لکھی گئیں۔)

مثلاً

(۱) "آپ جانتے ہیں کہ اس گروہ کی اصل وہی عداوت ہے جو مفتوح ایران فاتح عرب کی طرف سے اپنے دل کے اندر رکھتا تھا اور یہ بھی آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ اس عداوت نے فتوحات عرب کی تکمیل کے بعد ہی مختلف شکلیں اختیار کرنا اور مسلمانوں کی دینی' سیاسی اور ادبی زندگی میں متنوع اور دور رس اثرات پیدا کرنا شروع کر دیا تھا"۔ (ص ۲۷۵)

(۲) "یہ لوگ عرب کے قطعی مخلص نہیں تھے۔ وہ ان سیاسی پارٹیوں کے سیاسی اختلافات میں محض اس لئے دلچسپی لیتے تھے کہ ایک طرف وہ زندہ رہ سکیں دوسری طرف غلامی اور اسیری کی زندگی سے نکل کر ایسی زندگی میں داخل ہو جائیں جو آزاد اور سرداروں کی زندگی ہو اور تیسری طرف اس پیاس کو بجھا سکیں اور اس حسد کو تسکین دے سکیں جو عربوں کی عداوت کے سلسلے میں وہ لئے بیٹھے تھے"۔ (ص ۲۷۷)

(۳) "یہ سب باتیں ہم اس لئے بیان کر رہے ہیں کہ آپ کے سامنے ایک تصویر پیش کر دیں۔ اس عداوت کی جو ایرانیوں کو عربوں کے ساتھ تھی"۔

ڈاکٹر طہٰ حسین موصوف نے اپنی دوسری کتاب "ابن خلدون میں (جس کا ترجمہ " دار المصنفین" (اعظم گڑھ) نے شائع کیا ہے) ص ۱۴۰ پر لکھا ہے کہ۔

"عرب کے حق میں جو ظلم کیا گیا ہے۔ اگر ہم اس کے منشاء کو معلوم کرنا چاہیں تو ہم کو ہجرت کے قرن اول کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور اس کا سراغ ایرانی قوم کے اندر لگانا چاہئے جس کو عربوں نے اپنا محکوم بنا لیا تھا۔ اس قوم نے اس حملے کے انتقام لینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی خواہ اس انتقام کی یہ صورت ہو کہ اسلام کے سیاسی اور مذہبی اصولوں کو بدنما کر کے دکھلایا جائے یا اخلاق اور سنت کے بے وقعت کرنے کی دعوت دی جائے (لیکن بہر حال ہر طریقے سے انتقام لیا)۔ یہاں تک کہ ...... اس خاندان عباسیہ کے زمانے میں ایک نیا اسکول قائم ہوا جو شعوبیہ کے نام سے مشہور ہے اور علانیہ رسول اللہ صلعم کی امت اور آپ کے خلفاء کے ذلیل کرنے

کی دعوت دیتا تھا اور قصائد میں' جو عربی زبان میں نظم کئے جاتے تھے۔ ایرانیوں کی عظمت کا ترانہ گایا جاتا تھا"۔

آپ نے دو ہندوستانی اور دو مصری اور اکابرین کی رائے سن لی۔ یہ مقتدر حضرات معتقدین حدیث ہیں۔ انہیں پر کیا منحصر ہے۔ تمام مسلم مورخین ہمارے سامنے یہی تاریخی حقیقت پیش کرتے ہیں کہ ایرانیوں کو عربوں اور ان کی ہر چیز سے شدید عداوت اور سخت نفرت تھی ۔ تاریخ میں قدم قدم پر اس حقیقت کا ثبوت ملتا ہے کہ فتح ایران کے بعد سے ایرانیوں کی نفرت روز بروز بڑھتی ہی چلی گئی۔ تاآنکہ ہنوز قائم ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ایک امریکی سیاح "موروس ہنڈس" (MAURUS HINDUS) ایران گیا تھا' وہ اپنی کتاب "مستقبل کی تلاش میں" (IN SEARCH OF A FUTURE) میں لکھتا ہے۔

(۱) "میرے تہران پہنچنے کے چند ہی دن بعد ایک انگریزی تعلیم پائے ہوئے ایرانی نے مجھ سے کہا کہ ایرانیوں کے متعلق تمہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ بہت جھوٹے ہیں ـــــ تم شاید مجھ سے اتفاق نہ کرو گے۔ لیکن اگر ایرانی شہنشاہوں کے مفتوح ہو جانے اور ایران پر عربوں کے قابض ہو جانے کی تاریخ کا مطالعہ کرو گے تو میرے ہم خیال بن جاؤ گے"۔

(۲) "میری ملاقات ایران کے سب سے پڑھے لکھے افراد اور یونیورسٹیوں کے پروفیسروں سے ہوئی اور مجھے یہ محسوس ہوا کہ یہ سب زردشتی ضابطہ اخلاق کو زندہ کرنے کے کتنے متمنی ہیں۔ ایک اہل قلم نے کہا کہ "ہماری قوم جب ہی عظمت پا سکتی ہے جبکہ ایک بار پھر زردشت ہمارے دل و دماغ پر حکومت کرنے لگے"۔ میں نے کہا "لیکن امتداد وقت کے ساتھ زردشتی اصول میں بھی تو فرق آگیا تھا۔ اس نے کہا۔" صحیح کہ ایسا ہو لیکن گرا ہوا مکان پھر سے تعمیر کیا جا سکتا ہے زردشتی ضابطہ اخلاق ہمارا ایرانی مکان تھا۔ ہماری اچھائیوں کا ایرانی مندر تھا۔ جسے ہم نے اپنے ہی ہاتھوں سے بنایا تھا اور اس روحانی مسالے سے بنایا تھا جو ہمارے ہی مسلک کا تھا۔ عربوں کی طرح ہم صحرائی انسان نہ کبھی تھے اور نہ آج ہیں۔ اسلام کے اندر بڑی

خوبیاں ہیں۔ لیکن ان خوبیوں کے باوجود اسلام بدویوں کا مذہب ہے۔ ہمارے وہ شعرا بھی جو مسلمان تھے، جیسے نظامی وسعدی، زندگی کے بڑے شیدا اور رومان کے متوالے تھے۔ وہ اسلامی تقشف کو قبول نہیں کر سکے۔ ان کی روح ایرانی روح تھی"۔

اس کتاب کا اردو ترجمہ "نگار" (لکھنؤ) کے جنوری نمبر ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا تھا یہ اقتباس اسی سے ماخوذ ہے۔

بہر کیف! اب کہ ہمارے سامنے ہمارے اکابرین، ایک طرف تو عربوں اور ایرانیوں کے ناخوشگوار تعلقات، بغض و عداوت اور نفرت و حقارت کی یہ تاریخ پیش کرتے ہیں اور دوسری جانب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سنیوں اور شیعوں کے وہ ہمارے مجموعہ روایات جو مستند سمجھے جاتے اور "صحیح" کے نام سے مشہور ہیں اور ہمارے سامنے "اقوال رسول" اور "دینی حجت" کی حیثیت سے پیش کئے جاتے ہیں۔ سب کے سب تیسری چوتھی اور پانچویں ہجری کے ایرانیوں کے مرتب و مدون کئے ہوئے ہیں۔

بہت ہی کم پائے اپنے عارف کلام باری نے ہم میں آکر
سرے سے بگڑا ہے سچ جو پوچھو عرب کا مذہب عجم میں آکر

اکبر الہ آبادی

تو ہماری عقل کام نہیں کرتی کہ ہم کیا کریں؟ ملاحظہ ہو۔

(سنیوں کے مجموعہ روایات)

(۱) صحیح بخاری۔	مصنف بخارہ کے رہنے والے۔	سن وفات ۲۵۶ھ ۸۷۰ء
(۲) صحیح مسلم۔	مصنف نیشا پور کے رہنے والے۔	سن وفات ۲۶۱ھ ۸۷۴ء
(۳) سنن ابن ماجہ۔	مصنف قزوین کے رہنے والے۔	سن وفات ۲۷۳ھ ۸۸۶ء
(۴) سنن ابن داؤد۔	مصنف سیستان کے رہنے والے۔	سن وفات ۲۷۵ھ ۸۸۸ء
(۶) سنن نسائی۔	مصنف خراسان کے رہنے والے۔	سن وفات ۳۰۳ھ ۹۱۳ء

(شیعوں کے مستند مجموعہ روایات)

(۱) "جامع الکافی"۔	مصنف کلدن کے رہنے والے۔	سن وفات ۳۲۸ھ ۹۴۰ء

(۲) "من لا یحضرہ الفقیہ"۔ مصنف قم کے رہنے والے۔ سن وفات ۳۸۱ھ ۹۹۲ء

(۳) "نہج البلاغہ" مصنف ہمدان کے رہنے والے۔ سن وفات ۴۰۶ھ ۱۰۱۵ء

(۴) "تہذیب الاحکام" مصنف طوس کے رہنے والے۔ سن وفات ۴۶۰ھ ۱۰۶۷ء

(۵) "الاستبصار" مصنف طوس کے رہنے والے۔ سن وفات ۴۶۰ھ ۱۰۶۷ء

(۶) "بحر الانوار" مصنف اصفہان کے رہنے والے۔ سن وفات ۱۱۱۰ھ ۱۶۹۸ء

اب سوچئے کہ ایک طرف تو ہم سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "روایات" کو "دینی حجت" اور "اقوال رسول" مانو اور دوسری جانب یہی حضرات ہمارے سامنے یہ "تاریخ" بھی پیش کرتے ہیں کہ۔

(۱) جناب رسالت مآب کے عہد مبارک میں روایات لکھی نہیں گئیں تھیں۔ نہ تو خود رسول اللہ نے لکھوایا تھا اور نہ صحابہ نے لکھا تھا اور نہ ان کے بیٹوں نے لکھا تھا۔

(۲) رسول اللہ صلعم کی مرضی ہی نہ تھی کہ قرآن کی طرح روایتوں کو جمع یا حفظ کیا جائے۔

(۳) جن لوگوں نے قرآن کے سوا رسول اللہ سے کچھ اور لکھا تھا اسے خود رسول اللہ نے حکماً ضائع کرا دیا تھا۔

(۴) سینکڑوں برس تک روایتیں قید کتابت میں نہ آئیں بلکہ زبانی رہیں۔

(۵) لوگوں نے اس درمیان میں بے شمار جھوٹی روایتیں بنائیں اور اصل میں خوب خوب اپنی طرف سے ملایا اور یہ بھی بھول گئے کہ کیا ملایا تھا؟

(۶) جھوٹی روایتیں گھڑنے والے مقدس مسلمان بنے ہوئے تھے۔

(۷) تیسری صدی ہجری میں محدثین نے روایات کو لوگوں سے پوچھ پوچھ کر جمع کیا اور جب اس کی صحت جانچنے بیٹھے تو اس میں ننانوے فی صد غلط روایتیں پائی گئیں اور چھ لاکھ میں صرف چھ ہزار روایتیں صحیح قرار پائیں۔

(۸) صحت روایت کا معیار راوی قرار پائے۔

(۹) راوی کو صحیح ماننے کا مسئلہ محض قیاسی ہے۔

(۱۰) خود محدثین میں سخت اختلاف ہے۔ ایک محدث جس راوی کو سچا کہتا ہے دوسرا محدث اسی کو جھوٹا قرار دیتا ہے۔

(۱۱) ایسا بھی ہے کہ روایت جھوٹی ہے مگر راوی سچے ہیں۔

(۱۲) روایتوں کے مجموعے سب سے زیادہ قابل اعتبار ہیں وہ سب کے سب ایرانیوں کے مرتب کئے ہوئے ہیں اور ایرانیوں کو عربوں اور ان کی ہر چیز سے نفرت و عداوت تھی جو ہمیشہ قائم رہی۔

یہ تمام باتیں کوئی منکر حدیث نہیں بلکہ معتقدین حدیث اکابر علماء ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اب ان حالات میں سوچئے کہ واقعی رسول اللہ صلعم کی صحیح باتیں ہم تک کس حد تک پہنچی ہوں گی؟ اور جنہیں "قول رسول" کہا جاتا ہے وہ کس حد تک قابل اعتبار و یقین ہیں؟

اس سلسلے کی سب سے آخری بات یہ بھی سن ہی لیجئے کہ قرآن شروع ہی ہوتا ہے اس یقین دہانی کے ساتھ کہ۔

ذلک الکتب لا ریب فیہ

"یہ وہ مخصوص کتاب (الکتب) ہے جو ہر طرح کے شک و شبہ سے پاک و صاف ہے۔

لہٰذا اس کی طرف سے لوگوں کو شک میں ڈال دینے کے لئے اور اس وہم میں مبتلا کر دینے کے لئے کہ قرآن میں لوگوں نے بڑا رد و بدل کیا ہے۔ بہت سی روایتیں گھڑی گئیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے پاس جو قرآن ہے اس میں وقتاً فوقتاً حک و اضافہ اور ترمیم و تنسیخ ہوتا رہا ہے مگر خرابی یہ تھی کہ یہ روایتیں ادھر ادھر منتشر تھیں اور ہر شخص تک ان تمام روایتوں کے پہنچنے کی کوئی امید نہ تھی اور ان تمام روایتوں کو' جو قرآن کی طرف سی مشکوک بناتی تھیں' مسلمانوں تک پہنچانا بھی ضروری تھا' اس

لئے "صحاح ستہ" کے مصنفین میں سے ابوداؤد کے لائق بیٹے ابوبکر عبداللہ (ولادت ۲۳۰ھ ۸۴۵ء وفات ۳۱۶ھ ۹۲۷ء) نے اس خدمت کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ۔

اگر پدر نہ تو اند پسر تمام کند

ابوبکر عبداللہ نے ایسی تمام روایتوں کو جن کے ذریعہ قرآن میں تحریف و تبدیل اور وقتاً فوقتاً کمی و بیشی کا شک پیدا کرایا گیا تھا۔ ایک کتاب میں جمع کر کے اس کا نام "کتاب المصاحف" رکھا اور اس کو اس طرح ترتیب دیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "کب کس نے قرآن میں کہاں کہاں کیا کیا ردو بدل کیا ہے۔ یہ ایک سو پچانوے صفحات پر پھیلی ہوئی ہے کتاب ہے جس میں صحابہ کرام سے قسم کھلا کھلا کے بیان کرایا گیا ہے کہ پہلے فلاں آیت یوں تھی اور ہم یوں پڑھتے تھے مگر اب یوں ہے۔ اس مجموعہ روایات کو پڑھنے کے بعد اگر آپ کا قرآن پر یہ ایمان باقی رہ جائے کہ قرآن جتنا اور جیسا کچھ نازل ہوا تھا' لفظاً بہ لفظ وہی اور سب کچھ محفوظ طریقے پر ہم تک پہنچا اور موجود ہے' تو خدا کی قسم آپ واقعی بڑے بھاری مومن ہیں۔ ورنہ یہ ممکن نہیں کہ آپ قرآن کی صحت و حفاظت کی طرف سے حد درجہ شک میں نہ پڑ جائیں۔

چونکہ عیسائیوں پر' مسلمان اعتراض کرتے تھے کہ ان کی آسانی کتاب محرف ہو چکی ہے اور لوگوں نے اس میں ردو بدل کر کے اس کی صحت واصلیت ختم کر دی ہے۔ اس لئے ایک عیسائی "آرتھر جعفری" (ARTHUR JEFFERY) نے ایک کتاب لکھی اور شائع کرائی ہے جس کا نام اس نے رکھا ہے۔ "قرآنی متن کے تاریخی مواد" (MATERIAL FORTHE HISTORY OF THE TEXT OF THE QURAN) اس فاضل مستشرق نے قرآن کے متعلق جس قدر اختلافات ہماری روایتوں کی کتابوں میں ادھر ادھر منتشر صورت میں ہیں۔ سب کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے اور پھر اس خیال سے کہ مبادا یہ نہ کہلایا جائے کہ ایک عیسائی نے ازراہ تعصب و دشمنی غیر مستند چیزوں کو اکٹھا کر دیا ہیں۔ اس نے ابو داؤد صاحب کے بیٹے ابوبکر عبداللہ کی متذکرہ بالا "کتاب المصاحف" کو من وعن شائع کر دیا ہے اور اس

طرح ساری دنیا پر یہ ظاہر کر دیا ہے کہ یہ ہے قرآن کی حقیقت' جس کے متعلق مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے لے لی ہے اور وہ لفظ بہ لفظ صحیح طور پر ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ بھی یاد رکھئے کہ اس "کتاب المصاحف" کے مصنف ایرانی ہیں۔

حضرت علامہ ابوالکلام آزاد منکر حدیث نہیں مگر "روایات" کے بارے میں آپ نے ان کی رائے سن لی۔ اب "قرآن" کے بارے میں ان کی رائے سن لیجئے۔ "تذکرہ" ان کی مشہور ترین کتاب ہے۔ اس میں انہوں نے بہت سی روایتیں بھی پیش کی ہیں' مگر صفحہ نمبر ۲۰۲ پر فرمایا ہے۔

آج دنیا میں شہرت و تواتر' نقل و حفظ و روایت اور توارث اسناد و قراۃ و تعامل کروڑہا نفوس عالم' نسلاً بعد نسل و حین بعد حین و تلاوندۃ اوقات خمسہ لیل و نہار کے اعتبار سے یہی اور صرف ہی ایک کتاب (قرآن) یقینی اور محفوظ و غیر متبدل ہے"۔

اب سوچئے کہ قرآن "یقینی" اور "حقیقت" ہے یا روایتیں؟

ان تمام مباحث سے یہ ظاہر ہے کہ محترم جناب اسحاق سندیلوی کا "شریعت اسلامیہ کے کسی حکم میں محض کوئی روایت کہیں سے پیش کر کے صرف اس روایت کی بنا پر کسی اہم اصولی مسئلے اور بنیادی شعبہ حیات میں حلال و حرام یا جائز و ناجائز یا ممنوع و مباح کا اصولی' حتمی فیصلہ کر دینا مناسب نہیں۔ شریعت اسلامیہ نے تصویر کشی یا تصویر بینی کو حرام کیا ہے یا نہیں؟ اور کتا ناپاک ہے یا نہیں؟ یہ بالکل اصولی چیز ہے اور اس کا ہمیشہ کے لئے قطعی فیصلہ ہرگز روایت سے نہیں ہو سکتا۔ بالخصوص جب کہ خود رسول اللہ صلعم کی وصیت ہے کہ مسلمانوں کو کتاب اللہ پر عمل کرنا چاہئے۔

"عبداللہ ابن ابی اوفی سے پوچھا گیا کہ کیا حضور نے وصیت فرمائی تھی؟...... جواب دیا"۔ "کتاب اللہ" پر عمل کرنے کی وصیت کی تھی۔ قال وصی بکتاب اللہ" (بخاری صفحہ ۳۸۲) (روایت نمبر ۱۲۳۸ تجرید البخاری صفحہ نمبر ۴۳۶)

محترم علامہ موصوف نے جو روایت پیش کی ہے۔ اس سے تین باتیں ثابت کرنی

جاتی ہیں۔

(۱) اسلام نے جاندار اشیاء مثلاً انسان اور جانور وغیرہ کی تصویر کو حرام اور ناجائز قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کی صفت خلق سے مماثلت پیدا کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کو یہ پسند نہیں۔

(۲) اسلام نے بے جان اشیاء مثلاً درخت اور پہاڑ وغیرہ کی تصویر کو جائز قرار دیا ہے۔

(۳) کتا مسلمانوں کو نہیں پالنا چاہئے کیونکہ جس گھر میں یہ ہوتا ہے وہاں فرشتے نہیں آتے۔

چونکہ کتے کا تعلق "فنون لطیفہ" کے مباحث سے نہیں۔ جو اس حصہ کتاب کا اصل موضوع ہے۔ اور یہ مسئلہ خواہ مخواہ بیچ میں ٹپک پڑا ہے اور بدقسمتی سے قرآن وروایات کے خلاف مسلمانوں میں کتا مردود ہو گیا ہے اور اس کی جگہ بلی نے لے لی ہے۔ اسلئے میں اس سے متعلق اس کتاب کے تیسرے حصہ میں بحث کروں گا اور دیکھوں گا کہ کیا کتا واقعی ناپاک ہے؟ اور کیا حقیقتاً کتا اس قابل نہیں کہ مسلمان اسے پالیں؟ اور یہ مسلمانوں کے گھروں میں رہے؟ یہاں اس حصہ کتاب میں صرف فنون لطیفہ کی حلت و حرمت سے بحث کی جائے گی۔

تصویر کشی و مجسمہ سازی

محترم جناب محمد اسحاق صاحب موصوف نے یہ تحریر یا کتاب دراصل بنیادی طور پر تصویر ہی کی حرمت کے سلسلے میں لکھی ہے۔ چنانچہ ص ۹ پر یہ فرمایا ہے کہ۔

"اس وقت ہم کو صرف تصویر کے مسئلے سے بحث ہے۔ اس لئے ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ تصویر کشی یا تصویر بینی کے متعلق ذوقی ترقی کی حد کیا ہونا چاہئے؟"

فاضل علامہ محترم نے کتاب کا عنوان بھی "تصویر' علم و عقل کی روشنی میں" رکھا۔ ہے اور ص ۹ پر اسلامی نقطہ نظر سے غور کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر پوری کتاب میں علم و عقل کی جولان گاہ اور اسلامی نقطہ نظر سے غور و فکر کا محور صرف مشکوۃ کی وہی ایک روایت رہی ہے جو اس کتاب کے شروع میں پیش کی جا چکی ہے۔ نہ تو کہیں اس سلسلے میں قرآن کی کوئی آیت زیر بحث آئی اور نہ عقل و فکر ہی سے استمداد کیا گیا شاید علامہ موصوف کے نزدیک وہ روایت ایسی یقینی' حجت اور متحکم ہے جسے نہ قرآن کی روشنی کی حاجت ہے اور نہ عقل کی۔ حالانکہ یہی حضرات ہمیں یہ بھی اطلاع دیتے ہیں کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا تھا کہ۔

العقل اصل دینی

میرے دین کی بنیاد عقل پر ہے ("خاتم النبین" جلد نمبر ۳ صفحہ نمبر ۲۴۷)

بہر کیف اس تصویر والی روایت میں ہے کہ ایک دن جبرائیلؑ آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ میں کل واپس چلا گیا تھا اور آپ کے مکان میں اس لئے داخل نہ ہو سکا تھا کہ۔

(۱) دروازے پر تصویریں تھیں۔

(۲) "مکان کے اندر جو پردہ تھا اس میں بھی تصویریں تھیں"۔

اس کے بعد انہوں نے مشورہ دیا کہ۔

(۱) "جو تصویر گھر کے دروازے پر ہے اس کا سر کٹوا دیجئے تاکہ اس کی شکل درخت کی سی ہو جائے۔ جاندار کی نہ رہے"۔

(۲) اور گھر کے اندر جو پردہ ہے اس کے ٹکڑے کروا کر اس کے گدے بنوا لیجئے جو زمین پر رہیں اور پیروں کے نیچے آئیں۔

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اب آیئے "تصویر" کے سلسلے میں کچھ غور کیا جائے۔ جبرائیلؑ ایک محترم و معزز پیغامبر فرشتہ ہیں۔ ان کا کام خدا کے برگزیدہ بندوں تک اللہ تعالٰی کا پیغام لانا تھا۔ فرشتے صرف وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم ہوتا ہے وہ اپنے جی سے کچھ نہیں کرتے اور نہ خدائی احکام پورا کرنے میں کوئی بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔

لا یعصون اللہ ما امرھم و یفعلون ما یؤمرون ○ (تحریم ۱)

"خدا جس بات کا انہیں حکم دیتا ہے۔ اس میں وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے"۔

آپ پوری روایت پڑھ جایئے۔ جبرائیلؑ نے کہیں پر یہ نہ بتایا کہ کل کیا پیغام خداوندی لائے تھے جس کو تصویر و کتا کی موجودگی کے سبب' بلا رسول تک پہنچائے واپس چلے گئے تھے؟ روایت میں صرف اس ذکر کے بعد کہ میں کل بھی آیا تھا مگر گھر میں داخل نہ ہو سکا۔ کل والی آمد کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ کل کیوں آئے تھے؟ کیا پیغام لائے تھے؟ بس صرف ان ناجائز کاموں ہی سے متعلق مشورہ درج ہے۔ اصل پیغام غائب جس کے لئے کل بھی آئے تھے اور آج پھر دوبارہ آئے تھے۔ پھر یہ بھی پتہ نہیں کہ جب کل تصویر و کتا کے سبب گھر میں داخل نہ ہو سکے تھے تو آج وہ رسول اللہ سے کہاں ملے؟ کیونکہ گھر میں تو داخل نہ ہوئے ہوں گے۔ وہاں تو آج بھی تصویر و کتا موجود ہی تھا۔ ان سب اہم باتوں کے سوا عجیب تر بات یہ ہے کہ اللہ تعالٰی حاضر و غائب

کا جاننے والا ہے۔ یقیناً جبرائیلؑ اس کے حکم سے آنحضرت کے پاس آئے ہوں گے اور کوئی پیغام ہی لائے ہوں گے۔ ان کی غرض تفریحی ملاقات کی نہ ہو گی۔ پھر غیب سے باخبر، خدا نے جب سارا علم رکھتے ہوئے جبرائیلؑ کو اپنے رسول کے پاس بھیجا تھا تو وہ بغیر پیغام پہنچائے ہوئے اس دن لوٹ کیوں گئے؟ اور پیغام رسانی کا فرض انہوں نے دوسرے دن کس کے حکم سے ملتوی کر دیا؟ اور خدا نے انہیں پہلے دن بھیجا ہی کس طرح تھا جب اسے معلوم تھا کہ آج حرم رسولؐ میں تصاویر اور کتے کی وجہ سے جبرائیلؑ داخل نہیں ہو سکتے؟ اور جب جبرائیلؑ ناکام واپس ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان تین خلاف شریعت باتوں پر رسول اللہ کو بذریعہ قرآن متنبہ کیوں نہ کیا؟ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی کہ معاذ اللہ رسولؐ نے تصاویر اور کتے کو اپنے گھر میں جگہ دے دی تھی جو اسلام میں حرام اور ناپاک ہے۔ رسول اللہ ایک سائل کی طرف سے ذرا سا رخ بدلیں تو ان کی تنبیہہ کے لئے جبرائیلؑ یہ قرآنی تہدید لائیں کہ۔

عبس و تولی ○ ان جاءہ الاعمی ○ وما یدریک لعلہ یزکی ○ (العبس)

"پیغمبر چیں بہ جبیں ہو گئے اور انہوں نے منہ پھیر لیا۔ جب ان کے پاس ایک سوالی اندھا آیا اور تم کیا جانو شاید کہ وہ سنور جاتا"

رسول اللہ خانگی موقعہ پر کسی چیز کے نہ کھانے کا خیال اپنی کسی بیوی سے پرائیویٹ طور پر ظاہر کریں تو ان کی تنبیہہ کے لئے جبرائیلؑ یہ قرآنی تنبیہہ لائیں کہ۔

لم تحرم ما احل اللہ لک تبتغی مرضات ازواجک ط (تحریم ۱)

اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لئے تم اس چیز کو کس طرح حرام کرتے ہو جسے اللہ نے حلال کیا ہے؟

یہ مسائل ایسے نہ تھے جو خلاف شریعت ہوں۔ رسول کا منہ پھیرنا بھی اسلامی خدمت ہی کے سلسلے میں تھا[لہ]

لہ (ہجرت کے قبل مکہ معظمہ میں جب آنحضرتؐ اپنی دعوت کی تبلیغ فرما رہے تھے تو ایک دن قریش کے بڑے بڑے روساء آپ کی مجلس میں آکر بیٹھے۔ آپ انہیں سمجھا بجھا رہے تھے۔ بت

باقی صفحہ 52

اور کسی چیز کے نہ کھانے کا تعلق بھی محض ذاتی پسند یا خانگی زندگی سے تھا مگر اس کے باوجود قرآن کے ذریعے سے رسول اللہ کو سرزنش کی گئی لیکن حرام تصویر اور ناپاک کتا کو گھر میں رکھ لینے پر کہ جس کی وجہ سے پیغمبر وحی جبرائیلؑ کو بلا تعمیل حکم واپس چلا جانا پڑا۔ اللہ تعالیٰ نے رسول کو کچھ نہ کہا۔ قرآن میں وہ چھوٹی چھوٹی باتیں تو آگئیں لیکن یہ اس قدر اہم مسئلہ یوں ہی رہ گیا یا کہا تو یوں کہ قرآن کے ذریعہ علی الاعلان نہیں کہا بلکہ چپکے سے جبرائیلؑ کے ذریعہ کان میں کہلوا دیا؟ پھر ذرا ان قرآنی تنبیہوں کے الفاظ و انداز کو دیکھئے اور اس تصویر و کتا والی روایت کے الفاظ و انداز پر غور کیجئے۔ کس قدر مختلف ہے۔ وہاں الفاظ و انداز سے حاکمانہ ناراضگی و ناپسندیدگی اور خداوندی تنبیہہ و تہدید کی شان ظاہر ہے حالانکہ بات زیادہ اہم نہیں۔ اور یہیں بات نہایت اہم ہے۔ مگر کوئی ناراضگی و تنبیہہ نہیں بلکہ جبرائیلؑ محض اپنے طور پر، چپکے سے اس ناجائز عمل کی طرف رسولؐ اللہ کو متوجہ کر کے مشفقانہ مشورہ دیتے ہیں۔ بھلا کوئی عقل سلیم رکھنے والا اس فرق و اہمیت کو نظر انداز کر کے اس روایت پر کبھی ایمان لا سکتا ہے؟ پھر جبرائیلؑ کا تصویر کے سلسلے میں جو مشورہ ہے۔ وہ اور بھی عجیب و غریب ہے۔ فرماتے ہیں کہ۔

"جو تصویر گھر کے دروازے پر ہے۔ اس کا سر کٹوا دیجئے تاکہ اس کی شکل درخت کی سی ہو جائے (جاندار کی نہ رہے)"۔

جناب حضرت ابن عباسؓ کی بھی ایک روایت ہے کہ۔

"حضرت ابن عباس کے پاس ایک شخص نے آکر کہا۔ "میں پیشہ ور آدمی ہوں میرا گزارہ دستکاری پر ہے۔ تصویریں بنایا کرتا ہوں"۔ آپ نے فرمایا...... تصویریں ہی بنانا چاہتا ہے تو درختوں وغیرہ کی تصویریں بنا جن میں جان نہیں ہے"۔ (روایت نمبر ۱۰۰۱ تجرید البخاری ص ۱۹۸)

حضرت ابن عباسؓ نہ جانتے ہوں تو کوئی تعجب نہیں مگر مقام حیرت ہے کہ خدا کے

بقیہ: پرستی کی برائیاں اور توحید کی خوبیاں ان پر ظاہر فرما رہے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ وہ اس دعوت کو قبول کر لیں کہ اتنے میں ایک ...... نابینا مسلمان عبداللہ ابن مکتوم بھی آکر بیٹھ گئے اور کچھ دریافت کرنا چاہا"۔ (سیرۃ النبی جلد نمبر ۴ ص ۹۶ بڑی تقطیع)

اس عظیم المرتبت پیغام رساں فرشتے جبرائیلؑ کو اتنی بھی خبر نہ تھی کہ درخت بے جان نہیں بلکہ جاندار ہیں۔ کیا جبرائیلؑ اور ابن عباس نے اتنا بھی نہ سوچا کہ اگر درخت جاندار نہیں ہیں تو وہ سر سبز کس طرح رہتے ہیں؟ بڑھتے' پھلتے' پھولتے کیونکر ہیں؟ انہیں آب و ہوا کی کیوں ضرورت ہوتی ہے؟ اور اگر وہ مرتے نہیں تو کیوں ہمیشہ سر سبز و شاداب نہیں رہتے اور پھول پھل نہیں دیتے؟

ڈاکٹر نواب سرامین جنگ بہادر (K.C.I.E. J FGSM,ALAD) نے "اسلامک ایسوسی ایشن تھیوسوفیکل ہال" حیدر آباد دکن میں بزبان انگریزی ایک مقالہ ۱۴ اکتوبر اور ۱۴ نومبر ۱۹۳۱ء کو پڑھا تھا۔ اس مقالے میں فاضل مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ جب وہ اور نظام حیدر آباد کلکتہ گئے تھے تو سر جگدیش بوس کا دار التجربہ بھی دیکھنے گئے تھے۔ وہاں انہیں سائنسی ایجادات و اختراعات اور تصانیف کی ایک نئی دنیا نظر آئی۔ یہاں تک کہ ان لوگوں نے درخت کی جانداری کا بھی بچشم خود معائنہ کیا۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ایک ایسا آلہ بنایا جس سے ہم سب کو نظر آیا کہ درخت بھی مانند انسانوں کے سوتے' جاگتے اور رنجور ہوتے ہیں۔ گویا ان میں بھی ایسی جان ہے جس کی نوعیت اور ہماری جان کی نوعیت میں کچھ فرق نہیں۔ البتہ درجے کا فرق تو ضرور ہے۔ سر جگدیش نے بہت سال پہلے یہ بھی اپنے ایجادی آلات سے بتا دیا ہے کہ پتھروں میں بھی علی العموم جملوات میں' جنہیں ہم بے جان سمجھتے ہیں۔ ایک درجے کی جان ہے جس میں میں وہ خاص خاص مہیجات کے مجیب ہوتے ہیں۔ یعنی چند خاص خارجی حرکتوں کا جواب دیتے ہیں جو حیات کی علامت ہے"۔

آگے چل کر انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ۔

"صوفیوں کی رائے میں بھی کوئی جسم بے جان نہیں ہے اور نہ کوئی جان بے جسم ہے۔ ہر جسم جاندار ہے اور ہر جان جسم دار ہے۔ پتھر یا لوہا پودا یا درخت' پرندہ یا چوپایہ' حیوان یا انسان' جن یا ملک' سب کے سب ذی روح بھی ہیں اور ذی جسم بھی۔ اور جان یا روح' سب میں ایک ہی قسم کی ہے۔

> فقط حالت یا درجے کا فرق ہے......... جان جس درجے کی پتھر میں پائی جاتی ہے۔ اس سے بڑھ کر درخت میں ہے........ ذرے سے پہاڑ اور سورج سے تاروں تک سب میں جسم و جان توام ہیں۔"

اب بھلا یہ کیونکر تسلیم کیا جائے کہ خدا کے اس مقرب بارگاہ فرشتے کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ درخت میں بھی ویسی ہی جان ہے جیسی انسان میں؟ اور درخت بھی انسان ہی کی طرح سانس لیتے' بڑھتے' جیتے مرتے' نر و مادہ ملتے' بچے پیدا کرتے اور بشاش و غمگین ہوتے ہیں۔ بھلا یہ کس طرح یقین کیا جائے کہ خدا کے جلیل القدر فرشتہ جبرائیلؑ کو درختوں کی جانداری یا زندگی کا علم اتنا بھی نہ تھا۔ جتنا ہمارے سر جگدیش بوس اور سرامین جنگ بہادر کو تھا؟ ہم کیونکر باور کریں کہ کافر نیاز تو یہ جانتا ہے کہ انسان اور درخت دونوں جاندار ہیں اور ان کی زندگی کا مدار ایک دوسرے پر ہے۔

> "بقائے حیات کے لئے ہوا کا تنفس ضروری ہے۔ البتہ آلات تنفس میں فرق ہے۔ جس طرح انسان و حیوان پھیپھڑوں کے ذریعے سے ہوا کو جذب کرتے ہیں۔ اسی طرح نباتات بھی تنفس ہوا پر مجبور ہیں لیکن دونوں میں فرق ہے۔ انسان اور حیوان میں سانس کے ذریعے سے آکسیجن اندر جاتی اور کاربن کو جذب کرتے اور آکسیجن کو باہر نکالتے ہیں۔ اس نظام میں فطرت کی بڑی مصلحت پنہاں ہے۔ کیونکہ اگر نباتات بھی انسان و حیوان کی طرح آکسیجن کے عاشق ہوتے تو ہوا کا آکسیجن چند دن میں ختم ہو جاتا اور دنیا فنا ہو جاتی' یا اگر انسان و حیوان کے تنفس سے کاربن خارج نہ ہوتا تو تمام نباتات خشک ہو جاتے"۔ (مجموعہ استفسار و جواب جلد نمبر ا ص ۵۶)

لیکن جبرائیلؑ کو اتنی بھی اطلاع نہ تھی اور وہ درختوں کو بے جان سمجھتے تھے؟ یہ کیونکر مانا جائے کہ جبرائیلؑ کو خبر نہ تھی کہ درختوں کے پتوں میں چھوٹے چھوٹے مسامات ہوتے ہیں جن سے وہ سانس لیتے ہیں۔ درختوں ہی کے تنفس سے بخارات آبی پیدا ہوتے ہیں۔ اور زمین پر بارش ہوتی ہے؟ بھلا جو چیز ایک عریاں حقیقت کے طور پر

چھوٹے بچوں' دیہاتی گنواروں اور جاہل عورتوں تک کے مشاہدے میں ہے۔ یہ کیونکر باور جائے کہ اس کی خبر جبرائیلؑ کو نہ تھی؟ پھر انہوں نے درخت کو بے جان قرار دے کر اس کی تصویر بنانا کس طرح جائز قرار دے دیا۔

"جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ لکڑی کا ایک ستون تھا جس سے لگ کر رسول اللہ صلعم کھڑے ہوا کرتے تھے۔ جب آپ کے لئے منبر بنا دیا گیا تو ہم نے ستون کی ایسی آوز سنی جیسی دس مہینے کی حاملہ اونٹنی کی کراہ ہوتی ہے۔ آخر رسول اللہ منبر سے اترے اور اس ستون پر دست مبارک رکھا"۔ (روایت نمبر ۴۸۵۔ تجرید البخاری ص ۱۱۷)

اگر واقعی حضرت ابن عباس کو یہ معلوم نہ تھا کہ درخت بھی جاندار ہیں تو کم از کم وہ اس واقعے سے تو سبق لیتے؟ سوچتے تو کہ جب مردہ اور خشک لکڑی کے ستون میں ایسی جان ہے کہ وہ جاندار اونٹنی کی طرح فرقت رسول میں بلبلانے لگا تو جو درخت زمین پر کھڑا' ہر سبز و شاداب رہ کر پھولتا پھلتا ہے۔ کیا اس میں جان نہ ہو گی۔ ابن عباس رسول اللہؐ کے رشتہ مند اور صحابی تھے۔ ابوہریرہ کے بعد سب سے زیادہ روایتیں بیان کرنے والے تھے' اتنا تو سوچتے کہ اگر درخت جاندار نہیں تو درخت نے رسولؐ اللہ کو جنات کے قرآن سننے کی خبر کیونکر دی تھی؟۔ کیا حضرت ابن عباس کو اس روایت کی خبر نہ تھی۔

"عبداللہ ابن مسعود سے دریافت کیا گیا کہ جس روز جنات نے قرآن سنا تھا اس روز جنات کی خبر حضورؐ کو کس طرح ہوئی تھی؟ فرمایا کہ ایک درخت نے دی تھی"۔ (روایت نمبر ۱۵۲۳۔ تجرید البخاری۔ ص ۲۹۶)

کم از کم حضرت ابن عباس اتنا تو غور کرتے کہ جب موسیٰ کو درخت نے آواز دی تھی۔ (قصص ۴) اور حضرت داؤدؑ کی زبور خوانی پر پہاڑ بھی جھومنے لگتے تھے (سبا ۲) تو کیا وہ جاندار نہیں؟ قرآن میں تو انہوں نے ان تذکروں کو ضرور پڑھا ہو گا؟ پھر درخت کو بے جان کیوں کر دیا؟ اور جب درخت اور پہاڑ بھی انسان' جانور' پرندہ وغیرہ کی طرح

جاندار ہیں تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ انسان اور جانور یا پرندے کی تصویر تو شریعت اسلامیہ میں ناجائز و ممنوع ہو اور درخت پہاڑ وغیرہ کی جائز و مباح؟ قرآن میں واضح حکم موجود ہے کہ۔

"جو میری وعید سے خوف کھانے والا ہو اسے قرآن کی نصیحت کرو"۔ (سورہ ق)

مگر مولوی اسحق صاحب نے فرمایا ہے کہ۔

> "یہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ جاندار اشیاء کی تصاویر بنانے والے کے لئے کس قدر سخت وعید ہے۔ حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ آنحضور صلعم نے فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب ان لوگوں کو ہو گا جو اللہ تعالیٰ کی (صفت) خلق سے مماثلت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ (یا مخلوق الٰہی کے مماثل چیز بنانا چاہتے ہیں)"

حضرت جبرائیلؑ نے درخت کی تصویر بنانے کی اجازت دے دی تو انہوں نے کیا اس پر غور نہیں کیا کہ درخت بھی تو اللہ تعالیٰ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے اور وہ بھی اسی کی مخلوق ہے جس نے انسان و حیوان کو پیدا کیا ہے؟ اگر اللہ تعالیٰ محض صفت خلق سے مماثلت پیدا کرنے پر ناراض ہوتا ہے اور مخلوق الٰہی کے مماثل چیز بنانے پر غصہ ہوتا ہے۔ یا ہو گا تو جس طرح اللہ تعالیٰ انسان اور جانور وغیرہ کی تصاویر بنانے پر ناراض ہو گا۔ اسی طرح درخت اور پہاڑ وغیرہ کی بھی تصویریں بنانے پر خفا ہو گا کیونکہ جس طرح انسان اور جانور جاندار ہیں اسی طرح درخت اور پہاڑ بھی جان رکھتے ہیں۔ فرق صرف درجے کا ہے۔ پھر جس طرح انسان اور حیوان وغیرہ کی تصاویر بنانا "صفت خلق سے مماثلت پیدا کرنا" ہو گا۔ اسی طرح درخت اور پہاڑ وغیرہ کی تصویریں بنانا بھی صفت خلق سے مماثلت پیدا کرنا قرار پائے گا۔ اگر واقعی اللہ تعالیٰ ایک مصور کو اس لئے سزا دے گا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی صفت خلق سے مماثلت پیدا کرنے کی کوشش کی تھی تو بڑا اندھیرا مچ جائے گا پھر تو ایک چشموں کی آنکھ میں شیشہ لگانا بھی جرم ہو گا کیونکہ یہ بھی اللہ کی صفت خلق سے مماثلت پیدا کرنا ہے۔ پھر تو انسانوں اور حیوانوں پر عمل جراحی سرے سے گناہ قرار پائے گا۔ کیونکہ اس کے ذریعے سے ناقص اعضاء کو درست

کیا جاتا یا انھیں بدل دیا جاتا ہے اور ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کی صفت خلق سے مماثلت پیدا کرنا ہے؟

ایک ۲۳ سالہ نوجوان کو لندن میں پھانسی دی گئی۔ اس نے مرتے وقت انوکھی وصیت کی کہ "میرے مرنے کے بعد میری آنکھیں نکال کر کسی اندھے کو لگا دی جائیں"۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور آپریشن کامیاب ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس اندھے کو بصارت عطا فرما دی۔ اس خبر نے دنیا میں ہلچل مچا دی۔ امریکہ' فرانس' اٹلی' جرمنی اور روس ہر جگہ فن جراحی کے ذریعے سے قدرت کی اس نعمت بخشی پر اظہار مسرت کیا گیا۔ ہندوستان میں بھی تقریباً" آٹھ لاکھ اندھے ہیں۔ ان میں بڑی تعداد ایسی ہے کہ اگر انھیں موقع سے زندہ آنکھیں مل جائیں اور لگا دی جائیں تو وہ بینا ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ مسئلہ حکومت کے زیر غور ہے۔ چین سے خبر آئی ہے کہ اس واقعے سے متاثر ہو کر ایک چینی ڈاکٹر نے بندر کی آنکھ ایک اندھے کو تجربتہ لگا دی اور یہ آپریشن بھی کامیاب رہا۔ اس تجربے نے اور بھی سہولتیں پیدا کر دی ہیں۔

دو تازہ ترین خبریں پاکستان اور ہندوستان کی ملاحظہ ہوں۔

۱۔ "پاکستانی اندھوں کے لئے امریکی آنکھیں"۔

کراچی ۲۹ جولائی۔ ایک امریکن نے مرنے سے پہلے اپنی دونوں آنکھیں عطیہ کے طور پر دینا منظور کر لی تھیں' وہ کراچی پہنچا دی گئیں اور ان سے پاکستان کے دو اندھے نوجوانوں کی بصارت بحال کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان دونوں نوجوانوں کا آپریشن ایک مقامی ہسپتال میں پاکستانی ڈاکٹروں نے کیا۔ یہ آنکھیں مسٹر کلیٹن صفری نے عطیہ کے طور پر دیں۔ جو حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے انتقال کر گئے۔ پاکستانی ڈاکٹر آپریشن کے بارے میں پر امید ہیں"۔ (روزنامہ "سیاست جدید" (کانپور) مورخہ ۳۲-۷-۶۱)

۲۔ "دو نوجوانوں کی بینائی بحال"

بمبئی۔ ۳۱ جولائی۔ ایک ساٹھ سالہ پنشنر مسٹر پرشوتم داس مہتا نے اپنی موت

سے تھوڑی دیر پہلے اپنی دونوں آنکھیں یہاں جے۔ جے ہسپتال کے گورنمنٹ آئی بینک (Govt. Eye Bank) کو دے دیں۔ ان کی موت کے ایک گھنٹہ کے اندر دونوں آنکھیں نکال کر کامیابی کے ساتھ دو نوجوانوں کی آنکھون میں آپریشن کے ذریعہ لگا دی گئیں۔ دونوں نوجوان جزوی طور پر اندھے تھے۔ لیکن اب آپریشن کے بعد ان کی بینائی ٹھیک ہو گئی ہے"۔

(روزنامہ "سیاست جدید" (کانپور) مؤرخہ ۳-۸-۲)

لیکن واقعی اللہ تعالیٰ اس بات پر ناراض ہوتا ہے اور قیامت کے دن اس شخص کو سب سے زیادہ عذاب دے گا۔ جو اس کی صفت خلق سے مماثلت پیدا کرنا چاہتا ہے تو اس آنکھ کی تبدیلی پر اللہ تعالیٰ اور بھی زیادہ غضبناک ہو گا کیونکہ جسے اللہ تعالیٰ ہی نے اندھا بنا دیا ہے اسے آنکھیں دینا نہ صرف خدا کی صفت خلق سے مماثلت پیدا کرنا ہے بلکہ مشیت الٰہی میں دخل انداز ہونا بھی ہے۔ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ اس اندھے کو بینا بنانا چاہتا تو اس کی آنکھیں اور بصارت ضائع ہونے ہی کیوں دیتا؟ اور جب اس کی بصارت خود اللہ نے ضائع کر دی ہے تو اسے آنکھیں دینا مرضی الٰہی میں دخل دینا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے جو نظریہ' نقطہ نظر اور قول' کافروں کا بیان ہے۔ وہی اب مومنوں کا ہوا جا رہا ہے۔ قرآن کافروں کا ذکر کرتا ہے کہ۔

"اور جب ان سے کہا جاتا کہ اللہ نے جو کچھ تمہیں دیا ہے۔ اس میں سے کچھ خرچ کرو تو یہ کفار مومنوں سے کہتے ہیں کہ کیا ہم ایسے لوگوں کو کھانے کو دیں جنہیں اگر خدا چاہتا تو خود کھانے کو دیتا؟۔ تم تو صریح غلط میں پڑے ہوئے ہو"۔ (سورۃ یٰسین)

بہر کیف علامہ موصوف نے جو روایت پیش کی ہے۔ وہ محل نظر ہے اور یہ بات عقل تسلیم نہیں کرتی کہ جبرائیلؑ نے انسان اور حیوان کو تو جاندار مانا اور درخت اور پہاڑ کو بے جان سمجھا۔ اور جاندار کی تصویر بنانا تو ناجائز و ممنوع قرار دے دیا مگر بے جان تصویر کو جائز و مباح کر دیا۔ اسی طرح یہ بات بھی عجیب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسان اور حیوان کی تصاویر بنانا تو اللہ تعالیٰ کی صفت خلق سے مماثلت پیدا کرنا

ہے۔ مگر درخت اور پہاڑ کی تصویریں بنانا اللہ تعالیٰ کی صفت خلق سے مماثلت پیدا کرنا نہیں۔ ایک صاحب نے فتویٰ دیا ہے کہ۔

> "ضرورتاً" مکمل تصویر سے پرہیز کرو اور ایسی تصاویر بنا سکتے ہو جن پر جان ڈالنے کا اطلاق نہ ہو یعنی جزوی یا عضو کی"۔

("الارشاد جدید"۔ (کراچی) مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۵۵ء)

گویا انسان کا سارا جسم تو جاندار ہے اور اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے۔ مگر جسم کا کوئی عضو یا کوئی جزوی حصہ نہ تو جاندار ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا۔ اس لئے پورے جسم کی تصویر تو ناجائز ہے۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت خلق سے مماثلت پیدا کرنا ہے جس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے مگر جسم کے کسی حصے کی یا کسی خاص عضو کی نامکمل تصویر بنانا جائز ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت خلق سے مماثلت پیدا کرنا نہیں جس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہو۔ حالانکہ اگر انہوں نے میدان جنگ میں انسانی مقطوع انسان کو علیحدہ علیحدہ پھڑکتے نہ دیکھا ہو گا جس سے ان کو معلوم ہو جاتا کہ جسم کا ہر حصہ بجائے خود جاندار ہے تو کم از کم گھر میں چھپکلی کا تو ضرور ہی نظارہ کیا ہو گا کہ جب کوئی بچہ اس کی دم کاٹ دیتا ہے تو بریدہ حصہ تادیر تڑپتا اور پھڑکتا رہتا ہے اور بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ جسم کا ہر حصہ جاندار ہے۔

اللہ تعالیٰ کی بنائی اور پیدا کی ہوئی چیزوں کی تصویر بنانا ہرگز صفت خلق سے مماثلت پیدا کرنا نہیں بلکہ یہ محض نقل اتارنا ہے۔ تصویر کے معنی ہی صورت بنانا ہے ہم جو تصویر بناتے یا کھینچتے ہیں وہ تخلیق نہیں بلکہ تقلید ہے۔ ہم کوئی اصل نہیں بناتے بلکہ نقل اتارتے ہیں۔ سورۃ کوثر کی سی کوئی آیت بنا ڈالنے کی کوشش کرنا تو اللہ تعالیٰ کی صفت خلق سے مماثلت پیدا کرنا کہلا سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص سورہ کوثر کی نقل کرے یا اس کی عکسی تصویر لے تو یہ اللہ تعالیٰ کی صفت خلق مماثلت پیدا کرنا کیونکر کہلائے گا؟ اگر ہم کسی انسان یا حیوان یا پرندے یا درخت یا پہاڑ کی تصویر بنائیں اور کھینچیں تو یہ ایسا ہی ہو گا جیسا لوگ قرآن کی سورت یا آیات نقل کرتے یا ان کا عکسی فوٹو لیتے ہیں۔ پھر اگر خدا کے نازل کئے ہوئے قرآن کی سورت یا آیات نقل

کرتے یا ان کا عکسی فوٹو لیتے ہیں۔ پھر اگر خدا کے نازل کئے ہوئے قرآن کی نقل اتارنا اور فوٹو لینا اللہ تعالیٰ کی صفت خلق سے مماثلت پیدا کرنا نہیں کہلا سکتا تو خدا کے پیدا کئے ہوئے انسانوں' حیوانوں' پرندوں' درختوں اور پہاڑوں وغیرہ کی نقل اتارنا یا تصویر لینا' اللہ تعالیٰ کی صفت خلق سے مماثلت پیدا کرنا کس طرح کہلا سکتا ہے۔ شمس العلماء حافظ محب الحق صاحب نے "بلاغ الحق" میں خوب فرمایا ہے کہ۔

"خدا کی بنائی ہوئی چیزوں کی تصویریں تو اتار سکتے ہو مگر ایک مچھر پیدا نہیں کر سکتے۔ اسی طرح قرآن کی کتابت تو کر سکتے ہو مگر ایک سورت کا بھی جواب نہیں لا سکتے"۔ ص ۲

حضرت ابراہیم نے جب اپنے مخاطب بادشاہ سے اللہ تعالیٰ کی صفت یہ بیان کی کہ۔ "میرا پروردگار لوگوں کو جلاتا اور مارتا ہے" تو ان کے مخاطب بادشاہ نے اس دلیل کو نہ مانا اور کہا کہ بھلا یہ کون سی بڑی بات ہے۔ "میں بھی لوگوں کو جلاتا اور مارتا ہوں"۔ چونکہ کمال و نقص کے فرق کے ساتھ بادشاہ کی اس دلیل میں ایک وزن تھا۔ اس لئے حضرت ابراہیم نے اپنی پیش کردہ اس دلیل پر اصرار نہ کیا۔ وہ ہٹ دھرمی سے الجھنے نہ لگے۔ بلکہ انہوں نے بادشاہ کی اس دلیل میں زور پا کر موضوع بدل دیا اور فرمایا کہ اچھا۔

"اللہ تعالیٰ تو سورج کو پورب سے نکالا کرتا ہے تم اسے پچھم سے تو نکال کر دکھاؤ۔ اس پر وہ کافر مبہوت ہو کر رہ گیا"۔ (سورہ بقرہ ۳۵)

غور فرمایئے' پہلی دلیل کو بادشاہ نے اس طرح کاٹ دیا تھا کہ جو کام تمہارا اللہ کرتا ہے وہ میں بھی کرتا ہوں۔ بات ایک حد تک درست تھی اسی لئے حضرت ابراہیم نے اس دلیل سے صرف نظر کر لیا اور دوسری دلیل میں ویسا ہی کرنے کی شرط نہیں پیش کی بلکہ الٹ کرنے کی شرط پیش کی۔ جس پر وہ مبہوت ہو کر رہ گیا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ہم بظاہر دیکھنے میں ویسا تو کر سکتے ہیں مگر الٹا نہیں کر سکتے۔ یعنی ہم نقل تو اتار سکتے ہیں مگر اصل نہیں بنا سکتے۔ اکبر کے عہد میں فن تصویر نے بہت ترقی کی تھی۔ کچھ لوگوں نے اعتراض کیا کہ "تصویر" خدا پرستی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے والی چیز

ہے۔ اکبر نے سنا تو کہا۔

"مصوری کی جو مذمت کی جاتی ہے۔ وہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ مصور سے بڑا خدا شناس کوئی اور ہو بھی نہیں سکتا۔ وہ جب کسی جاندار کی تصویر بناتا ہے تو اس کا جوڑ جوڑ نمایاں کر دیتا ہے۔ لیکن وہ چونکہ اس پیکر تصویر میں روح نہیں پھونک سکتا۔ اس لئے اپنے عجز کا اعتراف اس کی محض نقل اتار کر کرلیتا ہے۔ اس طور پر وہ خدا کی قدرت و طاقت کا قائل ہو جاتا ہے اور یہی خدا شناسی ہے۔"

قطع نظر اس سے اگر ایک منٹ کے لئے یہ مان بھی لیا جائے کہ تصویر بنانا اللہ تعالٰی کی صفت خلق سے مماثلت پیدا کرنا ہے۔ تو یہ کون سا گناہ ہے۔ علامہ اقبال نے بہ دلائل و براہین ثابت کیا ہے کہ انسان اور حیوان میں فرق ہے تو یہی کہ حیوان کسی شئے کی تخلیق نہیں کرتا اور انسان میں قوت تخلیق بھی ہے۔ انسان اپنے تخلیقی کارناموں سے خالق کائنات کے پروگرام میں اس کا رفیق بن جاتا ہے اور اپنی قوت تخلیق سے کائنات کے حسن میں اضافہ کرتا ہے۔ چنانچہ علامہ موصوف نے اللہ اور انسان کو صفت خلق میں مماثل بتایا ہے۔ ان کی ایک نظم ہے جس میں اللہ تعالٰی انسانوں سے کہتا ہے۔

جہاں راز یک آب و گل آفریدم تو ایران و تاتارو زنگ آفریدی
من از خاک پولاد و ناب آفریدم تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی' نہال چمن را
قفس ساختی طائر نغمہ زن را

انسان جواب دیتا ہے کہ۔

تو شب آفریدی' چراغ آفریدم سفال آفریدی' ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر' نوشینہ سازم

اس لئے اللہ تعالیٰ کی صفت خلق سے مماثلت پیدا کرنا تو عین مشیت الٰہی ہے۔
امام الہند علامہ ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں۔

خدا تو مسلمانوں سے چاہتا ہے کہ مجھ کو نمونہ بناؤ اور میرے صفات کاملہ سے مشابہت کرو۔ تخلقوا با خلاق اللہ" (مضامین آزاد جلد ۲ ص ۲۵)

پھر ہمارا تصویریں بنانا یا کھینچنا حرام' ناجائز اور ممنوع کس طرح ہو سکتا ہے بالخصوص جب کہ اس کا تعلق علم و فن اور صنعت و دستکاری سے ہے؟۔ ظاہر ہے کہ ہمیں سارا علم اللہ ہی سے ملا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی استعداد علمی کو ہر جگہ اپنے ہی سے منسوب کیا ہے۔

"جس نے قلم کے ذریعے سے تعلیم دی اور ان چیزوں کی تعلیم انسان کو دی جنہیں وہ جانتا نہ تھا"۔ (سورہ علق)

یعنی وہ تمام علوم و فنون جو ہم انسان لکھ پڑھ کر حاصل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بخشے ہوئے ہیں۔ علم' انسان خود محنت کر کے حاصل کرتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنے سے کی ہے۔

کما علمہ اللہ (سورہ بقرہ ۳۹) اس طرح جس طرح اللہ نے اسے علم دیا ہے۔

کتوں کی تربیت کا علم انسانوں نے خود حاصل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کوئی کتاب نہیں اتاری مگر اللہ تعالیٰ نے اس علم کو بھی اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

"خدا کے دیئے ہوئے علم کے مطابق تم نے جنہیں سکھلایا ہو"۔ (سورہ مائدہ)

پھر تصویر کشی یا تصویر سازی کا علم بھی تو اسی کا دیا ہوا ہے۔ اس لئے اس علم سے استفادہ کیونکر ناجائز ہو سکتا ہے؟ اور جب اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ انسان اس کی صفت خلق میں مماثلت پیدا کریں تو مجسمہ سازی یا تصویر کشی حرام کیونکہ ہو سکتی ہے۔
اللہ تعالیٰ نے "اسماء حسنیٰ" کا ذکر کیا ہے۔

اور اللہ ہی کے لئے ہیں سارے اچھے نام"۔ (سورہ اعراف)

کہا جاتا ہے کہ اللہ کی ذات کو کوئی نہیں پا سکتا۔ اس کا عرفان "اسماء الحسنیٰ" یعنی اس کی بہازیں صفات (ATTRIBUTES) کے ذریعے ہی ممکن ہے اور وہ بھی مجرداً نہیں بلکہ مظاہر کائنات میں اس کی جو صفات بکھری ہوئی ہیں ان کے ذریعے۔ پس ہمارا نصب العین یہ ہے کہ ہم تمام صفات الہیہ کو اسی تناسب کے ساتھ ایک وحدت کی شکل میں اپنے اندر سمو کر ساری کائنات پر تصرف کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ۔

"کہہ کہ ہم نے خدا کا رنگ اختیار کیا اور خدا سے بہتر رنگ کس کا ہو سکتا ہے اور ہم اسی کی عبادت کرنے والے ہیں"۔ (سورہ بقرہ ۲۱)

اسی اللہ کے رنگ میں رنگنے کو "تخلقو باخلاق اللہ" کہا گیا ہے۔ جس کا ذکر علامہ آزاد نے کہا ہے یعنی خدائی رنگ میں رنگ جاؤ۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ اللہ کا رنگ اختیار کرنے اور خدائی رنگ میں رنگنے کی صورت کیا ہو گی؟ اس کی شکل تو صرف یہ ہی ہو سکتی ہے کہ جو کچھ اللہ کرتا ہے وہی ہم کو بھی کرنا چاہیے۔ اب اگر اللہ تمام بنی نو انسان کو کھانے کو دیتا ہے تو ہم سے بھی جتنا ہو سکے ہم بھوکوں کو کھانا کھلائیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں۔

"انسان میں خدا کی صفات کاملہ کی ایک دھندلی سی جھلک موجود ہے۔ علم قدرت، حیات، سمع، بصر، ارادہ، غضب، رحم، سخاوت وغیرہ تمام صفات رحمانی کی ناقص مثالیں اس کے اندر اللہ نے ودیعت رکھی ہیں"۔ (سیرۃ النبی صفحہ ۴)

اب آیئے، دیکھا جائے کہ اس بارے میں قرآن کیا رہنمائی کرتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق فرمایا ہے۔ فتبرک اللہ احسن الخالقین (سورہ مومنون)

"سو کیسا مبارک ہے اللہ جو تمام خالقین میں سب سے اچھا ہے"۔

آخر اس کا مطلب کیا ہے؟ انسان اللہ تعالیٰ کے فعل خلق میں ممد و معاون ہے۔ اس لئے وہ بھی خالق ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بھی خالق ہے اور انسان بھی۔ البتہ اللہ تعالیٰ خالق کامل ہے اور انسان خالق ناقص۔ اللہ تعالیٰ ایک انسان پیدا کرتا ہے۔

(اللہ تعالیٰ واقعی کسی انسان کی مدد کا محتاج نہیں۔ یہ ایک اصطلاحی لفظ ہے۔ قرآن میں ہے۔ "بے شک اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا جو اللہ کی مدد کرے گا۔ بیشک اللہ قوی و غالب ہے"۔ (سورہ الحج)

اور انسان اسی مخلوق کی تصویر بناتا ہے۔ اس حد تک خالقیت میں دونوں برابر ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اللہ جو تصویر بناتا ہے:۔

اس نے تمہاری تصویر بنائی پھر کیا خوبصورت تصویر بنائی۔" (مومن ۷)

وہ کامل ہوتی ہے۔ کیونکہ ذی روح ہوتی ہے اور انسان صرف اس کی نقل اتارتا ہے۔ وہ اس میں جان نہیں ڈال سکتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ "احسن الخالقین" ہے۔ اگر انسان کی صفت خالقیت کو نہ مانا جائے تو یہ آیت ہی بیکار ہو جاتی ہے۔ اگر "خالقین" زیادہ نہیں تو "احسن" اور "احقر" کا سوال کیونکر پیدا ہو سکتا ہے؟ اللہ تعالے اپنی تعریف میں فرماتا ہے:۔

"اور میں سارے رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہوں۔" (اعراف۔۱۸)

اگر انسان بھی "رحیم" نہیں ہے تو اللہ تعالے نے اپنے کو ارحم الراحمین کیسے فرمایا؟ پھر یہ عجیب بات ہے کہ ہم حکم کریں' ہم رحم کریں تاکہ ہماری وہ خدائی صفات ظاہر ہوں لیکن ہم تصویر نہ بنائیں کیونکر اس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کو کہا ہے کہ:۔

"کیا اللہ تمام حاکموں میں سب سے بہتر حاکم نہیں؟" (والتین۔۱)

اگر انسان بھی "حاکم" نہیں تو یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ ہم "احکم الحاکمین" ہیں؟ اسی طرح اگر انسان بھی خالق نہیں تو اللہ تعالے نے اپنے کو "احسن الخالقین" کیونکر قرار دیا؟ پھر اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی تمام صفات میں ایک صفت یہ بھی بیان کرتا ہے کہ:۔

"وہ اللہ ایسا ہے جو خالق ہے۔ باری ہے مصور ہے۔" (حشر۔۳)

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی تین صفتیں بیان کی ہیں' اول "خالق" ' دوم "باری" سوم "مصور"۔

ا۔ خالق کا مطلب ہے پیدا کرنے کا ارادہ کر کے عدم سے وجود میں لانے والا۔ پیدائش و نمود کی اسکیم بنا کر خلعت ظہور میں لانے والا۔

۲۔ "باری" کا مطلب ہے تخلیق کے بعد ایسی کامل ترتیب دینے والا جس کی کوئی مثال یا نمونہ پہلے سے موجود نہ ہو۔ گویا اکا کر امتیازی درجہ دینے والا۔

۳۔ "مصور" کا مطلب ہے تخلیق و ترتیب کے بعد ایسی اہمیت اور مکمل شکل دینے والا جس کو آنکھ سے دیکھا اور عقل سے سمجھا جا سکے۔

چنانچہ اس سلسلے میں دوسری جگہوں پر فرمایا گیا ہے۔

ا۔ "بیشک ہم نے تم لوگوں کی تخلیق کی۔ پھر ہم نے تمہاری صورتیں بنائیں۔" (اعراف۔۲۲)

۲۔ "تمہاری صورتیں بنائیں تو خوب ہی صورتیں بنائیں۔" (مومن۔۷)

۳۔ "جس نے تجھ کو خلق کیا پھر درست کیا۔ پھر متوازن کیا۔ پھر جس صورت میں چاہا تجھے ترکیب دے دیا۔" (انفطار۔ا)

آپ نے غور فرمایا؟ اللہ تعالیٰ نے آیت میں واضح کر دیا ہے کہ "تخلیق" و "تصویر" میں فرق ہے۔ "مصور" اس کو کہتے ہی نہیں ہیں جو کسی چیز کی تخلیق کرے۔ یہاں پر یہ بھی سمجھ لیجئے کہ انسانی کارناموں کو جو "تخلیقات" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کا بھی وہ مفہوم نہیں ہے جو میں نے تخلیق کا اوپر بیان کیا ہے۔ ہمارے یہاں مصور کی تصویر' مصنف کی تصنیف' موجد کی ایجاد' سب کو "تخلیقات" کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہی بے جان اشیاء کا بنانا ہے۔ اسی لئے انسانی کارناموں کو "

تخلیقات" کہا جاتا ہے اور الٰہی کارناموں کو "مخلوقات" کا لقب دیا جاتا ہے۔ تصویر و مجسمہ سازی "مخلوقات" نہیں کہ جن کے سبب اللہ تعالے انسان پر صفت خلق سے مماثلت پیدا کرنے کا چارج قائم کرے اور سزا دے۔ بلکہ "تخلیقات" ہیں یعنی "مخلوقات" کی نقل اور تصویر۔ اور اللہ تعالیٰ اس نقل بنانے پر کبھی خفا نہیں ہو سکتا۔ بفرض محال اگر انسان اللہ تعالیٰ کی صفت خلق سے مماثلت پیدا کرنے کی بھی کوشش کرتا ہے تو یہ کوئی گناہ نہیں۔

جب اللہ حاکم ہے اور ہم بھی حاکم ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ خالق ہے اور ہم بھی خالق ہیں تو جب اللہ مصور ہے۔ ہم مصور کیوں نہیں ہو سکتے؟ البتہ جس طرح اللہ احکم الحاکمین اور احسن الخالقین ہے اسی طرح وہ احسن المصور بھی ہے۔ وہ تخلیق کرتا ہے۔ ہم تقلید کرتے ہیں۔ وہ اصل بناتا ہے۔ ہم اس کی نقل اتارتے ہیں۔ پھر اسلام میں تصویر سازی و تصویر کشی ناجائز اور حرام کیونکر ہو جائے گی؟ لوگ کہتے ہیں کہ۔

"اللہ خود جمیل ہے۔ اس لئے جمال کو پسند کرتا ہے۔"

مگر دوسری جانب کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مصور تو ہے مگر تصویر کو مطلقاً پسند نہیں کرتا۔ یہ کیسی بات ہے؟ اگر وہ جمیل ہے اور اس لئے جمال کو پسند کرتا ہے تو پھر جب وہ مصور ہے، تصویر کو ناپسند کیوں کرنے لگا؟ کہا جاتا ہے کہ انسان زمین پر خدا کا نائب ہے۔ آخر یہ کیسا نائب ہے کہ ایک مصور کا نائب ہوتے ہوئے بھی وہ کوئی تصویر نہیں بنا سکتا؟ بہرحال محض کسی روایت کی بنا پر شریعت اسلامیہ کا کوئی اصولی مسئلہ نہیں بن سکتا اور تصویر کو کسی طرح حرام نہیں قرار دیا جا سکتا۔

اسلام عرب میں آیا تھا۔ رسولؐ عربی تھے۔ قرآن کے اولین مخاطب عرب تھے اور عرب میں اسلام کی آمد سے بہت پہلے سے تصویر کا رواج موجود تھا۔ اہل عرب دیواروں، برتنوں اور کپڑوں پر تصویریں بناتے تھے۔ چنانچہ عربی زبان میں جو کپڑوں کے نام رائج تھے وہ خود اس امر کے گواہ ہیں کس کس قسم کی تصویریں ان پر ہوتی تھیں۔ جن کپڑوں پر پرندوں کی تصویریں ہوتی تھیں اسے وہ مطیر کہتے تھے۔ گھوڑے کی تصویر والے کپڑوں کو وہ مخیل کہتے تھے۔ درختوں کی تصویر والے کپڑوں کو وہ مشجر کہتے تھے۔

جب اسلام آیا تو قرآن نے ہر اس چیز کو روک دیا جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے غیر مفید پایا۔ ایک واضح کتاب اور ایک مفصل دستور العمل دیا اور اس کتاب میں دعویٰ کیا کہ ہم نے اس میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ انسانوں' حیوانوں' درختوں کی تصاویر والے کپڑے عرب میں رائج تھے۔ دیواروں' پردوں' برتنوں پر تصاویر بنائی اور کھدی ہوئی ہوتی تھیں۔ مگر قرآن نے مطلقاً" اسے نہ روکا۔ قرآن میں لفظ لیسئلونک سے ظاہر ہے کہ اہل عرب بعض خاص معاملے میں خود بھی مرضی الٰہی معلوم کرنے کے لئے سوال کرتے تھے جیسے حائضہ عورتوں کی بابت کہ سوال کرنے پر اس سلسلے میں احکام آئے۔ مگر عربوں نے خود بھی تصویردار کپڑوں' برتنوں پردوں خواہ فی نفسہ تصاویر بنانے' تصاویر دیکھنے اور تصاویر سے دلچسپی لینے کے سلسلے میں رسول اللہ سے کوئی سوال نہ کیا۔ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ جب اہل عرب قبول اسلام کے بعد چھوٹے چھوٹے مسئلوں میں بھی رسول اللہ سے سوال کیا کرتے تھے اور ہر معاملے اور مسئلے میں مرضی الٰہی اور اسلامی تعلیمات جاننے کے خواہاں تھے تو انہوں نے اس بارے میں خدائی حکم کیوں نہ دریافت کیا۔ آخر کیوں ان میں سے کسی کا بھی ذہن اس طرف کبھی منتقل نہ ہوا کہ تصویر کے معاملے میں بھی خدائی مرضی واضح طور پر دریافت کر لی جائے؟ جواب یہ ہے کہ اہل عرب تصاویر کا شمار فنون لطیفہ اور صنعت ودستکاری میں کرتے تھے۔ وہ تصاویر وتماثیل کو سامان تجارت میں شمار کرتے تھے۔ جس کا صاف پتا "صحیح بخاری" کی روایتوں سے بھی چلتا ہے۔ اس لئے انہوں نے اس کے متعلق پوچھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی۔

> حضرت ابن عباس کے پاس ایک شخص نے آ کر کہا کہ میں مصور آدمی ہوں۔ میرا گزر دستکاری پر ہے۔ تصویریں بنایا کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا۔ میں تجھ سے وہی بات کہوں گا۔ جو میں نے رسول اللہ سے سنی ہے۔ میں نے حضورؐ کو فرماتے سنا ہے کہ مصور کو خدا تعالیٰ عذاب میں مبتلا کرے گا تاکہ اپنی بنائی ہوئی تصویروں میں روح پھونکے اور وہ تصویروں میں جان کبھی نہ ڈال سکے گا۔ یہ سن کر وہ شخص بہت کبیدہ خاطر ہوا اور اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ یہ دیکھ کر ابن عباس نے فرمایا۔ افسوس ! اگر تو نہیں مانتا اور

تصویریں ہی بنانا چاہتا ہے تو درختوں وغیرہ کی تصویریں بنا جن میں جان نہیں ہے۔"

(روایت نمبر۱۰۰۱۔ تجرید البخاری ص ۱۹۸)

"حضرت جابر کہتے ہیں رسول اللہ مکہ میں تھے اور فتح مکہ والا سال تھا کہ میں نے حضور کو فرماتے سنا۔ خدا اور اس کے رسول نے شراب' مردار خنزیر اور مورتیوں کی بیع حرام کی ہے۔"

(روایت نمبر۱۰۰۲ تجرید البخاری ص۱۹۸)

ان روایتوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اہل عرب چونکہ تصاویر کو صنعت ودستکاری میں شمار کرتے تھے اور مورتیوں کی وہ تجارت کرتے تھے اور قرآن صنعت وتجارت پر کوئی پابندی نہ لگاتا تھا۔ اس لئے کسی کے بھی دماغ میں یہ بات نہ آئی۔ اور انہیں وہم بھی نہ گزرا کہ تصویر کے متعلق حلت وحرمت کا سوال کریں۔ چنانچہ اہل مدینہ نے تصاویر والے کپڑوں' برتنوں' پردوں' خواہ فی نفسہ تصویر کشی وغیرہ کے متعلق کوئی سوال نہ کیا اور یہ چیز عربوں میں جس طرح اسلام سے پہلے رائج تھی ویسے ہی بعد از آمد اسلام بھی مسلمانوں میں بدستور رائج رہی۔ خود اللہ تعالے نے بھی اس سلسلے میں کوئی سوال نہ کیا اور یہ چیز عربوں میں جس طرح اسلام سے پہلے رائج تھی ویسے ہی بعد از آمد اسلام بھی مسلمانوں میں بدستور رائج رہی۔ خود اللہ تعالے نے بھی اس سلسلے میں کوئی پابندی عائد نہ کی۔ اصحاب رسول میں سے بھی کسی نے اس کی خواہش ظاہر نہ کی کہ تصاویر کے سلسلے میں کوئی حکم خداوندی آئے۔ حالانکہ ازروئے روایت شراب کی حرمت اور پردے کی پابندی کے سلسلے میں حضرت عمر نے خواہش ظاہر کی تھی۔ تصویر کے سلسلے میں اس کی ممانعت کی طرف حضرت عمر نے بھی کوئی توجہ نہ کی۔ عام اہل عرب نے بھی جو کم از کم تیرہ مسئلوں میں سوال کر چکے تھے۔ تصویر کے مسئلے میں کسی حکم ووضاحت کے طالب نہ ہوئے۔ بہرکیف شریعت اسلامیہ نے تصویر کشی وتصویر سازی پر کوئی قید وبند نہیں لگائی ہے اور نہ لگا سکتی تھی۔ اس لئے کہ اسلام فطری دین ہے اور تصویر کشی کا تعلق فنون لطیفہ سے ہے جو انسانی

فطرت سے وابستہ ہیں۔

خلافت راشدہ میں اگر مسلمانوں نے اس فن کی طرف کوئی توجہ نہ کی تو اس لئے نہیں کہ اسلام نے مسلمانوں کو تصویر کشی وتصویر سازی سے روک دیا تھا بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ:۔

آ تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر وسناں اول، طاؤس ورباب آخر

اقبال

صحابہ کرام کے سامنے تعمیر قوم کا مسئلہ تھا نہ کہ تعمیر تمدن کا؟ چنانچہ جب اسلامی حکومت مستحکم ہو گئی تو عہد بنی امیہ سے اس کی ابتدا ہو گئی اور عہد بنی عباس میں مسلمانوں نے تمام "فنون لطیفہ" کو علمی وعملی دونوں حیثیتوں سے درجہ کمال پر پہنچا دیا۔ تاہم صحابہ تابعین اور تبع تابعین کے عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد میں بھی تصاویر وتماثیل کی حرمت کا کوئی تصور مطلق موجود نہ تھا۔ علامہ سید سلیمان ندوی تصاویر وتماثیل کو جائز سمجھتے تھے اور انہوں نے ایک مفصل مضمون لکھا تھا جس میں اکابر متقدمین کے عمل کو ظاہر کیا تھا۔ مثلاً:۔

۱۔ حضرت ابو ہریرہ کی انگشتری کے نگینے پر دو مکھیوں کی تصویریں تھیں۔ (عینی فی شرح ہدایہ)

۲۔ حضرت انس بن مالک کی انگوٹھی کے نگینے پر شیر کی تصویر بنی تھی۔ (اسد الغابہ)

۳۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے تصویر دار چادر اوڑھی ہے۔ (ابوداؤد)

۴۔ بیت النبی میں حضرت عائشہ کی گڑیوں کا ثبوت ملتا ہے۔ (بخاری)

۵۔ زید بن خالد تابعی تصاویر دار کپڑے استعمال کرتے تھے (بخاری، مسلم،

(ابوداؤد)

۶۔ حضرت ابوبکر کے پوتے اور فقیہ مدینہ قاسم بن محمد کے گھر میں عنقا اور قدس کی خیالی تصویریں تھیں۔ (فتح الباری بحوالہ مصنف ابن شیبہ)

۷۔ امام المحدثین' حضرت عروہ (حضرت عائشہ کے بھانجے) کے تکیوں پر پرندوں اور انسانوں کی تصاویر بنی ہوئی تھیں۔ (فتح الباری) اور انکے بٹن میں انسانی چہرے کی تصویریں بنی تھیں۔ (طبقات ابن سعد)

۸۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری کی انگوٹھی میں دو شیروں کی تصویر تھی۔ جن کے درمیان ایک لڑکا کھڑا تھا۔ (عینی فی شرح ہدایہ)

سید مقبول احمد صاحب نے رسالہ "البیان" کے نومبر نمبر ۱۹۵۱ء میں اس تمہید کے بعد کہنے۔

۱۔ "فنون لطیفہ یعنی موسیقی اور کردار نگاری یا تصویر کشی' قومی کلچر و تہذیب کے دو بڑے ستون ہیں جن کا فقدان یا انہدام قومی انحطاط کا پہلا قدم بھی ہے اور آخری قدم بھی۔ قومی ترقی کے دو کلئے ہیں جو کبھی غلط ثابت نہیں ہوتے۔ اول یہ کہ کسی قوم نے کبھی اپنے صنف نازک سے بڑھ کر ذہنی اور معاشی ترقی نہیں کی ہے۔ دوسرے جمالیات جو فنون لطیفہ کا مظہر ہے۔ کسی قوم میں نہ ہونے یا زائل ہونے پر اس قوم کو وحشت و بربریت کی طرف لوٹا دیتا ہے۔ معلوم نہیں یہ خیال قوموں میں کب پیدا ہوا کہ زہد و اتقاء جمالیات کے منافی ہے۔" (ص ۲۲)

۲۔ مقریزی نے لکھا ہے کہ عبدالملک نے جو مسجد دمشق میں تیار کرائی تھی اس کے دروازوں پر رسول اللہ کی شبیہہ مبارک تھی اور خود عبدالملک کے ایک سکے میں جواب بہت نایاب ہے۔ اس کی تصویر بالکل اسی طرح بنی ہوئی ہے جیسا قیاصرہ روم کے سکوں میں تھی۔ خلفاء بغداد میں سے المتوکل نے اپنی تصویر سکوں پر بنوائی ہے

جس میں وہ عجمی لباس میں مع اس ٹوپی کے ہے جو منصور نے ایجاد کی تھی۔ المعتمد نے اپنی تصویر جو سکے پر بنوائی ہے۔ اس میں وہ اسپ پر سوار دکھلایا گیا ہے۔ المستعمر کا سکہ جو عباس منزل لائبریری میں ہے اس میں اس کا سٹ برہنہ سر ہے۔ اسی لائبریری میں دوسرا سکہ ہے جس میں ایک طرف صلاح الدین ایوبی کا نام ہے اور دوسری طرف دو تصویریں ہیں جو شاہانہ لباس میں ہیں۔"(ص ۲۳)

۳۔ "سلاطین ہند میں سے تین سکوں میں بادشاہ وقت کی تصویر ہے۔ یعنی شمس الدین التمش، اکبر، جہانگیر اور یہ تینوں سکے بھی لائبریری میں ہیں۔"(ص ۲۴)

دمشق میں جو خلیفہ عبدالملک کے بیٹے خلیفہ ولید کی بنوائی ہوئی تاریخی مسجد ہے اور جس کے بارے میں سفیان الثوری نے اپنی کتاب "فضائل دمشق" میں لکھا ہے کہ اس مسجد میں ایک نماز دوسری جگہ کی تیس ہزار نمازوں کے برابر ہے اور جس کے بارے میں ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا تھا کہ اس دنیا کے تباہ ہو جانے کے چالیس سال بعد تک خدائے عزوجل کی عبادت اس مسجد میں ہوتی رہے گی۔ اس مسجد کے چار بڑے دروازے ہیں۔ جن میں سے ایک دروازہ "باب جیرون" کے نام سے نامزد ہے اس کے ذکر میں ابن جبیر اندلس (جو ابن بطوطہ کے بعد دوسرا سب سے بڑا مسلمان سیاح ہے اور جس نے اس مسجد کا تفصیلی حال لکھا ہے) رقمطراز ہے کہ:

"باب جیرون سے باہر جانے والے کے دائیں کو، اس کے سامنے کی ستونوں والی غلام گردش میں ایک صناعانہ آلہ ہے جس سے دن کے گھنٹوں کی تعداد معلوم ہو سکتی ہے۔ ہر گھنٹہ کے اختتام پر دو تانبے کے گیند، دو پیتل کے ڈھلے ہوئے بازوؤں کی چونچوں میں سے نکل کر دو پیالوں کے اندر خودبخود ٹن سے گرتے ہیں۔ ایک باز غلام گردش کے پہلے دروازے کے نیچے اور دوسرا آخری بارھویں کے نیچے ہے۔ پیالے سوراخوں سے چھدے ہیں اور جب گیند گرتا ہے تو وہ دیوار کے اندر ہی اندر، گیلری میں واپس آ جاتا ہے۔ تم دونوں بازوؤں کو گیند چونچ میں دبائے گردنیں لمبی کئے پیالوں پر

ٹھونگیں مارتے دیکھ سکتے ہو۔ وہ گیندوں کو اس حیرت ناک درستی سے پھینکتے ہیں کہ تخیل کو یوں لگتا ہے جیسے یہ جادو کا دھندا ہو۔ جب گیند پیالے میں گرتا ہے تو ایک شور سنائی دیتا ہے اور اس گھنٹے کا مقرر شدہ پیتل کی تختی والا دروازہ فوراً بند ہو جاتا ہے۔ اس طرح جوں جوں دن کے گھنٹے ختم ہوتے ہیں۔ غلام گردش کے بارہ دروازے' ایک ایک کر کے بند ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بارہ گھنٹے پورے ہو جاتے ہیں۔ بند دروازے گن کر آدمی فوراً بتا سکتا ہے کہ اب کیا وقت ہے۔"

سوچئے کہ اگر اسلام نے جانداروں کی تصویر یا ان کا مجسمہ بنانا حرام قرار دیا ہے تو اس مسجد کے کلاک یا گھڑی میں باز پرندہ کی تصویر یا مورتی کو ولید نے کیسے بنوایا تھا؟

تاریخ سے ثابت ہے کہ تصویر کا رواج ابتدا ہی سے مسلمانوں میں رہا ہے۔ خلافت راشدہ میں وہ تمام ایرانی ورومی سکے جن میں قیصر وکسریٰ یا جانوروں کی تصویریں بنی تھیں اور جو پہلے سے عرب میں چلتے تھے۔ بدستور رائج رہے تھے۔ امیر معاویہ نے اپنے عہد میں جو دینار (طلائی سکہ) ڈھلوایا تھا۔ اس میں ایک طرف انسان کی تصویر بنی ہوئی تھیں۔ جس کے گلے میں تلوار حمائل تھی۔ عبدالملک نے ۷۶ھ میں حسابی اصول کے مطابق درہم اور دینار کے اوزان مقرر کر کے نئے سکے ڈھلوائے تھے اور دینار پر انسان کی تصویر تھی اور مورخین نے لکھا ہے کہ اس عہد کے سب سے بڑے متشرع اور فقیہہ حضرت سعید بن مسیب اسی سکے سے خرید و فروخت کرتے تھے۔ حالانکہ یہی وہ بزرگ ہیں کہ جب ولید مسجد نبوی میں آیا تھا تو انہوں نے اٹھ کر تعظیم نہ کی تھی۔ اس لئے کہ امیر کی تعظیم نماز کی جگہ پر غلط ہے۔

ابوالعامر جس نے اپنا لقب امرباحکام اللہ قرار دیا تھا۔ اس فن کا ایسا قدردان تھا کہ اس نے اپنے قصر میں اپنے دربار کے تمام شعراء کی تصویریں دیوار پر بنوائی تھیں اور ہر شاعر سے ایک ایک شعر اس منظر کی تعریف میں لکھوا کر درج کرایا تھا۔ علامہ ریاست علی ندوی نے "تاریخ صقلیہ" جلد نمبر ۲ میں ص ۱۴۷ پر لکھا ہے۔

"صقلیہ کو فن تصویر سے قدیم لگاؤ رہا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ سر

زمین صقلیہ عہد قدیم میں مصوری کی ایک درسگاہ تھی تو بے جانہ ہو گا۔ اس کے آثار وتماثیل جا بجا اسلامی عہد تک قائم رہے ..... بیز نطینی دور حکومت میں بھی سونے کی مورتیاں یہاں ایسے موجود تھیں کہ جب یہاں کے ابتدائی حملوں میں مال غنیمت کے طور پر وہ مسلمانوں کے ہاتھ لگیں تو امیر معاویہ نے ان کی صنعت سے فائدہ اٹھا کر انہیں بیچنے کے لئے ہندوستان بھیجنا چاہا لیکن ..... وہ سندھ میں بچی گئیں (اوپر روایت بیان ہو چکی ہے جس میں مورتیوں کی بیع ممنوع ظاہر کی گئی ہے پھر مقتدر صحابی امیر معاویہ نے ان مورتیوں کو بیچنے کے لئے سندھ کیونکر بھیجا؟)۔ جس زمانے میں مسلمانوں کا تعلق صقلیہ سے پیدا ہوا۔ ان میں مصوری کا رواج ہو چکا تھا۔ اگرچہ مسلمانوں کی ثقہ جماعت اور پھر اس کے اثر سے عوام کا ایک بڑا طبقہ ہر زمانے میں مصوری کو اسلامی تعلیمات کے خلاف سمجھتا رہا لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ہر دور میں مسلمانوں میں ایک مختصر جماعت ایسی موجود رہی جو نفس تصویر کو اسلامی تعلیمات کے خلاف نہیں سمجھتی تھی ..... چنانچہ صقلیہ میں بھی ایسا طبقہ موجود تھا جو تصویروں کے استعمال میں محتاط نہ تھا اور محلوں میں تصویریں زیب وزینت کے طور پر استعمال کی جاتی تھیں۔ خصوصاً" بلرم کے محلوں کو مختلف قسم کی تصویروں سے آراستہ کیا گیا تھا صقلیہ کے اسلامی عہد کے فن مصوری کے بعض نمونے یورپ کے بعض کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔"

مسلمانوں نے فن تصویر سازی وتصویر کشی میں جو پائدار یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ان کا ذکر سر تھامس آرنلڈ' جارج سارٹن' والٹر جج اور ایڈ ولف گروہیمان وغیرہ نے بہت فراخدلی سے کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ نام ہے۔ احکام الہی کا اور چونکہ اللہ تعالی نے فنون لطیفہ کو ممنوع نہیں قرار دیا تھا اس لئے استحکام سلطنت کے بعد ہی سے مسلمانوں نے اس فن میں علمی و عملی حیثیت سے حصہ لینا شروع کر دیا تھا اور لوگ ہمیشہ مصوری میں دلچسپی لیتے چلے آئے معراج کمال کو پہنچا کر چھوڑا اور کبھی اہل عقل وبصیرت نے اس کی مخالفت نہ کی۔ مصر میں اسلامی فنون لطیفہ کا ایک

خاص عجائب خانہ قائم کیا گیا ہے جس میں ہر دور کے مسلمان ماہرین فنون لطیفہ کی قیمتی یادگاریں، جتنی بھی مل سکی ہے، رکھی گئی ہیں اور جوں جوں ملتی جاتی ہیں، رکھی جاتی ہیں۔ اس عجائب خانہ میں تیسری صدی ہجری کا ایک نہایت عمدہ منقش قرآن بھی ہے۔ لندن کے "وکٹوریہ اینڈ البرٹ میوزیم" میں مسلمانوں کے بہت سے فنی تصویری کارنامے موجود ہیں جن کی اکثر باضابطہ نمائش ہوتی رہتی ہے تاکہ اس فن کے ماہرین ان سے استفادہ کر سکیں۔

فی زمانہ حجاز میں نجدی شہنشاہ کی فرمانروائی ہے جن کو کٹر اہل حدیث کہا جاتا ہے۔ مگر خود سلطان عبدالعزیز مرحوم اور موجودہ ابن سعود اور ان کے تمام افراد خاندان کی تصاویر ہمیشہ مسلمانوں کے رسالوں اور اخباروں میں چھپتی رہتی ہیں۔ دسمبر ۵۵ میں شاہ سعود ہندوستان تشریف لائے تھے تو مسلمانوں کے تمام مذہبی ماہانہ اور ہفت روزہ رسائل میں ان کی متعدد تصاویر شائع ہوئی تھیں جن میں دہلی کے دو مشہور خانقاہی رسالے "پیام مشرق" اور "دین ودنیا" سب سے زیادہ پیش پیش رہے تھے۔ جنوری ۱۹۵۷ء کے تیسرے ہفتے میں بمقام قاہرہ (مصر) شام، اردن، سعودی عرب اور مصر کے سربراہوں کی کانفرنس منعقد ہوتی تھی جس میں اردن کو مالی امداد دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس امداد باہمی کی یادگار کے طور پر ۲۸ جنوری ۱۹۵۷ء کو حکومت اردن نے اعلان کیا تھا کہ وہ جلد ہی دس لاکھ ڈاک کے یادگاری ٹکٹ جاری کرے گی اور ٹکٹوں پر ان چاروں ملکوں کے سربراہوں یعنی شکری القواتلی صدر شام، کرنل جمال الناصر صدر مصر، شاہ ابن سعود شاہ حجاز اور شاہ حسین شاہ اردن کی تصاویر ہوں گی۔

افغانستان کے سید جمال الدین افغانی، فلسطین کے مفتی اعظم سید امین الحسینی، قازقستان کے مفتی اعظم امام عبدالحکیم، تاشقند کے مفتی اعظم ضیاء الدین، ہندوستان کے اکابر علامہ شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد، علامہ سید سلیمان ندوی، علامہ اسلم جیراج پوری، خواجہ حسن نظامی، محترم مستحسن فاروقی، علامہ حفظ الرحمٰن سیوہاروی وغیرہ اور دیگر مشائخ وعلماء کرام اور مسلم رہنماؤں کی تصویریں برابر ہی شائع ہوتی رہتی ہیں فروری ۱۹۵۱ء میں پاکستان کی موتمر اسلامی میں تمام مسلم ممالک کے بڑے بڑے علماء کی شرکت ہوئی تھی اور وہاں کے سرکاری رسالہ "ماہ نو" میں سب کی تصویریں شائع ہوتی

تھیں رسالہ "معارف" (اعظم گڑھ) کے جنوری نمبر ۱۹۳۴ء میں علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے سفر افغانستان کے سلسلے میں لکھا ہے کہ وہاں ایک جلسہ ہوا تھا جس میں گروپ کا فوٹو لیا گیا تھا۔ اس جلسے میں بڑے بڑے نامور علماء حاضر تھے۔ مثلاً "مشہور عالم حضرت سیف الدین مجاہد (سابق مدرس فتح پوری دہلی) حضرت علامہ منصور انصاری (رفیق کار علامہ عبید اللہ سندھی) اور حضرت علامہ بشیر احمد (جو حضرت سید احمد بریلوی کی جماعت میں صدر مجاہدین تھے)۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے اس تحریر میں بطور خاص اس امر کا ذکر کیا ہے کہ کسی نے اس تصویر کشی پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔" علامہ شاہ محمد جعفر صاحب ندوی پھلواری نے اپنے مضمون "اسلام اور مصوری"۔ (مطبوعہ ثقافت مارچ ۱۹۶۰ء میں لکھا ہے کہ سرگروہ علماء اہل حدیث نواب صدیق حسن خاں کی قد آدم تصویر اب بھی لکھنؤ میں موجود ہے۔ اہل حدیثوں کے پیر و مرشد اور حضرت میاں نذیر حسین دہلوی کے شاگرد مولانا شاہ عین الحق پھلواروی کا فوٹو خود ان کے پاس موجود ہے۔ مولانا شاہ سلیمان پھلواروی کی عکسی تصویر ان کے سوانح حیات "خاتم سلیمانی" میں موجود ہے۔ خانقاہ مجیبیہ پھلواری میں پیر مجیب اللہ صاحب کی قلمی تصویر موجود ہے جس کے ذریعہ وہاں کے اصحاب "سجادہ برزخ" کی مشق فرماتے ہیں۔ مشہور علماء و محدثین میں سے مولانا عبد الماجد بدایونی' مولانا شبیر احمد عثمانی' مولانا سید سلیمان ندوی' مولانا حسین احمد دیوبندی' مولانا احمد سعید وغیرہ ہم کے فوٹو متعدد جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالما جدبدایونی' مولانا احتشام الحق' مولانا داؤد غزنوی' مولانا مودودی دغیرہ وغیرہ کے فوٹو ہم نے بارہا دیکھے ہیں اور ان کے دیکھنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے۔ یہ باقاعدہ اتروائی گئی ہیں اور کسی دھوکے یا مجبوری کو اس میں دخل نہیں۔ شیعہ علماء مجتہدین اور مبلغین میں شاید ہی کوئی ہو جس کی تصویر اہل تشیع حضرات کے ہر رسالے میں شائع نہ ہوئی ہو۔

خواجہ حسن نظامی نے اپنے سفر فلسطین و مصر و حجاز وغیرہ کا سفر نامہ "روزنامہ سفر" کے نام سے شائع کرایا تھا۔ اس کے صفحہ نمبر۱۰۹ پر ہے کہ:۔

دوپہر کو شیخ ابراہیم حسن آفندی شیخ الحرم نے حرم میں بلایا۔ طاقت تو نہ

تھی۔ مجبوراً گیا۔ دیکھا کہ بیچارے دفور محبت میں فوٹو کا کیمرہ لئے بیٹھے ہیں اور خاص حرم کے اندر میری تصویر لینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ متعدد تصویریں لیں۔ ایک قبۃ الرسول کے پاس کھڑا کر کے جہاں سے ہمارے حضور صلعم معراج کو تشریف لے گئے تھے۔ تخت رب العلمین یعنی محل شریف کے قبہ کے پاس۔ ایک محراب سیدنا عمر فاروقؓ میں کھڑا کر کے ایک مسجد اقصیٰ کے ممبر کے پاس.........."

صفحہ نمبر ۱۴۶ و نمبر ۱۴۷ کے درمیان وہاں کے بڑے بڑے علماء و مشائخ کے ساتھ خواجہ صاحب کی جو تصویر کھینچی گئی تھی۔ وہ بھی موجود ہے۔ نہ صرف اتنا بلکہ انہوں نے صفحہ نمبر ۹۷ پر لکھا ہے کہ :۔

قدس کے قاضی صاحب سے......... تصویر کے یعنی فوٹو گراف کے مسئلہ میں ہم نے دیر تک حجت کی۔ ان کو اس مسئلہ میں پرانے خیال کا ہندی عالم پایا گیا۔"

۲۸ دسمبر ۱۹۵۵ء کے "پیام مشرق (دہلی) کے سرورق پر مفتی کفایت اللہ صاحب کی تصویر شائع ہوئی ہے۔ یہ تصویر اس موقع کی ہے جب ۳۰ جولائی ۱۹۳۹ء کو مفتی صاحب عید ملاپ کے موقع پر پنڈت نہرو سے گفتگو فرما رہے تھے۔ اسی طرح "پیام مشرق" مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۵۶ء سرورق پر علامہ حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مولانا حافظ سید حمید صاحب پیش امام جامع شاہجہانی دہلی کی تصاویر شائع ہوئی تھیں۔ جب دونوں شہنشاہ ایران اور ملکہ ایران کو مسجد دکھا رہے تھے۔ جدہ میں حاجیوں کے لئے ایک عارضی قیام گاہ "مدینۃ الحجاج" کی نام سے تعمیر ہوئی ہے جس میں حجاج چوبیس گھنٹے ٹھہرتے ہیں۔ وہاں شعبہ اطلاعات کی طرف سے تازہ خبروں کی فراہمی کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کے تصویر دار رسالے بھی پڑھنے کو دیئے جاتے ہیں۔ "دین و دنیا" دہلی کا مشہور مذہبی رسالہ ہے۔ اس رسالے کا ہر شمارہ اپنی آغوش میں اپنے ابتدائی چار صفحات انسانوں کی تصاویر سے مزین رکھتا ہے۔ جن میں علماء کرام کی بھی تصاویر

ہوتی ہیں اور مشائخ عظام کی بھی۔ اور اس کے سرورق پر مستقلاً ابتداء عہد اسلام (خلافت راشدہ، خلافت بنو امیہ اور خلافت بنو عباس) کے دور کے کسی نہ کسی مسلمان جرنیل کی (اسلحہ بکف تصویر رہتی ہے)

بہاول پور کے علاقہ میں اوچ شریف وہ مقام ہے۔ جو ایک زمانے میں مذہبی حیثیت سے دینی مرکز سمجھا جاتا تھا۔ یہاں ایک عمدہ لائبریری ہے جس کو "گیلانی لائبریری" کہا جاتا ہے۔ اس لائبریری سے متعلق ڈاکٹر غلام سرور نے ایک کتاب "مخطوطات" کے نام سے شائع کرائی ہے۔ جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ اوچ شریف کی لائبریری میں ایک ایسا موقع ہے۔ جس میں حضرات خواجہ معین الدین چشتیؒ، شیخ علی ہجویریؒ، شاہ دولا اور میاں میر وغیرہ کی نہایت عمدہ اور انتہائی نفیس تصاویر ہیں۔ اوچ شریف میں ان بزرگوں کی تصاویر موجود ہونا غالباً پرستش کے لئے تو ہو گا نہیں اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اوچ شریف کے لوگوں کو تصاویر کے حرام و ناجائز ہونے کا کوئی علم نہ ہو گا۔ اس کو بھی چھوڑیئے۔

"آستانہ" دہلی کا وہ مشہور رسالہ ہے جس سے شاید ہی وہ کوئی مسلمان بے خبر ہو۔ اس رسالے کا ایک شمارہ بھی ایسا نہیں دکھایا جا سکتا جس میں انسانوں کی تصاویر موجود نہ ہوں۔ اس رسالے نے دسمبر ۱۹۵۳ء میں "رسول نمبر" شائع کیا۔ جس میں تقریباً ڈیڑھ سو آدمیوں کی تصاویر موجود ہیں۔ ان میں ادارہ آستانہ کا پورا سٹاف مدیر آستانہ کی چار پشتوں کی تصاویر چھ قدیم اکابر شعراء اور چھ جدید مشہور آفاق شعراء کا فوٹو شائع ہوا ہے۔ نہ صرف اتنا بلکہ اس "رسول نمبر" میں حسب ذیل بزرگان دین کی تصاویر بھی موجود ہیں:

۱۔ حضرت محبوب سبحانیؒ

۲۔ حضرت خواجہ معین الدینؒ

۳۔ حضرت خواجہ قطب الدینؒ

۴۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ

۵۔ حضرت بو علی شاہؒ

۶۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ

یہ چھ تصاویر ایک ہی بلاک میں ہیں اور نیچے ادارہ آستانہ کا یہ نوٹ بھی درج ہے :

"یہ عکس مرقع مغل اعظم حضرت شاہجہان کے ذاتی کتب خانے سے حاصل ہوا ہے اور ہم اسے عقیدت کے ساتھ شائع کر رہے ہیں"۔

آپ نے اکابرین اولیاء کرام کی تصاویر کی ایک خانقاہی لائبریری (اوچ شریف) میں موجودگی اور ایک مشہور مذہبی رسالہ ۔آستانہ۔ دہلی) میں اشاعت کا ذکر سن لیا۔ اب یہ بھی سن لیجئے کہ دہلی کی ایک مقدس خانقاہ کے سجادہ نشین حضرت خواجہ حسن نظامی نے اپنے سفرنامہ مصرو حجاز "روزنامہ سفر" کے صفحہ نمبر ۴ و نمبر ۳ کے درمیان ایک فوٹو شائع کرایا ہے۔ تصویر میں ایک شخص تاج پہنے اور تلوار ہاتھ میں لئے کرسی پر بیٹھا ہے۔ اور دوسرا شخص اس کے حضور زمین پر اس طرح بیٹھا ہوا ہے کہ گردن جھکی ہوتی ہے جس میں رسی پڑی ہے اور ایک ہاتھ ملتجیانہ کرسی نشیں کی طرف پھیلایا ہوا ہے۔ تصویر کے نیچے یہ عبارت درج ہے :۔

"فرعون اور حضرت یوسفؑ"

میں نے اس تصویر کے خلاف کبھی کوئی احتجاج نہ سنا کہ پیغمبر کی تصویر ناجائز ہے یا کیوں شائع کی گئی؟ یہ کہ سجادہ نشیں نے اسے کیوں شائع کیا۔ اور اگر خواجہ صاحب واقعی بزرگ اور اسلام کی تعلیمات حرمت و حلت سے واقف تھے تو تصویر کے جائز ہونے اور پیغمبروں کی تصویر شائع کرنے کے جواز کے لئے مزید ثبوت کی ضرورت

نہیں۔

یہ تو تصویر کا ایک رخ تھا۔ مگر بات نکل گئی ہے تو اسکا دوسرا رخ میں پیش کر دینا چاہتا ہوں تاکہ ایک بڑی بھاری غلط فہمی کا ازالہ ہو جائے۔ دراصل یہ تصویر اس مجسم کی ہے جو نمبودو کے بیٹے ششنق اول (جس کو تورات میں شیشاق کہا گیا ہے) نے حملہ فلسطین و تباہی بیت المقدس کے بعد بطور یادگار فتح کرنک کے ہیکل کی چار دیواری پر نصب کرایا تھا اور ابھی تک مصر میں موجود ہے۔ کرسی نشین ششنق ہے اور زمین نشین حضرت سلیمان نہیں بلکہ ان کا نااہل بیٹا رجعام ہے۔ جب حضرت سلمان کا انتقال ہو گیا تو رجبعام تخت نشین ہوا مگر یہ بڑا نااہل تھا۔ سلطنت کی کمزوری کی خبر پا کر اس کی حکومت کے پانچویں سال ششنق نے فلسطین پر حملہ کیا۔ رجعام مقابلہ کی تاب نہ لا سکا۔ ششنق نے ملک کو تباہ و برباد کر دیا اور قصر سلیمانی کو لوٹ کر سارا قیمتی سامان مصر لے آیا اور اس فتح کی یادگار میں یہ مجسمہ نصب کرایا۔ لہٰذا وہ زمین نشین شخص حضرت سلیمان نہیں جیسا کہ خواجہ صاحب نے سمجھا اور تصویر کے نیچے لکھ دیا ہے بلکہ وہ ان کا بیٹا رجعام ہے۔ بہر کیف دسمبر ۱۹۵۶ء کے رسالہ "آستانہ" (دہلی) کے دوسرے صفحے پر اگر آپ چاہیں تو بقول خود "آستانہ":

"عرس سراپا قدس میں...... علماء صوفیا، مشائخ اور ارادات حضرت شیخ کے روحانی اجتماع کا ایک دلکش نظارہ" والی تصویر دیکھ کر مذہبی ادارہ "آستانہ" کے نزدیک تصویر کے جائز و مباح ہونے کا یقین کر سکتے ہو۔ نہ صرف اتنا بلکہ غالباً" ۱۹۵۷ء سے آستانہ نے ص ۳ پر کسی دینی بزرگ کی اور ص ۴ پر کسی دنیوی بزرگ کی تصاویر شائع کرنے کا بھی مستقل ارادہ کر لیا ہے۔ چنانچہ جولائی ۱۹۵۷ء کے پرچے کے ص ۳-۴ پر "حجتہ الاسلام" امام غزالیؒ اور جامیؒ کی رنگین تصاویر شائع ہوئی ہیں یا مثلاً" جون ۱۹۵۷ء کے پرچے کے صف ۳-۴ پر آپ حکیم افلاطون اور حافظ شیرازیؒ کی رنگین تصویریں دیکھ سکتے ہیں یا مثلاً" مئی ۱۹۵۷ء کے "آستانہ" کے ص ۳-۴ پر حضرت لقمان اور امیر خسروؒ کی رنگین و نظر نواز تصویریں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ یہ

وہی حضرت لقمان ہیں جن کا ذکر قرآن کے اکیسویں پارے میں اس اہمیت سے کیا گیا ہے کہ مستقل ایک سورۃ لقمان کے نام سے منسوب و معنون ہے اور جن کے بارے میں "تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ:-

"حضرت قتادہ سے ایک عجیب اثر وارد ہے کہ حضرت لقمان کو "حکمت" اور نبوت کے قبول کرنے میں اختیار دیا گیا تھا۔ تو آپ نے "حکمت" قبول فرمائی۔ راتوں رات ان پر حکمت برسا دی گئی اور رگ وپے میں "حکمت" بھر دی گئی۔ صبح کو ان کی باتیں اور ان کی عادتیں حکیمانہ ہو گئیں۔ اب سوال ہوا کہ آپ نے "نبوت" کے مقابلے میں "حکمت" کیسے اختیار کی؟ تو جواب دیا گیا کہ اگر خدا مجھے نبی بنا دیتا تو اور بات تھی۔ ممکن ہے کہ میں منصب نبوت کو نباہ جاتا لیکن جب اختیار دیا گیا تو مجھے ڈر لگا کہ کہیں ایسا نہ ہو میں "نبوت" کا بوجھ نہ سہار سکوں اس لئے میں نے "حکمت" ہی کو پسند کیا۔"

"حکمت" علم ودانش کو کہتے ہیں یا اصطلاح میں طبابت کو اس لئے کہ فلسفہ و سائنس ہی کا وہ ایک شعبہ ہے۔ اور یہ کسبی وفنی چیز ہے۔ لیکن "نبوت" عطیہ خداوندی ہے اور یہ ایسا برگزیدہ عہدہ تھا جو اللہ تعالیٰ صرف اپنے بعض برگزیدہ ترین بندوں ہی کو اپنی رحمت سے ازخود عطا فرمایا کرتا تھا اور یہ وہ شرف تھا جسے پا کر انسانیت عرش مقام ہو جاتی تھیں۔ یہ منصب کبھی کسی کو نہ تو اپنی طلب پر ملا نہ کسی سے دریافت کر کے اس کو عطا فرمایا گیا تھا۔ چاہے ابراہیم خلیل اللہ ہوں یا موسیٰ کلیم اللہ، عیسیٰ روح اللہ ہوں یا محمد حبیب اللہ۔ مگر حضرت لقمان کے معاملے میں یہ برگزیدہ شرف "نبوت" اتنا سستا ہو گیا کہ حکمت کے برابر کر دیا گیا اور اس کو پوچھ پوچھ کر دیا جانے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت لقمان نے نبوت کو تو ٹھکرا دیا اور اس کے مقابلے میں حکمت کو قبول کر لیا۔ خرافات کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ حضرت قتادہ اور ابن کثیر کو یہ سب مخفی اطلاعیں تو مل گئیں۔ مگر کوئی اتنا نہ بتا سکا کہ لقمان تھے کہاں کے؟

یہ سلسلہ جو قائم ہوا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ادارہ "آستانہ" اولیاء کرام

اور اکابر عظام کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی بھی تصاویر شائع کرنے کا پروگرام سامنے رکھتا ہے جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔

آپ یہ نہ سمجھیں کہ اس موقر خانقاہی دینی رسالہ اور مستند صحیفہ تصوف میں اس کے گدی نشین مرید نے، متذکرہ تصاویر "رسول نمبر" یا عام نمبروں میں شائع کر دی ہیں۔ غلطی تو ایک بار ہوتی ہے۔ بار بار نہیں۔ دراصل چونکہ "تصویر" اسلام میں حرام نہیں اس لئے یہ دینی رسالہ مسلسل تصویریں شائع کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ نومبر [illegible]ء میں اس مستند رسالہ نے جو اپنا "غوث الاعظم" نمبر نکالا ہے۔ اس میں بھی متذکرہ اولیاء اللہ اور اکابر متقدمین کی رنگین و حسین تصاویر دوبارہ شائع کی گئی ہیں۔ یہ نمبر شروع ہی ہوتا ہے تصاویر سے جس کی تفصیل ملاحظہ فرمایئے۔

۱۔ سرورق یعنی صفحہ نمبر ۱ پر، تصویر مقبرہ حضرت غوث پاک

۲۔ صفحہ نمبر ۲ پر، تصویر سابق سجادہ نشین خانقاہ آستانہ

۳۔ صفحہ نمبر ۳ پر، تصویر روضہ پاک' آنحضرت صلعم

۴۔ صفحہ نمبر ۴ پر، تصویر حضرت جلال الدین رومی

۵۔ صفحہ نمبر ۵ پر، تصویر حضرت امیر خسرو

۶۔ صفحہ نمبر ۶ پر، تصویر حضرت لقمان

۷۔ صفحہ نمبر ۷ پر، تصویر حضرت جامی

۸۔ صفحہ نمبر ۸ پر، تصویر حضرت حافظ

۹۔ صفحہ نمبر ۹ پر، تصویر حضرت سعدی

۱۰۔ صفحہ نمبر ۱۰ پر، تصویر حجتہ الاسلام امام غزالی

۱۱۔ صفحہ نمبر ۱۱ پر' گروپ فوٹو۔ جس میں حضرت غوث الاعظم؁ حضرت خواجہ اجمیری' حضرت خواجہ بختیار کاکی' حضرت بابافرید گنج شکر' حضرت نظام الدین اولیاء اور حضرت بوعلی شاہ کی تصاویر ہیں۔

غور فرمایئے' پیغمبر' اولیاء اللہ' صوفیوں کے سرگروہ' اماموں سب کی تصاویر ہیں۔ کیا ہمارے علماء اب بھی یہی فرمائے جائیں گے کہ اسلام میں تصویر حرام ہے؟

۳ جولائی ۱۹۵۷ء کو صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد اسلامی دنیا کی مشہور ومعروف دینی ومذہبی درس گاہ دارالعلوم (دیو بند) تشریف لے گئے تھے۔ اسی تقریب میں مختلف مواقع کی تصویریں بھی لی گئیں۔ ہندوستان کے مشہور اخبار "اسٹیٹس مین" نے اپنی اشاعت مورخہ ۱۵ جولائی ۱۹۵۷ء (دہلی ایڈیشن) میں جو تصویر شائع کی ہے۔ اس کے نیچے یہ عبارت درج ہے:

"وہ دارالعلوم جس میں دنیا کے تمام حصوں میں مسلمان طلباء دینیات اسلامی اور عربی تمدن وثقافت اور عربی زبان کی تعلیم وتحصیل کے لئے آتے ہیں۔"

اس شائع کردہ تصویر میں پانچ چھ اکابر علماء اور عہدہ داران دارالعلوم کے علاوہ خود شیخ الحدیث حضرت علامہ حسین احمد صاحب مدنی بھی صدر موصوف کے دائیں جانب تشریف فرما نظر آتے ہیں۔ کیا اہل دیو بند کی اس تصویر کی اشاعت کے بعد بھی علماء یہ کہ سکتے ہیں کہ اسلام میں تصویر ناجائز ہے؟

علامہ حضرت ابوالکلام آزاد کا پایہ علم وفضل مسلم ہے۔ نہ صرف یہ کہ خود ان کی لاتعداد تصاویر شائع ہو چکی ہیں اور آئے دن شائع ہو رہی ہیں بلکہ انہوں نے اپنا مشہور ترین رسالہ "الہلال" مصور شائع کیا تھا جس میں ہمیشہ اکابر علماء اور مشائخ کی تصویریں بالالتزام شائع ہوتی تھیں۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ قابل ذکر ہے۔ امام الہند علامہ آزاد کی مشہور ترین کتاب "تذکرہ" کے مرتب نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے:

"اس کتاب کا ایک جزو یہ بھی تھا کہ وہ مصنف کی تصویر سے مزین

ہوتی۔ موجودہ زمانے میں کسی شخص کی بھی سوانح عمری کا بغیر فوٹو کے شائع کرنا ایک ایسی بے قاعدگی ہے جس کو کوئی خوش مذاق آدمی گوارا نہیں کر سکتا ...... اس لئے میں نے کوشش کی کہ مولانا کا سب سے آخری فوٹو حاصل کر کے درج "تذکرہ" کروں۔ مجھے معلوم تھا کہ اپنی تصویر کی اشاعت کی انہوں نے ہمیشہ مخالفت کی ہے ... میں ان موقعوں پر یہی سمجھتا رہا کہ یہ مخالفت یا تو انکسار طبع کی بنا پر ہے یا ان کی طبیعت کے اس عام خاصے کا نتیجہ ہے کہ جو بات عام طور پر لوگ کر رہے ہوں اس سے خود پرہیز کریں لیکن اس کا تو کبھی خیال بھی نہیں ہوا تھا کہ مولانا تصویر کھچوانے اور رکھنے کو شرعاً" ناجائز سمجھتے ہوں گے۔ خود "الہلال" انہوں نے باتصویر نکالا اور ایک سے زائد مرتبہ اپنی تصویر بھی کھچوائی۔ لیکن جب میں نے تصویر کی نسبت کہا تو انہوں نے لکھا۔

"تصویر کا کھچوانا' رکھنا' شائع کرنا سب ناجائز ہے۔ یہ میری سخت غلطی تھی کہ تصویر کھچوائی تھی۔ اور "الہلال" کو باتصویر نکالا تھا۔ میں اب اس غلطی سے تائب ہو چکا ہوں۔ میری پچھلی لغزشوں کو چھپانا چاہیے۔ نہ کہ از سر نو ان کی تشہیر کرنی چاہئے؟"

"لیکن اس جواب سے میری تشفی نہ ہوئی۔ میں علم شریعت کا ماہر نہیں اور علی الخصوص مولانا کے فتوے کے مقابلے میں تو مجھے دم مارنے کا وہم بھی نہیں گزر سکتا۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں کسی طرح نہیں آئی کہ آج تک مولانا کو شریعت کے اس حکم کی خبر نہ تھی۔ اور جس کام کو علانیہ کرتے رہے ہیں وہ اب یکایک ناجائز نکل آیا ہے۔ خود "الہلال" میں مولانا نے شیخ الاسلام قسطنطنیہ' شیخ محمد عبدہ مصری' مولانا شبلی نعمانی اور کتنے علماء ومشائخ کی تصویریں شائع کی ہیں۔ تعجب ہے کہ شریعت کا حکم ایسے مشاہیر علماء کو معلوم نہ تھا۔ بہرحال مولانا کے اس حکم کی میں تعمیل نہ کر سکا اور کتاب کے ساتھ ان کا سب سے آخری فوٹو شائع کر رہا ہوں۔

علامہ عبد الرزاق ملیح آبادی نے اپنی موقر کتاب ذکر آزاد کے صفحہ نمبر ۲۲۳ میں

تذکرہ اور اس میں فضل الدین احمد کی اس تحریر کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ میں نے علامہ آزاد سے اس کے بارے میں ایک مرتبہ پوچھا تھا کہ کیا واقعی آپ کے نزدیک تصویر اتروانا درست نہیں؟ موصوف نے جواب دیا تھا:۔

"ہاں۔ اس وقت ذہن اس بارے میں صاف نہ تھا۔ مگر بعد میں ایک مستفتی کے جواب میں فوٹو اور سٹیچو کے معاملے پر میں نے کچھ لکھا تھا۔ اس کا مسودہ غالباً" میرے اٹیچی کیس میں پڑا ہے' آپ کو دے دوں گا۔"

چنانچہ دوسرے دن وہ تحریر موصوف نے' علامہ ملیح آبادی کے حوالہ کردی تھی جو دراصل فتویٰ ہے۔ علامہ ملیح آبادی نے وہ تحریر کا ملا" اپنی اس کتاب میں نقل کردی ہے جو صفحہ نمبر ۲۴۲ سے صفحہ ۲۴۹ تک محیط ہے۔ جن صاحب کو یہ فتویٰ دیکھنا ہو وہ کتاب مذکور پڑھ لیں۔ میں کہاں تک نقل کر سکتا ہوں۔ البتہ اس کا ایک ٹکڑا ضرور پیش کروں گا۔ علامہ آزاد نے لکھا ہے:۔

نہی کی جو تعلیل بعض فقہا نے کی ہے اور یہ سبب حرمت بیان کی ہے کہ تصویر بنانے میں خدائے تعالیٰ کی صفت خالقیت کی نقل اتاری جاتی ہے اور بوجہ اشتراک فعل ایسا کرنا ناجائز ہے' تو یہ کسی طرح درست نہیں۔ اگر مصوری کی ممانعت میں قصہ یہی ہے تو کون سی وجہ ہے کہ یہ فقہا غیر حیوانات کی تصویروں کو ناجائز نہیں قرار دیتے؟ کیا صرف انسان وحیوان ہی اللہ کی خالقیت کا ظہور ہیں؟ درخت اور پہاڑ اس کے پیدا کئے ہوئے نہیں ہیں؟ اگر یہ تمام کائنات اس کی مخلوق ہے تو جس طرح ایک حیوان کی شکل بنانے سے بھی اور ایک پہاڑ کے نقشے سے بھی یہ کہنا کہ حیوانات میں روح ہے اور ان میں نہیں' بالکل فضول ہے۔ کیونکہ اول تو اشتراک تخلیق " وجود وجسم" میں ہے نہ کہ "روح" میں مصور "جسم" کی صورت کھینچتا ہے۔ نہ کہ "روح" کی اور "جسم" جیسا انسان کا ہے ویسا ہی پتھر کا۔ اور ثانیاً" یہ کون کہتا ہے کہ نباتات میں روح نہیں ہے؟ قرآن حکیم نے جابجا ارواح نباتیہ کی خبردی ہے اور علم بھی اس کی تصدیق کر چکا ہے۔"
(صفحہ نمبر 242' 243)

چونکہ' یہ بحث تفصیلاً" میں کر چکا ہوں اور اتفاق سے علامہ موصوف کے اس فتوٰی میں بھی یہ عبارت مل گئی۔ لہٰذا میں نے اسے یہاں نقل کر دیا ہے۔ باقی عقلی و نقلی بحثوں کے لئے متذکرہ کتاب مطالعہ فرما لیجئے۔

اس اقتباس میں علامہ آزاد کا جملہ ہے کہ:۔ میں اب اس غلطی سے تائب ہو چکا ہوں۔"

مگر اب تو علامہ آزاد کی تصویر ہر روز اور ہر ماہ ہر اخبار اور رسالے میں بالعموم شائع ہو رہی ہے۔ نہ صرف اتنا بلکہ حکومت ہند کی طرف سے تصاویر اور مجسموں کے آرٹ کو ترقی دینے کے لئے جو اکیڈمی قائم ہوئی ہے اس کا افتتاح ۵ اگست ۱۹۵۴ء کو خود علامہ آزاد نے کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ تصویر کشی و تصویر سازی شریعت اسلامیہ میں حرام ہے۔ نہ وہ حضرات اسلامی تعلیمات سے بے خبر تھے جن کی تصاویر شائع ہوئیں۔ اور نہ خود مولانا آزاد واقعی تصویر کو ناجائز سمجھتے تھے۔ یہ محض ایک بات تھی جو علامہ آزاد نے ٹالنے کے لئے لکھ دی تھی۔ اس سلسلے میں ایک اور لطیفہ بھی سن ہی لیجئے۔ رسالہ "آستانہ" (دہلی) ہر ماہ فتاوٰی بھی شائع ہوتے ہیں جو مفتی مولانا زاہد القادری صاحب لکھا کرتے ہیں۔ ایک خریدار "آستانہ" نے ان سے سوال کیا کہ عطاء اللہ پالوی کا کہنا ہے کہ قرآن میں تصاویر کی ممانعت نہیں آئی ہے اور اسلام نے تصویر کو حرام نہیں قرار دیا ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو اس فن میں ضرور حصہ لینا چاہئے۔ اب آپ فرمائیے کہ سینما اور تصاویر وغیرہ سے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ مفتی صاحب موصوف نے رسالہ "آستانہ" کے اگست نمبر ۱۹۵۴ء میں اس استفسار کو درج کر کے جواب دیا کہ:۔

"سینما دیکھنا حرام اور ناجائز ہے۔ یہ کہنا کہ سینما دیکھنے کی ممانعت اور رقص و تصویر کشی کی ممانعت قرآن سے ثابت نہیں' ایک جاہلانہ طرز استدلال ہے۔ اس کا مفصل جواب اس فتوے میں نہیں دیا جا سکتا۔ آپ کے اطمینان کے لئے صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ اگر بالفرض قرآن سے ثابت بھی نہ ہو تو حدیث رسول اللہ صلعم سے ثابت ہونا کیا احکام شرعیہ

کے لئے کافی نہیں"؟

مفتی صاحب کے سے لوگ' جو معلم انسانیت نبی کریم صلعم کو "امی" یعنی " جاہل و ان پڑھ" (آنحضرت کو امی اس لیے نہیں قرآن میں کہا گیا ہے کہ وہ ان پڑھ تھے بلکہ اس کے معنی ہیں "مکہ والا") کہتے ہوئے نہیں شرماتے' اگر مجھ کو جاہل قرار دیتے ہیں تو میں اس خطاب میں بڑا فخر و جلال محسوس کرتا ہوں۔ لہٰذا اس بارے میں تو کچھ کہنا نہیں ہے لیکن یہاں اس عجیب حقیقت کو ذہن میں لایئے کہ اسی سال اس فتویٰ کے محض تین ہی ماہ بعد ان ہی مفتی صاحب کے اور اسی رسالہ کے رسول نمبر جی ہاں "رسول نمبر" میں ڈیڑھ سو افراد کے ساتھ ساتھ حضرات محبوب سبحانی اور خواجہ اجمیری وغیرہ متعدد بزرگان دین کی بھی وہ تصاویر شائع ہوئی تھیں جن کا ذکر ابھی آپ گزشتہ اوراق میں پڑھ چکے ہیں۔ گویا جب میں کہوں کہ تصویر کشی و تصویر بنی حرام نہیں تو میں جاہل اور وہ تصاویر حرام ہو جاتی ہیں اور اگر مفتیان شرع متین انھیں شائع کریں تو وہ جائز ہوتی ہیں۔ بہرکیف! یہاں پر اسی فتویٰ میں جو اصل چیز ہے اس پر غور فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے بارے میں کہا تھا کہ:۔

"کیا ان لوگوں کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تم پر وہ کتاب نازل کی ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے ان پر۔" (سورہ عنکبوت ۵)

سنتے ہیں کہ حضرت عمر نے بھی فرمایا تھا کہ "ہمارے پاس خدا کی کتاب ہے جو ہمارے لئے کافی ہے۔" مگر محترم مفتی صاحب مسلمانوں سے فرما رہے ہیں کہ:۔

"کیا تمہارے لئے روایت کافی نہیں؟"

بہرکیف! مفتی زاہد القادری صاحب نے یہ فتویٰ تو دے دیا کہ تصویر ناجائز اور حرام ہے اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ قرآن میں اس کی ممانعت نہیں ہے وہ شخص جاہل ہے لیکن اگر آپ رسالہ "پیام مشرق" (دہلی) کا شمارہ مورخہ ۷ دسمبر ۱۹۵۷ء اٹھائیں گے تو صفحہ ۲ پر آپ کو ایک گروپ فوٹو دکھائی دے گا جس میں بائیں طرف سے سب سے پہلی تصویر انھیں محترم مفتی زاہد القادری صاحب کی نظر آئے گی اور ان کے بعد:۔

۱۔ صاحبزادہ محمد مستحسن فاروقی سجادہ نشین خانقاہ کلیمی' دہلی ۲۔ سید عبدالوحید صاحب ۳۔ سید محمد حسین چشتی ۴۔ سید غیور میاں ۵۔ شاہ علی محمد خاں' پیرزادہ پاک پٹن شریف پیر زادگان درگاہ معلی اجمیر شریف

وغیرہ کی تصاویر ملیں گی۔ یعنی جس حد تک نقل کا تعلق ہے۔ خود ان محترم مفتی زاہد القادری صاحب کے لئے نہ تصویر کھنچوانا حرام ہے اور نہ شائع کرانا' البتہ دوسروں کے لئے قطعی حرام اور ناجائز ہے۔ قرآن نے کچھ لوگوں کے بارے میں ٹھیک ہی کہا ہے کہ:۔

۱ "یہ لوگ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں۔"

۲ "اور یہ لوگ زبان سے وہ باتیں کہتے ہیں جن پر ان کا عمل نہیں ہوتا۔"

ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت خالد نے فرمایا تھا کہ :۔

"بہت سے نمازی بھی ایسے ہوتے ہیں کہ منہ سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں۔" (روایت ۱۷۹۔ تجرید البخاری ص ۳۲۶)

علامہ نیاز فتح پوری نے بھی ایک جگہ لکھا ہے:۔

"آج کل کا کوئی عام مسلمان نہیں بلکہ ان اکابر اسلام کو دیکھئے جو اپنے بڑے بڑے عماموں اور لانبی لانبی عباؤں کے ساتھ تقدس اسلامی کا قد آدم اشتہار بنے پھرتے ہیں۔ ان علماء کرام اور صوفیاء عظام کو دیکھئے جو اپنی طویل الذیل داڑھیوں اور ڈھیلے ڈھالے خرقوں کے ساتھ ہیبت اسلامی کا دیو پیکر مجسمہ نظر آتے ہیں ... ان خدا سے ڈرنے والوں کی اندرونی زندگی کا مطالعہ کرو تو معلوم ہو کہ ... دنیا کی کوئی معصیت ایسی نہیں جو دوسروں کے لئے حرام اور ان کے لئے حلال نہ ہو۔ اور اخلاق فرائض میں سے کوئی امر ایسا نہیں جو دوسروں کے لئے واجب اور ان کے لئے غیر ضروری نہ

ہو۔ ان کا خدا قہار وجبار ہے لیکن دوسروں کے لئے، ان کے لئے نہیں۔
ان کا خدا رحیم وکریم ہے مگر صرف ان کے لئے دوسروں کے لئے نہیں۔"

بہرکیف! کسی کام کے محض ہونے یا ایک عرصے تک ہوتے رہنے سے یا چند خواہ سب کے سب اکابر ملک وزمانہ کے کہنے یا کرتے رہنے سے اس کام کا حق ہونا مسلم نہیں۔ بت پرستی اگر ساری دنیا میں اور دس لاکھ برس تک ہوتی رہے تو وہ حق نہیں قرار پائے گی۔ میں یہ تمام مثالیں یہ دکھانے کے لئے ہرگز پیش کر رہا ہوں۔ کہ چونکہ یہی کام عرصے سے ہو رہا ہے یا تمام بڑے بڑے لوگ ایسا کر رہے ہیں اس لیے وہ صحیح ہے۔ میرے نزدیک صحت اور حق کا معیار صرف قرآن ہے۔ اس لئے اگر کسی چیز کو قرآن صحیح قرار دیتا ہے تو وہ صحیح ہے چاہے اس پر ایک بھی فرد کا عمل نہ ہو اسی طرح جس چیز کو قرآن غلط کہتا ہے وہ غلط ہے چاہے ساری دنیا اس کے خلاف کیوں نہ عمل کر رہی ہو۔

ڈراما

قدیم زمانے میں "ناٹک" کا رواج تھا۔ یہ ہندوستان کی قدیم زبان پراکرت کے لفظ "ناٹ" بمعنی "رقص" اور لفظ "بازیگر" کی بگڑی یا بنائی ہوئی شکل ہے اسی ناٹک کو "ڈراما" بھی کہا جاتا ہے جو یونانی لفظ "ڈراؤ" سے مشتق ہے جس کے معنی کام کرنے یا ایکٹنگ (Acting) کے ہیں۔ ناٹک یا ڈراما انسانی زندگی کو دیکھنے اور سمجھنے میں ایک صحیح تصویر کا کام دیتا ہے۔ یہ حیات بشری کو عملاً سمجھانے یا سدھارنے کی ایک عمدہ ترکیب ہے۔ کیونکہ اس میں اقوال وافعال کے ذریعہ انسان کی اچھی ہو یا بری۔ معاشرت، تمدن، تہذیب یا طریق کار کی متحرک تصویر دکھائی اور اتاری جاتی ہے۔ یہ ایک روئداد حیات ہے جو عملاً کرکے دکھائی جاتی ہے۔ ایک ایسا مطالعہ ہے جس سے ایک ایسا نتیجہ برآمد ہوتا ہے جو غلط درست افعال انسانی سے مرتب ہوتا ہے۔ یہ متحرک تشریح ہے :۔

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگراں

کسی ڈراما نگار نے خوب کہا ہے کہ:۔

بشر کرتے ہیں جو کچھ نیک وبد کام دکھا دیتے ہیں ہم ہر اک کا انجام

بلاشبہ یہ ایسا فن ہے جو بالتفریح، تبلیغ، بلا جبر تربیت، بلا زحمت تعلیم اور بلا نصیحت وحجت موعظت کا حکم رکھتا ہے۔ اس کا مقابلہ دنیا کا کوئی طریقہ تعلیم کوئی طرز تربیت اور کوئی صف ادب نہیں کر سکتا۔ "ناٹک ساگر" کے مصنف نے غلط نہیں کہا ہے کہ:۔

"جب تہذیب عالم کے صم وبکم، مظاہر، مثل تاریخ وتذکرہ اور سیر وروایات انسان کو پختہ کار بنانے کی اہلیت رکھتے ہیں تو ان کا چلتا پھرتا اور منہ بولتا مرقع ڈراما یا ناٹک، جو اثر، انسان کے دل ودماغ پر کرے گا وہ کتنا مہتم بالشان ہو گا؟ اگر یہ سچ ہے کہ "شنیدہ کہ بود مانند دیدہ" تو اسے بھی

سچ مانئے کہ تاثیر کے اعتبار سے کسی کتاب کا مطالعہ' ڈراما سے لگا نہیں کھاتا۔ حضرت انسان کے دیگر سوانح نگار واقعات سے ایک قدم بھی آگے بڑھ سکتے۔ جو کچھ ازمنہ ماضیہ میں ہو چکا۔ اسے بیان کر کے اپنا دفتر لپیٹ لیتے ہیں۔ لیکن ڈراما جو فطرت انسانی کا ماہر کامل ہے۔ ان سے بہت آگے نکل جاتا ہے اور ممکنات کو معرض بحث میں لا کر یہ بھی دکھا دیتا ہے کہ فلاں کا مال ایک ایسی صورت میں بھی ممکن ہے جو آج تک رونما نہیں ہوا۔ تاریخ آپ کو محو غم دوش تو کر دے گی مگر فردا پر آمادہ کرنا ڈراما ہی کا کام ہے۔ تاریخ آپ کو بتائے گی کہ دنیا نے کیا کیا؟ اور ڈراما آپ کو دکھائے گا کہ دنیا کو کیا کرنا چاہیے؟

اس میں کیا شک ہے کہ ناٹک یا ڈراما اس تماشا کا نام ہے جس میں بول چال اور حرکات و سکنات کے ذریعہ انسانی زندگی کے کسی روشن پہلو یا تاریک رخ کو پیش کیا جاتا ہے اور یہ تعلیم و تربیت کا بہترین بلکہ اعلیٰ ترین طریق کار ہے اس لئے دنیا میں ہمیشہ اور ہر جگہ ناٹک اور ڈراما کا رواج رہا۔ جب علم و فن نے ترقی کی تو سوچا یہ گیا کہ ڈراما یا ناٹک کو کھیل کر اس کی تصویر کیوں نہ لے لی جائے تاکہ بار بار اس کھیل کو کھیل کر نہ دکھایا جائے۔ بلکہ یہ کام تصویر سے لے لیا جائے تاکہ سارے لوگ یا زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے مستفیض و مستفید ہو سکیں۔ چنانچہ فلم کا رواج ہوا۔ یہ کوئی فرضی تصویر نہیں بلکہ خدا کے بتائے ہوئے انسان جس تصور' خیالی' معاطے اور موضوع کو عملاً پیش کرتے ہیں۔ اسی کا عکس ہوتا ہے۔ اسی کی تصویر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشہور ماہر نفسیات ڈیل کارنیگی نے کہا ہے کہ:

یہ زمانہ ڈرامائی ہے صرف صداقت حرف و حقیقت زبانی کافی نہیں ہو سکتا۔ سچائی کو بھی واضح' دلچسپ اور ڈرامائی بنانا چاہیے۔ آئینہ بندی کا ہنر جاننا ضروری ہے۔ انسانوں کی کشش کے لئے یہ بہترین طریق کار ہے۔"

مگر ہمارے یہاں چونکہ فی نفسہ تصویر ہی کو حرام قرار دے دیا گیا اس لئے لامحالہ سینما دیکھنا بھی حرام ہو گیا۔ محترم مولانا محمد اسحاق سندیلوی کی طرح محترم مفتی زاہد القادری صاحب نے بھی فرما دیا کہ: سینما دیکھنا حرام اور ناجائز ہے۔"

ظاہر ہے کہ سینما میں پردوں پر تصویریں ہی تو دکھائی جاتی ہیں۔ چنانچہ اچھی اچھی فلمیں اور اصلاحی و تعلیمی تصویریں بھی بلا استثناء حرام قرار دے دی گئی ہیں۔ حیرت ہے کہ مکانوں میں' رسالوں میں اور کتابوں میں' نمازیوں کی' حاجیوں کی' عمارتوں کی' درختوں کی اور پہاڑوں کی تصویریں رکھنے اور دیکھنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا جاتا مگر انہیں مناظر کی تصاویر اگر کسی پردے پر سینما ہال میں دکھائی جا رہی ہوں تو وہ حرام ہو جاتی ہیں۔ امریکہ کی' انگلینڈ کی' حجاز کی' قدرتی مناظر کی تصاویر' رسالوں اور اخباروں میں دیکھنے سے دین میں کوئی خلل نہیں آتا۔ لیکن اگر یہی تصویریں سینما کے ذریعے سے پردوں پر پیش کی جائیں تو ناجائز ہو جاتی ہیں' نوٹوں' سکوں' پاسپورٹوں میں جو تصویریں ہوتی ہیں انہیں دیکھنا گناہ نہیں۔ مگر پردوں پر جو تصاویر پیش کی جاتی ہیں انہیں دیکھنا گناہ ہے۔ معمیمرا خراب ہو جائے تو "ایکس رے" کرانے میں اور اس کی جو تصویر آئے اسے دیکھنے سے دین سلامت رہتا ہے۔ لیکن اگر یہی چیز کسی فلم میں دیکھ لی جائے تو دین رخصت ہو جاتا ہے۔ "الارشاد جدید" (کراچی) اہلحدیث حضرات کا مذہبی آرگن ہے۔ اس کے دسمبر ۱۹۵۴ء کے شمارے میں ایک صاحب نے فتوے پوچھا کہ:

کیا فرماتے ہیں علمائے دین وحامیان شرع متین اس مسئلے میں جب شرعی طور پر انسان یا حیوان کی تصاویر بنانا حرام اور گناہ کبیر ہے۔ لیکن آج کل کے قوانین کے مطابق:

۱۔ سرکاری ملازموں کو پنشن حاصل کرنے کے لئے

۲۔ مہاجرین کو حکومت سے زمین یا مکان حاصل کرنے کے لئے

۳۔ حج کو جانے اور ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرنے کو پاسپورٹ حاصل کرنے کے لئے۔

پاسپورٹ سائز (سر' چہرہ اور سینے کا کچھ بالائی حصہ) کی تصویر کھنچوا کر دینا لازم ہے اور بغیر تصویر پیش کئے نہ تو پنشن مل سکتی ہے نہ زمین یا مکان اور نہ کوئی حج کو جا سکتا ہے۔ یہ ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کر سکتا ہے۔ ان حالات میں بتایا جائے

کہ تصویر کھنچوانا از روئے شریعت جائز ہے یا ناجائز؟

محترم اہل حدیث مفتی صاحب نے فتویٰ دیا کہ:۔

"مسائل شرعیہ کی بنیاد ہمیشہ اختیاری رہی۔ جہاں اضطرار پیدا ہوا' شریعت نے ضرورت انسانی کو مدنظر رکھتے ہوئے اجازت دے دی۔ ایسی اجازت کو حلت ابدی نہیں کہا جائے گا بلکہ حلت وقتی یا اضطراری کہا جائے گا۔الا ما اضطررتم میں اللہ تعالے نے حرام کو حلال بتایا ہے۔ لہٰذا تمام مسائل ایسے اسی اصول پر مبنی ہوں گے۔"

جب تصویر کی حرمت ثابت کرنی ہوتی ہے تو قرآن کی طرف سے قطع نظر کر لیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ:۔

حدیث رسول اللہ صلعم سے ثابت ہونا کیا احکام شرعیہ کے لئے کافی نہیں؟

مگر جب اسے حلال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تو سہارا قرآن کا لیا جاتا ہے۔ حلت وحرمت اور جائز وناجائز کا معاملہ "اصولی" ہے۔ خود فاضل مجیب نے مندرجہ بالا جواب میں اس مسئلے کو "اصولی" بتایا ہے اور تصویر کی حلت کے "اصول" کے لئے خود موصوف نے قرآنی آیت کا سہارا لیا اور پیش کیا ہے۔ مگر تصویر کی حرمت کے معاملے میں "اصول کی کتاب" قرآن کو چھوا بھی نہیں جاتا۔ بلکہ صرف روایت کو کافی کہاجاتا ہے اور فرما دیا جاتا ہے کہ اسلام میں تصویر ناجائز ہے۔ البتہ جب فروعی معاملات آتے ہیں۔ حکومت سے کچھ حاصل کرنا ہوتا ہے تو اس کے جواز کے لئے " اصول کتاب" قرآن کا دامن پکڑا جاتا ہے۔ بہرکیف! مفتی زاہد القادری صاحب مفتی "آستانہ" سے بھی "آستانہ" دسمبر ۱۹۵۴ء میں سوال کیا گیا تھا کہ:۔

پاسپورٹ کے لئے جدید طریقہ فوٹو گرافی سے ...... فوٹو کھنچوانا لازم ہے۔ ایسے اہم موقع پر مجبوراً" تصویر کھنچوانا درست ہے یا نہیں؟ جواب ملا کہ:۔ درست ہے۔"

ان حوالوں سے ظاہر ہے کہ روپیہ' اجازت نامہ' مکان' زمین وغیرہ یعنی فائدہ حاصل کرنے کے لئے تصویر دیکھنا یا کھنچوانا بالکل جائز ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر فلم کے ذریعے سے عملی' عقلی اور تعلیمی فائدہ حاصل کرنا ہو تو اس کے لئے فلم بنانا اور دیکھنا کیوں غلط ہو گا؟ "سیسل بی ڈی ملز" نے ایک عظیم الشان فلم "احکام عشرہ" کے عنوان سے تیار کی ہے جس میں ایک منظر وہ بھی ہے جس میں بنی اسرائیل کے

حضرت موسیٰ کے ساتھ مصر سے بچ نکلتے وقت بحیرہ قلزم کے پانی کے پھٹنے' بنی اسرائیل کے نکل جانے اور فرعونیوں کے غرق ہو جانے کا سماں دکھایا گیا ہے۔ اس واقعے کا ذکر قرآن میں بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فلم تاریخی حیثیت سے انوکھی' سبق آموز اور عبرت انگیز ہے مگر اس کا دیکھنا بھی مسلمانوں کے لئے حرام ہو گیا ہے۔ بلاشبہ بری فلمیں مضر اثرات مرتب کرتی ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو خراب فلمیں ہرگز نہ دیکھنی چاہئیں۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ ہندو پاک میں تیار کی ہوئی فلمیں زیادہ تر ایسی ہی ہوتی ہیں کہ ان سے آنکھیں تو ٹھنڈی ہو جاتی ہیں مگر دل گرم نہیں ہوتا۔ نفس تو لذت یاب ہو جاتا ہے لیکن روح کوئی غذا نہیں پاتی۔ لہٰذا تعلیم کا جو اصل مقصد تھا۔ وہ پورا نہیں ہو رہا۔ مگر یہاں بحث یہ نہیں۔ کہ فلم کون سی دیکھی جائے بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ فلم بینی کو حرام قرار دینا غلط ہے اور لوگوں کی اصلاح کا یہ انداز درست نہیں کہ عکاسی و فلم بینی ہی کو اسلام میں حرام مطلق بتایا جائے بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ مسلم فلمسازوں اور سینما مالکوں پر زور دیا جائے کہ وہ اپنے تجارتی مقصد میں دینی نصب العین کو بھی شامل کریں۔ وہ اس صنعت وفنکاری کے ذریعہ روپیہ ہی نہ کمائیں بلکہ دینی خدمت بھی کریں۔ ان کو سمجھایا جائے دینی کام صرف روزہ ونماز ہی کرنا نہیں ہے بلکہ ایسی فلمیں تیار کرنا بھی دینی خدمت ہی میں داخل ہے۔ جن سے قوم کے سامنے ایمانی معیار اور اسلامی کردار ظاہر ہو۔ ملت کی مخلصانہ خدمت اور بندگان خدا کے ساتھ حسن سلوک کا شوق پیدا ہو۔ لوگ ایثار وقربانی' علم وعقل' جہد وعمل' ایماندارانہ فرض شناسی اور شریفانہ اخلاق واخلاص کا درس وسبق حاصل کریں۔ لوگ فلم دیکھ کر کچھ کھوئیں نہیں بلکہ پائیں۔ مگر یہ کیا زبردستی ہے کہ ضرورتاً" تصویر کھنچوانا' تصویریں پاس بھی رکھنا' دوسروں کو تصویریں دکھانا تو جائز ہو جائے مگر کسی ہال میں پردے پر یہی تصویریں حرام مطلق ہو جائیں؟

جماعت اہل حدیث کا ہر جمعہ کو شائع ہونے والا ہفتہ وار رسالہ "الہدیٰ" (دربھنگہ) اپنی اشاعت جلد ۵ شمارہ ۱۳ (مورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۵۷ء کے صفحہ ۵ کالم ۳ میں "کلام نبوت" کے عنوان اور "صحیح بخاری" کے حوالے سے لکھتا ہے:۔

"ابو سلمہ سے روایت ہے کہ میں اور حضرت عائشہؓ کا رضاعی بھائی

حضرت عائشہؓ کے پاس آئے اور حضرت عائشہؓ سے ان کے بھائی نے رسول اللہ کے غسل کے متعلق پوچھا تو حضرت عائشہؓ نے بقدر ایک صاع کے ایک برتن منگوایا۔ پھر غسل کیا اور اپنے سر پر پانی ڈالا۔ میرے اور ان کے درمیان پردہ حائل تھا۔ (ف) معلوم ہوا کہ کسی امر کی تعلیم' عملی شکل میں دینا زیادہ انسب ہے۔"

"کسی پردہ پر عکس ڈال کر' عملی طور سے تعلیم دینے کے "جواز" کا بھلا "صحیح بخاری" کی اس مستند روایت سے بڑھ کر اور کیا ثبوت چاہیے؟"

جب حضرت عائشہؓ پردے کے پیچھے نہا کے دکھا رہی تھیں کہ رسول اللہ یوں غسل فرماتے تھے تو ابو سلمہ وغیرہ نے پردے پر نہانے کا عکس ہی دیکھا ہو گا اور یہ آرگن یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ کسی امر کی تعلیم عملی شکل میں دینا زیادہ انسب ہے' تو پھر تعلیمی فلموں کا پردے پر دیکھنا کیونکر حرام ہو سکتا ہے؟ اس میں بھی تو تعلیمی مسائل کو عملی شکل دے کر اس کا پر تو یا اس کا عکس یا اس کی تصویر کو پردے پر دکھایا جاتا ہے؟ اس میں بھی تو انسان بنایا نہیں جاتا بلکہ خدا کے بنائے ہوئے انسانوں کے عمل کا عکس اتار کر لوگوں کو دکھایا جاتا ہے تاکہ جس چیز کی علمی حیثیت سے تعلیم دی جا رہی ہے۔ اسے وہ عملی شکل میں بھی دیکھ لیں؟ نماز' روزہ' خدمت خلق' محنت و محبت' جانفشانی و جاں نثاری کرتے ہوئے لوگوں کی تمثیل یا تصویر اگر کسی پردے پر دکھائی جائے تو وہ ناجائز اور حرام کیونکر ہو سکتی ہے؟ خواجہ حسن نظامی صاحب نے اپنے "روزنامہ سفر" میں فلسطین کے ذکر میں لکھا ہے کہ وہاں مدرسہ "اوختہ المعارف" کو دیکھنے گئے تو وہاں کے شیخ الجامعہ نے:۔

"شام کو بعد مغرب کے پھر بلایا اور رچرڈ شاہ انگلستان اور سلطان صلاح الدین کا جنگی ڈرامہ دکھایا جس کو مدرسہ کے لڑکوں اور استادوں نے مل کر کیا۔"

پھر صفحہ ۱۳۸ پر لکھا ہے کہ:۔

"اس تماشہ نے جس میں صلیبی لڑائیوں کا ہو بہو نقشہ' لباس وغیرہ دکھایا گیا تھا' بہت محظوظ کیا۔"

یہی ڈراما اگر فلما دیا جائے یعنی اس ڈرامے کی تصویر اتار لی جائے تو وہ حرام ہو جائے گی؟ اور اس کے دیکھنے سے خدا ناراض ہو جائے گا؟ اس طرح کی فلمیں تو آجکل مسلمانوں کو بطور خاص بنانا اور دیکھنا چاہیے تاکہ ان کے خون میں حرارت اور جوش عمل میں اضطراب پیدا ہو۔

قرآن نے تصویر کو ہرگز ناجائز نہیں قرار دیا ہے۔ اس لئے تصویریں چاہے متحرک ہوں یا ساکن' کاغذوں پر ہوں یا پردوں پر' ہرگز ان کا دیکھنا حرام اور ناجائز نہیں ہو سکتا۔ آج اچھی فلمیں تعلیم کا بہترین ذریعہ ہیں۔ اس لئے علمی اور فنی' معاشی اور معاشرتی' اصلاحی اور اخلاقی فلمیں ہر مسلمان کو دیکھنا جائز ہی نہیں بلکہ فرض ہے۔ روس کی لامذہبیت جس قدر بھی مطعون ہو مگر مذہب کے علمبردار امریکہ' فرانس اور برطانیہ کی فلموں کی طرح آپ کوئی روسی فلم ایسی نہیں دکھا سکتے جو انسان کے اخلاق وکردار پر برا اثر مرتب کر سکے۔ ان لوگوں نے ہر طرح کی دل نشین تعلیمات کا ایک نہایت موثر ذریعہ فلموں کو بنا لیا ہے۔ اسی لئے روس کی ترقی دن دوگنی اور رات چوگنی ہے۔" "رسالہ" "سوویٹ دیس" میں ایک لڑکے نے رسالہ سے سوال کیا تھا کہ:-

"بتایئے' انسان پر فلموں کا اثر کیا پڑتا ہے؟ کیا طالب علمی کے زمانے میں فلم بینی اچھی چیز ہے؟ رسالہ نے دیکھئے کیا عمدہ جواب دیا تھا۔

"ہر چیز کا دارومدار اس پر ہے کہ آپ کون سی فلم دیکھ رہے۔ سینما آرٹ کی دوسری اصناف کی طرح' بہت اچھا اثر ڈال سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "سوویٹ" فلم ساز' اپنی فلم کے نظریاتی پہلو پر بڑی توجہ دیتے ہیں۔ سوویٹ یونین اور دوسرے ملکوں کی بہترین فلمیں' انسان دوستی' انصاف پیروی اور امن پسندی کے تصورات کا پرچار کرتی ہیں۔ ان کے ہیرو ایماندار ہیں۔ مضبوط ارادے کے نیک لوگ ہیں۔ اس قسم کی فلم انسان

کے لئے بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ اپنے لوگوں کو ابھار سکتی ہے۔ ان میں رجائیت کی چنگاری روشن کر سکتی ہے۔ ان کو اپنوں کے کام آنے کے لئے آمادہ کر سکتی ہے اور ان میں انسان دوستی اور دردمندی کا جذبہ جگا سکتی ہے۔"

آپ کو شاید اس قول کی صداقت اور اس نظریہ کی صحت قبول کرتے ہوئے بھی یہ کھٹک ہو گی کہ یہ ایک لادینی رسالہ کا نظریہ ہے۔ مگر نہیں۔ دیکھئے کہ ایک دینی رسالہ کا نظریہ بھی یہی ہے۔ خانقاہ کلیمی کے سجادہ نشین اور مدیر "آستانہ" وپیام مشرق سے کسی نے سوال کیا کہ "آپ فلم کو مضر اخلاق سمجھتے ہیں؟" تو انہوں نے جواب دیا کہ:۔

"آپ کے سوال کا جواب ہے۔ نہیں یہ منفی جواب ذرا تفصیل ووضاحت کا محتاج ہے۔ فلمسازی یا فلم بینی دونوں معیوب نہیں بلکہ فلم تو درحقیقت ایسی چیز ہے کہ اگر وہ اچھا ہو تو اس سے بہت سے مفید کام لئے جا سکتے ہیں یورپ کے بعض ملکوں میں طالب علموں کو تعلیم دینے کے لئے فلم کا استعمال ہوتا ہے۔" (پیام مشرق مورخہ ۲۸ جولائی ۱۹۵۳ء)

یہی وجہ ہے کہ "موتمر شباب العالم الاسلامی" نے یہ طے کیا ہے کہ تمام اسلامی ملکوں کے نوجوان اپنی اپنی حکومتوں سے کہہ کر اسلامی تہذیب وتمدن اور تاریخی واقعات کی فلم تیار کرائیں اور ساری دنیا میں ان کی نمائش کی جائے تاکہ اسلامی تعلیمات اور طرز زندگی میں لوگ کشش وجاذبیت محسوس کریں۔ سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ اب کٹر مذہبی ممالک میں بھی فلم کی عظمت تسلیم کی جا رہی ہے اور اہم فلمیں بن رہی ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں قاہرہ (مصر) میں فلم "ظہور اسلام" بنائی گئی جس میں اسلام کی آمد سے پہلے کے واقعات اور اسلام کے ابتدائی حالات فلمائے گئے ہیں۔ دراصل یہ فلم چربہ ہے۔ ڈاکٹر طہٰ حسین کی کتاب "الوعدالحق" کا جس میں اس دیدہ درنابینانے' اسلام کے آغاز' اس کے پرستاروں پر توڑی جانے والی مصیبتوں اور مشکلات' آزمائشوں میں ان کی ثابت قدمی اور جرات مندی اور بالآخر برائی کی قوتوں پر

ان کے غلبہ پانے کا ذکر کیا تھا۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ شاہ محمد جعفر ندوی پھلواروی نے زیردستوں کی "آقائی" کے نام سے کیا ہے جو شائع ہو چکا ہے۔ اس فلم کو پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ عوام میں جرات وحوصلہ مندی پیدا کی جائے اور وہ اس طرح کی انہیں یہ ابدی حقیقت یاد دلائی جائے کہ فتح ان کی ہوتی ہے۔ جن کے دل مضبوط اور ایمان پختہ ہوں۔ خواہ دنیا کے مروجہ معیار کے اعتبار سے ان کا درجہ کتنا ہی پست کیوں نہ ہو۔

اہل حدیث حکومت کی جانب سے خود حجاز میں ایک فلم مسجد نبوی کی تعمیر جدید سے متعلق بن رہی ہے۔ دونوں فلموں کے متعلق "روزنامہ سیاست جدید" (کانپور) کی شائع کردہ خبر بجنسہ ملاحظہ فرمایئے۔

(۱)

"مصر میں علماء کے تعاون سے پاکیزہ فلموں کے ذریعے احیاء اسلامی فلم ظہور اسلام" میں غار حرا اور ثور کے اصلی فوٹو لئے گئے ہیں۔ ترکی زبان میں بھی فلم تیار کی گئی ہے۔"

"حضور اکرمؐ اہل بیت اطہار اور خلفاء راشدین کے سوا دوسرے لوگوں کے فوٹو لئے جا سکتے ہیں۔" (مفتی اعظم مصر کا فتوٰے)

"قاہرہ ۲۲ مارچ مصر کے فلمساز ادارے' اسلام کے احیاء کے مناظر مذہبی علماء کے تعاون سے تیار کر رہے ہیں۔ مفتی اعظم مصر اور علماء جامعہ ازہر نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ دنیا کے تمام مسلمانوں سے اس کی حوصلہ افزائی کی اپیل کی ہے۔ بتایا ہے کہ مسلمان مدتوں سے فوٹوگرافی کے مخالف ہیں۔ یہ مخالفت اس طرح دور ہو جائے گی۔"

(۲)

"مسجد نبوی کی توسیع وتعمیر کی دس ہزار فٹ لبی رنگین فلم" "یہ فلم تمام اسلامی ممالک کو نمائش کے لئے بھیجی جائے گی۔"

نہ صرف اتنا بلکہ مصر کی وزارت تعلیم نے مصر کی وزارت تعمیرات کو ہدایت کر دی ہے کہ آئندہ سے جو نئی مسجدیں بنیں ان میں ایک کمرہ ایسا ضرور بنایا جائے جہاں نمازیوں کی علمی، عقلی، تاریخی، تعلیمی اور تربیتی افادیت حاصل کرنے کے لئے مفید اور ضروری فلمیں دکھائی جا سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم قوم کو بے سمجھی بوجھی نمازیں پڑھنے والے غیر مفید افراد کی ضرورت نہیں بلکہ اس قوم کو وہ نمازی چاہیں جو اپنی نمازیں سمجھتے اور ضرورت زمانہ کے لحاظ سے باخبروبکار آمد ہوں۔ دنیا کے لوگ اور غیر مسلم، فلموں کے ذریعے سے بڑے بڑے اثرات مرتب کر رہے ہیں۔ دور حاضر میں چونکہ یورپ اور ایشیا دو گروپوں میں منقسم ہو رہے ہیں۔ اس لئے ایشیائی ممالک متضاد نظریہ زندگی اور مخالف تصور حیات رکھتے ہوئے بھی باہم متفق ومتحد ہو جانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ ایشیا میں مسلم ممالک کی تعداد زیادہ ہے۔ اس لئے غیر مسلم ممالک اور غیر مذہبی حکومتیں چاہتی ہیں کہ وہ مسلم ممالک کے ساتھ رہیں۔ اس کے لئے مختلف تدبیریں ہو رہی ہیں۔ چنانچہ اپریل ۱۹۵۵ء میں انڈونیشیا میں، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ایک بین الایشیائی وافریقی کانفرنس منعقد ہونے کی بات طے پائی اور انتیس ایشیائی وافریقی حکومتوں کے درمیان باہمی گفتگو کی تجویز منظور ہوئی۔ چونکہ انڈونیشیا میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے اور اس کانفرنس میں شریک ہونے والے ممالک میں زیادہ تعداد مسلم ممالک کی تھی۔ اس لئے حکومت ہند کی جانب سے ایک منصوبہ بنا کر ہندوستان میں مسلمان کے نام سے ایک فلم بنوائی جائے، جس میں مسلمانوں کے بڑے بڑے دارالعلوم اور ان کی مشہور درس گاہوں، خانقاہوں یادگاروں کی تصویریں لی جائیں اور اس فلم کو بینڈونگ کانفرنس کے موقع پر انڈونیشیا میں دکھایا جائے اور اس کے بعد ساری مسلم دنیا کو دکھایا جائے تاکہ ہندوستان کی سیکولر اسٹیٹ (لادینی حکومت) کی طرف سے دنیا کے مسلمانوں کو اگر کچھ غلط فہمی ہو تو وہ دور ہو جائے۔ چنانچہ حکومت ہند کی وزارت اطلاعات کے فلم ڈویژن کو یہ کام حوالے کیا گیا۔ اور یہ فلم بن کر تیار ہوئی اور پروگرام کے مطابق انڈونیشیا میں دکھائی گئی۔ اس فلم کے ذریعے سے دراصل مسلم دنیا کو یہ دکھایا اور جتایا گیا کہ مسلمانوں نے ہر دور میں ہندوستان کو ایک نئی زندگی بخشی ہے اور ان کا کردار ہمیشہ بلند رہا ہے

اور جس طرح ہندوستان میں ان کا ماضی پر عظمت رہا ہے۔ اسی طرح ان کا مستقبل بھی درخشاں ہے۔ چنانچہ مشہور تاریخی مقامات اور مذہبی مناظر کو اس فلم میں پیش کیا گیا ہے جس میں لال قلعہ' قطب مینار' تاج محل' علی گڑھ یونیورسٹی وغیرہ کی تصویریں فلمائی گئیں۔ ساتھ ہی ساتھ اجمیر شریف اور سرہند شریف کی بھی مع اہل کاروں کی تصویریں لی گئیں اور مشائخ نے اس فلم سازی پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ نہ مقامات کی تصویریں لینے پر اور نہ عملوں کی تصویر لینے پر ۲۹ جنوری کو دارالعلوم (دیوبند) کے مناظر فلمائے گئے۔ اس فلم میں اساتذہ اور طلباء سبھی ہیں۔ یہ فلم دنیا میں نئی قسم کی ہے اور اس سے عام مسلم دنیا پر اچھا اثر پڑا ہے۔

دراصل غلط فہمی ہے کہ تصویر اور فلم سے بت پرستی کا اندیشہ ہے۔ حالانکہ بت پرستی کا تعلق نہ آنکھ سے ہے نہ زبان سے بلکہ دل سے ہے۔ جس کے دل ہی میں بت بیٹھا ہو اس کی آنکھ پر پٹی باندھنے سے کیا حاصل؟ اور اگر دل بت پرستی کے جذبے سے پاک وصاف ہے تو تصویر کھنچوانے یا فلم دیکھنے سے کیا نقصان ہو گا؟ آنحضرت تو خانہ کعبہ میں جا کر اس وقت بھی نماز پڑھتے تھے۔ جب وہاں تین سو ساٹھ بتوں کی تصویریں اور مجسمے رکھے ہوئے تھے۔ محض اندیشے سے سب کو ختم کرنا کیا معنی؟ اور کیا قیاسی خطرے اور مفروضہ اندیشے سے بت پرستی کے تمام اسباب کو ختم بھی کیا جا سکتا ہے؟ زنا کا اندیشہ تو ہر وقت ہر مرد سے ہے۔ پھر کیا تمام مسلمان مردوں کو خصی کر دیا جائے گا؟ لوگ تو درختوں کی بھی پرستش کرتے ہیں۔ پھر کیا دنیا سے تمام درختوں کو ختم کیا جا سکتا ہے؟ مئی ۱۹۵۵ء میں بمقام لکھنؤ دریائے گومتی کے کنارے پتی پوجن کا جلسہ ہوا۔ جس میں بیویوں نے شوہروں کی پوجا کی۔ پھر کیا عام شوہروں کو قتل کر دیا جائے گا؟

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے "مجلہ اسلامیہ" کی اشاعت بابت جون ۱۹۶۳ء میں محترم محمود الحق صاحب ریسرچ اسسٹنٹ ادارہ علوم اسلامیہ کا ایک گرانقدر مقالہ مصر کے مفتی اعظم' علامہ شیخ محمد عبدہ کی اصلاحی تحریک سے متعلق شائع ہوا ہے۔ اس میں فاضل مقالہ نگار نے لکھا ہے:۔

"شیخ محمد عبدہ نے زندگی سے متعلق چند اہم شرعی مسائل کی جدید

تشریح کی۔ انہوں نے ... تصویر کشی اور مجسمہ سازی کو جائز ٹھہرایا...... ان کے نزدیک ذی روح اور غیر ذی روح اشیاء کی تصویر کشی میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ تصویر کشی ممنوع ہے۔ اس لئے کہ اس سے بت پرستی پیدا ہونے کا امکان ہے۔ اس کے جواب میں محمد عبدہ نے کہا ہے کہ یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ چونکہ زبان سے جھوٹ کے سرزد ہونے کا امکان ہے۔ اس لئے اسے باندھ دینا چاہیے۔ دارانحالیکہ انسان کی زبان سچ بولنے پر اسی طرح قادر ہے جس طرح جھوٹ بولنے پر۔ انہوں نے مزید کہا کہ یہ اسلامی شریعت کی روح کے خلاف ہے کہ وہ تصویر کشی اور مجسمہ سازی کو ممنوع قرار دے جبکہ یہ علم حاصل کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔"

اس لئے یہ محض وہم ہے کہ اسلام نے تصویر کو حرام کر دیا ہے اور اس لئے فلمیں بھی نہ دیکھی جائیں۔ چاہے وہ تعلیمی' علمی' اصلاحی' اخلاقی اور سبق آموزی کیوں نہ ہو۔

ہری پکچرز کی پیش کش مشہور فلم "دیار حبیب" میں حج کے ارکان کی ادائی اور مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کے مختلف مناظر کی نمائش سے پہلے اجمیر شریف وکلیر شریف اور دوسری دہلوی ودکنی چشتیہ سلسلے کی بہت سی خانقاہوں اور متعدد مزارات مقدس کے مناظر مع ان کے سجادہ نشینوں کی تصاویر کے پیش ہوئے ہیں۔ یہ پوری فلم حضرت خواجہ حسن نظامی کی نگرانی میں اور اسلامیہ دارالاشاعت (دہلی) والوں کے گراں قدر مشوروں اور محنتوں سے تیار ہوئی ہے۔ چنانچہ حضرات خواجہ حسن نظامی پیرزادہ خواجہ عزیز حسن بقائی اور الحاج مفتی زاہد القادری صاحبان کا نام نگران اور معاون ومشیر کی حیثیت سے نمایاں طور پر جلی حروف میں پیش کیا گیا ہے۔ کون مفتی زاہد القادری صاحب؟ وہی جنہوں نے ایک سائل کے اس استفساء پر عطا اللہ پالوی کے ایک مضمون میں ازروئے قرآن:

"سینما اور تصویر کشی کو جائز قرار دیا گیا ہے۔"

رسالہ "آستانہ" (اگست نمبر ۱۹۵۷ء) میں یہ پر جلال فتویٰ دیا تھا کہ:

"سینما دیکھنا حرام اور ناجائز ہے۔ یہ کہنا کہ سینما دیکھنے کی ممانعت اور رقص و تصویر کشی کی ممانعت قرآن سے ثابت نہیں' ایک جاہلانہ طرز استدلال ہے۔"

اب مفتی زاہد القادری صاحب کا عالمانہ فتویٰ دیکھنا ہو تو فلم "دیار حبیب" کسی سینما ہاؤس میں جا کر دیکھ لیجئے' جو ان کے زریں مشوروں اور مشکور محنتوں سے تیار ہوئی ہے اور جس کے ذریعے سے سینما دیکھنا اور تصویر کشی دونوں کے قطعی جائز ہونے کا ثبوت رہا موسیقی اور رقص کا مسئلہ' سو اسی فلم "دیار حبیب" میں درگاہ کلیر شریف کا جو منظر ہے اس میں عرس کے موقع پر قوالوں کے ساتھ ساتھ ایک طوائف بھی ناچتی گاتی دکھائی گئی ہے۔ یہ ثبوت ہے مفتی زاہد القادری صاحب کے اس عملی فتوے کا کہ رقص اور موسیقی بھی ہرگز حرام نہیں بلکہ قطعی حلال ہے۔

تصاویر کی حرمت کے لئے تو خیر ایک روایت بھی تھی۔ مگر "مجسموں" کی ممانعت کے لئے تو کوئی خاص روایت بھی نہیں۔ اسلام میں مجسمہ بنانا اور رکھنا محض اس بنا پر حرام فرض کر لیا گیا ہے کہ خانہ کعبہ میں بہت سے مجسمے رکھے ہوئے تھے جن کی پرستش ہوتی تھی یا آج دیگر اقوام کے یہاں ان کے دیوتاؤں کے مجسمے پوجے جاتے ہیں۔

ہمارے بھولے بھالے مسلمان جب مجسموں کو دیکھتے ہیں تو ان بتوں کی پرستش کے لئے ان کے دل سینوں اچھلنے لگے ہیں۔ اور جب ان کی نظر تصویروں پر پڑتی ہے تو ان کی بارگاہ میں جھکنے کے لئے ان کی پیشانیوں میں سجدے تڑپنے لگتے ہیں' اس لئے وہ مجسموں اور تصویروں کو گوارا کرنے پر آمادہ نہیں۔ "مجسموں" کی موجودگی میں نماز پڑھنا تو خیر بڑی بات ہے۔ اگر بدقسمتی سے ان کو کسی گمراہ مسلمان کے تصویر دار کمرہ میں نماز پڑھنے کی مجبوراً" ضرورت پیش آ جاتی ہے تو یہ دیندار مسلمان تصویروں کو الٹ دیتے ہیں کہ کہیں بارگاہ خداوندی میں ادا کئے ہوئے سجدوں کو تصویریں نہ اپنا لیں۔ اس لئے ذرا دیکھا جائے کہ مجسموں اور تصویروں کی موجودگی سے بت پرستی کا اندیشہ ان اگلے مسلمانوں کو بھی تھا یا نہیں جو تعلیمات اسلامی' احادیث نبوی اور قرآنی

حکمتوں سے بہ نسبت ہمارے زیادہ باخبر تھے۔

عہد عباسیہ کے دوسرے خلیفہ منصور (پیدائش ۱۰۱ھ) آنحضرت صلعم کے خاندان سے تھے۔ ان کے بارے میں علامہ حافظ اسلم جیرا جپوری نے "تاریخ الامت" جلد نمبر ۴ کے صفحہ ۱۱۸ پر لکھا ہے کہ:۔

"منصور، علم قرآن وحدیث میں بلند پایہ رکھتا تھا"

اس کتاب کے صفحہ نمبر ۱۲۳ پر یہ بھی لکھا ہوا کہ منصور نے بغداد میں اپنا دارالخلافہ اس طرح بنوایا تھا کہ:۔

"وسط شہر میں جامع مسجد تھی اور اسی سے ملحق قصر خلافت تھا ... اس کا نام قبہ خضرا" رکھا گیا تھا .... اس کے اوپر ایک سوار کی مورت بنائی گئی تھی جس کے ہاتھ میں نیزہ تھا۔"

منصور کا دور ۱۳۶ھ سے ۱۵۸ھ (۷۵۴ء سے ۷۷۵ء) تک ہے۔ ممکن ہے اس امیرالمومنین" اور فرد خاندان رسول" کے اس نامور خلیفہ کے مجسموں" کو ناجائز ہونے کا علم نہ ہو۔ اور اس نے مسجد کے نزدیک واقع قصر خلافت میں مورت" بنوا دی ہو۔ لہٰذا ہمیں اس سے پہلے کی تصویر دیکھنی چاہیے۔ عباسیوں سے پہلے امویوں کا دور حکومت تھا۔ امیر معاویہ کا چچیرا بھتیجا عبدالملک (پیدائش ۲۹ھ) بنوامیہ کا پانچواں خلیفہ ہوا ہے۔ جس کا دور حکومت ۶۵ھ سے ۸۶ھ (۶۸۵ء سے ۷۰۵ء) تک ہے۔ علامہ جیرا جپوری نے تاریخ الامت" جلد نمبر ۳ صفحہ ۶۷ میں لکھا ہے کہ:۔

"عبدالملک .... علم میں مشیوخ مدینہ مثلاً" سعید ابن مسیب اور عروہ بن زبیر کے ہم رتبہ سمجھا جاتا تھا۔ امام شعبی کا قول ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں جس کو دیکھا اس سے اپنے آپ کو علم وفضل میں زیادہ پایا۔ بجز عبدالملک کے۔"

اس کے بارے میں مستند عزلی مورخ مقریزی نے لکھا ہے کہ:۔

"عبدالملک نے جو مسجد دمشق میں تیار کرائی تھی اس کے دروازوں پر

رسول اللہؐ کی شبیہہ مبارک تھی اور اس کے ایک سکہ میں اس کی اپنی تصویر بالکل اسی طرح بنی ہوتی تھی جس طرح قیاصرہ روم کے سکوں میں تھی۔"

ہو سکتا ہے کہ اس اموی عالم وفاضل خلیفہ کو بھی اسلام میں تصاویر وتماثیل کے ناجائز ہونے کا علم نہ ہو اس لئے اور اوپر چلئے۔ حضرت خالد بن ولید کے شام چلے جانے کے بعد' حضرت عمرؓ نے حضرت سعد بن وقاص کو عراق کی فتح تکمیل کرنے کے لئے سپہ سالار بنایا مگر کمان اپنے ہاتھ میں رکھی۔ حضرت سعد ذرہ ذرہ کی رپورٹ مدینہ بھیجتے تھے اور وہاں سے جیسا حضرت عمر حکم دیتے تھے۔ اس کے مطابق حضرت سعد عمل پیرا ہوتے تھے۔ حضرت سعد آنحضرت صلعم کے حقیقی ماموں اور اجل صحابہ میں سے تھے۔ عراق کے پایہ تخت مدائن کی فتح کے سلسلے میں' علامہ شبلی نعمانی نے الفاروق" کے صفحہ نمبر ۲۹۳ پر لکھا ہے کہ:۔

"یزد گرد ..... شہر چھوڑ کر نکل گیا۔ سعد مدائن میں داخل ہوئے ..... ایوان کسریٰ میں تخت شاہی کے بجائے ممبر نصب ہوا۔ چنانچہ جمعہ کی نماز اسی میں ادا کی گئی۔ اور یہ پہلا جمعہ تھا جو عراق میں ادا کیا گیا۔ ہمارے فقہا کو تعجب ہو گا کہ سعد نے باوجود یکہ اکابر صحابہ میں سے تھے اور برسوں جناب رسالتماب کی صحبت میں رہے تھے۔ عالمگیر ومحمود کی تقلید نہیں کی۔ بلکہ ایوان میں جس قدر مجسم تصویریں تھیں سب برقرار رہنے دیں۔ اب علامہ موصوف نے حاشیہ پر یہ بھی لکھا ہے کہ:۔

"علامہ طبری نے' جو بڑے محدث بھی تھے۔ تصریح کے ساتھ اس واقعہ کو لکھا ہے۔"

مشہور مصری مورخ محمد حسین ہیکل نے بھی اپنی شہرہ آفاق کتاب عمر فاروق اعظم کے صفحہ نمبر ۲۴۳ پر لکھا ہے کہ:۔

"حضرت سعد نے کسریٰ کے محل میں قیام فرمایا اور ایوان شاہی کو مسجد بنا دیا۔ اس کی مورتوں کو جوں کا توں رہنے دیا گیا۔ اور انہیں چھیڑا بھی کیوں جاتا جبکہ وہ محل

اور خاص طور پر ان ایوان کی سجاوٹ کے لئے وہاں رکھی گئی تھیں؟؟"

سنا آپ نے؟ عباسی خلیفہ نے مسجد کے نزدیک قصر خلافت پر مجسمہ بنوایا تھا۔ اس سے پہلے اموی خلیفہ نے مسجد کے دروازوں پر تصویر بنوائی تھی اور وہ بھی آنحضرت صلعم کی۔ اور اس سے پہلے آنحضرت صلعم کے حقیقی ماموں اور مقتدر صحابی نے۔ حضرت عمر کے سے امیر کے عہد میں خود اس ایوان کسریٰ کو مسجد بنایا تھا۔ جو تصاویر وتماثیل سے بھرا تھا اور ان تمام تصاویر وتماثیل کو جوں کا توں رہنے دیا تھا۔ اور اس سے بھی پہلے خود حضرت محمدؐ کے بارے میں تو آپ نے سنا اور پڑھا ہی ہو گا کہ آپ خانہ کعبہ میں جا کر چھپ چوری نمازیں ادا کرتے تھے۔ اس وقت جب کہ وہ تین سو ساٹھ تصاویر وتماثیل کا گہوارہ تھا۔ نہ صرف خود بلکہ جس دن حضرت عمرؓ ایمان لائے ہیں۔ اس دن آپ نے جمیع مسلمانان مکہ کے ساتھ بشمول حضرت عمرؓ علانیہ خانہ کعبہ میں جا کر تین سو ساٹھ بتوں کی موجودگی میں ان کی آنکھوں کے سامنے بارگاہ الٰہی میں سجدہ ونماز ادا فرمایا تھا۔ ابن ہشام نے اس واقعہ کو عبداللہ بن مسعود کی زبانی یوں بیان کیا ہے۔

> "جب عمر اسلام لائے تو قریش سے لڑے۔ یہاں تک کہ کعبہ میں جا کر نماز پڑھی اور ان کے ساتھ ہم لوگوں نے بھی پڑھی۔"

موقع محل کی نزاکت اور صورت حال کو سامنے لایئے اور اس نماز کو دیکھئے۔ شاید اس دن کے ان سجدوں سے زیادہ قیمتی سجدے نہ کبھی پہلے بارگاہ خداوندی میں ادا ہوئے تھے اور نہ آئندہ قیامت تک ادا ہوں گے۔

حضرت سعد نے فتح مدائن کے بعد وہاں کے مجسموں کو علیٰ حالہ باقی رہنے دیا تھا اور حضرت عمر نے بھی ان کو کسی مجسمہ کے توڑنے کی ہدایت نہ کی تھی۔ حضرت عمر ہی کے عہد میں دوسرے بڑے صحابی عمرو بن عاص نے مصر فتح کیا تھا۔ فرعون کا مصر مجسموں کا شہر تھا۔ علاوہ انسان شکل دیوتاؤں کے مجسموں کے چونکہ مصریوں کے عقیدے میں دیوتا جانوروں کی شکلیں بھی اختیار کر سکتے تھے۔ بہت سے جانوروں کے مقدس مجسمے بھی ادھر ادھر بہت بڑی تعداد میں نصب تھے۔ ان ہی میں اہرام جیزہ کے

پاس کئی ہزار برس پرانا' مجسموں کا باپ داداعظیم الشان ابوالہول بھی تھا۔ جس کا چہرہ انسان کا اور بقیہ جسم شیر کا ہے۔ مگر نہ تو خود عمرو بن عاص نے مصر کے ایک بت کو بھی توڑا تھا۔ اور نہ حضرت عمر نے انہیں ایسا کرنے کا حکم دیا تھا۔ حد یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے سعد بن وقاص کو اس بدعت پر بھی کچھ نہ کہا کہ انہوں نے مجسموں سے بھرے ہوئے ایوان کسریٰ میں کیوں نماز پڑھی؟ علامہ عمر حسین ہیکل نے عمرؓ فاروق اعظمؓ کے صفحات نمبر۳۰۱' ۳۰۲ (اردو ترجمہ مطبوعہ پاکستان) پر حضرت عمر کے سفر شام اور دورہ فلسطین کے ذکر میں لکھا ہے کہ:۔

"حضرت عمر اور صفرنیوس' کلیسائے قیامت میں تھے کہ نماز کا وقت ہو گیا۔ بطریق نے عرض کی آپ یہاں نماز پڑھ لیجئے کہ یہ بھی ایک سجدہ گاہ خداوندی ہے۔" لیکن حضرت عمر نے معذرت فرمائی کہ اگر آج انہوں نے یہاں نماز پڑھی تو مسلمان ان کے اس عمل کو مستحب سمجھ کر ہمیشہ یہاں کی تقلید کریں گے۔ اور اگر انہوں نے ایسا کیا تو وہ عیسائیوں کو ان کے گرجا سے نکال دیں گے اور امان کے عہد کی خلاف ورزی کریں گے۔ ___ بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ اگر حضرت عمرؓ نے کلیسائے قیامت میں نماز پڑھنے سے دراصل اس لئے گریز کیا کہ وہاں تصویریں مورتیاں تھیں مگر.... اس کے عدم صحت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ کلیسائے قیامت" کے بعد حضرت عمر صفرنیوس کے ساتھ بیت اللحم میں کلیسائے مہد" کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے اور جب نماز کا وقت آیا تو وہاں نماز پڑھی' حالانکہ اس میں کلیسائے قیامت کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ مورتیاں' تصویریں اور صلیبیں تھیں' اس کے بعد انہیں اندیشہ ہوا کہ مسلمان اس کلیسا میں ان کے نماز پڑھنے کو حجت قرار دے کر کہیں عیسائیوں کو اس سے نکال باہر نہ کر دیں۔ چنانچہ ایک خاص عہد لکھ کر بطریق کو دے دیا۔ جس کی رو سے یہ کلیسا عیسائیوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا اور پابندی لگا دی گئی تھی۔ کہ ایک وقت میں صرف ایک ہی مسلمان اس میں داخل ہو سکتا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ پھر ہم دیکھ چکے ہیں کہ

> حضرت سعد بن ابی وقاص نے "ایوان کسریٰ" کو مسلمانوں کے لئے "معبد" بنا دیا تھا لیکن اس میں جو مورتیاں تھیں' انہیں ہاتھ تک نہ لگایا تھا۔ حالانکہ مدائن کی فتح اور اس ایوان کے مالک ہو جانے کے بعد اگر وہ چاہتے تو ان مورتیوں کو وہاں سے ہٹوا سکتے تھے۔ آخر حضرت عمرؓ کلیسا میں مورتیاں اور تصویریں ہونے کی بنا پر نماز پڑھتے کیوں گریز فرماتے۔ جبکہ رسول اللہ صلعم مدینہ ہجرت فرمانے سے پہلے کعبے کے قریب نماز ادا فرماتے تھے۔ جہاں بہت سی مورتیاں تھیں اور یہ مورتیاں آپ کو اور دوسرے مسلمانوں کو کعبے کے قریب نماز پڑھنے سے نہ روکتی تھیں۔ ہجرت کے سات سال بعد دو ہزار مسلمانوں کی معیت میں رسول اللہ صلعم عمرہ قضا کے لئے مکہ تشریف لائے اور بیت اللہ کا طواف فرمایا حالانکہ اس وقت تک کعبے میں بت موجود تھے۔ حضرت بلال نے کعبے کی چھت پر چڑھ کر ظہر کی اذان دی اور رسول اللہؐ نے دو ہزار مسلمانوں کے ساتھ نماز ادا فرمائی۔ آخر محمدؐ رسول اللہ اور آپ کے متبعین اس جگہ نماز کیوں نہ پڑھتے جہاں تصویریں اور مورتیاں تھیں۔ جبکہ اسلام ایمان باللہ کا دوسرا نام ہے اور جبکہ اسلام میں اعمال کا مدار نیتوں پر ہے؟"

بہرکیف! اگلے مسلمان اور صحابہ کرام اس حقیقت سے پورے باخبر تھے کہ یہ خیال عجیب ہے کہ اگر مجسمے رکھے یا بنائے گئے تو لوگ ضرور ہی ان کی پرستش کرنے لگیں گے۔ اگر فی نفسہ مجسمہ ایسی چیز ہوتی جس کی پرستش کی ہی جائے تو جہاں جو بھی مجسمہ نظر آتا اسے بت پرست پوجنے لگے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ مثلاً ہندو حضرات مجسموں کی پرستش کرتے ہیں۔ مگر ایسا نہیں کہ ان کے سامنے اسٹالن یا گرونانک یا اکبر کا مجسمہ رکھ دیا جائے تو وہ ان کی پرستش کرنے لگیں گے۔ وہ مجسموں کی پرستش کرتے بھی ہیں تو صرف اپنے دیوتاؤں کے مجسموں کی۔ یعنی ان شخصیتوں کے مجسموں کی جنہیں وہ لائق عبادت اور قابل پرستش سمجھتے اور فرض کئے ہوئے ہیں۔ کرشن جی اور حضرت موسیٰ دونوں کے مجسمے کسی بت پرست کے سامنے رکھئے۔ مجسمے کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں اور اگر مقصود محض مجسمہ پرستی ہے تو دونوں میں کوئی فرق نہیں مگر

آپ دیکھیں گے کہ وہ بت پرست' حضرت موسیٰ کے مجسمے کے سامنے نہ جھکے گا بلکہ کرشن جی مجسمے کے سامنے نذرانہ عقیدت پیش کرے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ فی نفسہ مجسمہ کوئی چیز نہیں اور نہ بت پرستی سے اس کا کوئی تعلق ہے بلکہ شخصیت کی پرستش ہوتی ہے۔ ایک ہندو ہرگز مسٹر جناح کی تصویر یا مجسمے کو خراج عبودیت پیش نہ کرے گا۔ اس لئے کہ دراصل عبودیت کا تعلق "شخصیت" سے ہے نہ کہ فی نفسہ "تصویر" یا "مجسمے" سے۔ اسی لئے آپ نے دیکھنا ہو گا کہ جب کسی ملک کے عوام اپنے کسی لیڈر کی کسی خدمت سے خوش ہوتے ہیں تو اعتراف خدمت اور اظہار محبت میں اس کی تصاویر اور مجسمے ہر جگہ لٹکاتے اور نصب کرتے ہیں۔ انہیں ہار پہناتے اور خراج عقیدت پیش کرتے اور کبھی اسی لیڈر کی کسی بات یا حرکت سے ناراض ہو جاتے ہیں تو اس کی تصاویر جلا دیتے' پھاڑ دیتے اوز اس کا مجسمہ توڑ دیتے ہیں۔ مثال کے لئے حال کی بات سنئے۔ روسی عوام اسٹالن سے جب خوش تھے تو ہر جگہ اس کی تصاویر اور مورتیاں نمایاں انداز سے رکھی اور نصب کی گئی تھی کیونکہ ان کی شخصیت ان کی نگاہ میں اس وقت قابل احترام تھی۔ مگر جس وقت اسٹالن کی پالیسی سے روسی عوام کو اختلاف ہوگیا ہے تو روس اور مشرقی جرمنی میں اسٹالن کے مجسمے ہٹائے جا رہے ہیں اور خود کیونسٹ پارٹی نے اس کی وجہ یہ ظاہر کی ہے کہ کیونسٹ پارٹی "شخصیت پرستی" کی مخالف اور "اصول پرستی" کی حامی ہے۔ خود مسلمانوں کے ملک میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ تیونس کے مسلمانوں کے نزدیک پہلے حبیب بورقیبہ کی شخصیت کوئی خاص اہمیت نہ رکھتی تھی اس لئے چند ماہ قبل تک کوئی ہنگامہ نہ تھا مگر اس وقت کہ تیونس کی آزادی میں حبیب بورقیبہ نے قابل تعریف حصہ لیا ہے تو ۲۲ مارچ ۱۹۵۶ء کی خبر ہے کہ ان کی دو لاکھ تصویریں چھاپی گئیں اور عوام نے تقریباً" ہر بڑی جگہ اور دکانوں میں انکی تصویر آویزاں کی جس کے گرد کھجور کی پتیاں لگائی تھیں۔ ہندوستان میں گاندھی جی اور نہرو جی مقبول عوام ہیں مگر جب مدراس کے لوگ ان سے بگڑے تو انہوں نے دونوں کی تمام تصاویر جلا ڈالیں اور سارے مجسمے توڑ کر پھینک دیئے۔ ان باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ فی نفسہ نہ تصویر کوئی چیز ہے اور نہ بذات مجسمہ کوئی اہمیت رکھتا ہے جس کی وجہ سے وہ اسلام میں حرام ہو بلکہ "شخصیت

پرستی" کا جذبہ حرام ہے جو انسان یا ان کی تصاویر اور مورتیوں کی پرستش کراتا ہے۔ اس لئے فی نفسہ مجسمہ سازی نہ تو گناہ ہو سکتی ہے اور نہ اس میں بت پرستی کا کوئی اندیشہ ہے۔ مجسمے کا تعلق محض فن سے ہے عقیدے سے نہیں اور دنیا میں ہر جگہ مجسمے فنی حیثیت ہی سے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی پرستش نہیں ہوا کرتی۔ پرستش کا تعلق تو دل اور دماغ سے ہے۔

جنوری ۱۹۵۵ء میں اٹلی کے سفیر نے خیرسگالی کے طور پر اٹلی کی طرف سے کراچی یونیورسٹی کو جو کتابیں پیش کی تھیں۔ ان میں سے ایک کتاب وہ بھی ہے جس میں ان تصاویر پر علمی و فنی حیثیت سے بحث کی گئی ہے جو پالیمو کے گرجے کی دیواروں پر مسلمان مصوروں نے بنائی تھیں اور جو ہنوز موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ عیسائی گرجے میں مسلمان مصوروں نے یہ تصاویر اس لئے تو بنائی نہ تھیں کہ ان کی پرستش کی جائے بلکہ یہ صرف فن کا مظاہرہ تھا اور یہ اٹلی والوں کی قدردانی فن تھی کہ ان تصاویر کے مجسمے انہوں نے اپنی مقدس عبادت گاہ نصب کی تھی۔

الحمراء فن تعمیرات کے میدان میں انسانی قوت اختراع کا ایک کرشمہ اور اندلسی مسلمانوں کا ایک بے نظیر فنی شاہکار ہے۔ اس کے ہال کے بڑے فوارے کو اس طرح بنایا گیا ہے کہ اس کا بالائی حصہ سفید سنگ مرمر کے بنے ہوئے بارہ شیروں کے کاندھے پر رکھا ہوا ہے جن کے منہ سے پانی ہر وقت نکلتا رہتا ہے۔ کیا یہ پرستش کے لئے بنایا گیا ہے؟

یا کیا اس کو دیکھ کر ان شیروں کے آگے سجدہ ریز ہو جانے کی خواہش پیدا ہونے لگتی ہے؟ بہرکیف مسلمانوں میں بحیثیت فن مجسمہ سازی کا ہمیشہ رواج رہا ہے۔ علامہ نیاز فتح پوری نے لکھا ہے کہ:

> "جب اسلام کا تمدن وسیع ہوا تو زینت قصور کے لئے تماثیل کا استعمال عام طور سے ہونے لگا اور سنگ مرمر، تانبے، رانگ اور چاندی وغیرہ کی مورتیں عجیب و غریب تفنن کے ساتھ بنائی جانے لگیں۔ چنانچہ متنبی نے مجلس ابن عمار کی ایک حسین کنیز تک کا ذکر کیا ہے جس کے بال ایک طرف لٹکتے تھے۔ ہاتھ میں پھولوں کا ہار تھا اور وہ ایک کمانی پر گردش کیا کرتی تھی۔"

علامہ سید سلیمان ندوی نے افغانستان کے "موزہ کابل" کا ذکر کیا ہے جس کے کمروں میں :۔

"ایک کمرہ قدیم تصاویر کا تھا جس میں یہاں کے بہت سے امراء اور سلاطین کی تصویریں تھیں۔ بچہ سقا کے عہد میں اس عجائب خانے کی چیزوں کو بھی صدمہ پہنچا۔ مجھے بتایا گیا کہ یہاں جو مجسمے تھے ان کو بت سمجھ کر توڑ دیا گیا۔ مجسموں کے سلسلے میں سب سے عجیب چیز بلکہ شاید اسی عجائب خانے کے ساتھ مخصوص چیز کافرستان ...... کے قدیم مذہب کے بت تھے۔"

شہر ماسکو (روس) کی گوراسٹریٹ پر :۔ ا۔ بانی ماسکو شہزادہ یوری لگارولی ۲۔ مشہور روسی شاعر "پشکن" ۳۔ یکتائے روزگار ناول نویس میکسم گورگی کے مجسمے نصب ہیں۔ اب سوچئے کہ کیا یہ مجسمے بخیال پرستش رکھے گئے ہیں؟ اور کیا مجسمے کا وجود بت پرستی کا لازم نیتجہ ہے؟ روس تو ایک لامذہب' منکر خدا اور دہریہ ملک ہے۔ وہاں ان مجسموں کی کیا حیثیت ہے؟ یورپ کے کسی شہر میں یا یورپی اقتدار والی جس سرزمین پر چلے جایئے۔ قدیم وجدید زمانے کے لاتعداد مجسمے ہر جگہ موجود اور نصب نظر آئیں گے۔ کوئین اسکوائر۔ لندن (ڈبلو۔سی نمبر۱) میں انگلستان کے مجسمہ سازوں کی ایک سوسائٹی (ROYAL SOCIETY OF BRITISH SCULPTORS") کے نام سے قائم ہے جس کی کونسل' ہر سال کومن ویلتھ کے ملکوں کے فنکار مجسمہ سازوں کو دعوت دے کر ان کے شاہکار' مقابلے کے لئے طلب کرتی ہے اور انتخاب میں امتیازی درجہ حاصل کرنے پر سراوٹوبیٹ میڈل دیتی ہے' کیا یہ بت پرستی کے لئے ہے؟ اور کیا وہ مجسمے پوجے جاتے ہیں؟ آپ دنیا کے کسی عجائب خانے میں جایئے' وہاں بے شمار مجسمے رکھے دکھائی دیں گے۔ کیا یہ تمام مجسمے پرستش کے خیال سے رکھے اور نصب کئے گئے ہیں؟ اور کیا ان مجسموں کے بنانے والوں نے انہیں پوجنے کے لئے بنایا ہے؟ مشہور کتاب میٹھے بول میں جادو ہے کا نامور مصنف ڈیل کارنیگی لکھتا ہے:۔

"تھیوڈور روز ولٹ کا کہنا ہے کہ جب وہ صدر تھا اور اسے کوئی مشکل مرحلہ پیش آ جاتا تو وہ اپنی آرام کرسی پر تکیہ لگا کر بیٹھ جاتا اور

ابراہیم لنکن کی قد آدم تصویر کی طرف دیکھا کرتا تھا جو اس کی میز کے اوپر وہائٹ ہاؤس میں آویزاں ہے اور اپنے دل سے یہ سوال کیا کرتا تھا اگر اس وقت میری جگہ لنکن ہوتا تو اس موقع پر کیا کرتا؟ وہ کس طرح اس مسئلے کو حل کرتا؟"

بتایئے کہ کیا لنکن کی یہ تصویر وہاں پرستش کے لئے ہے؟ یہ صرف اس لئے اس آویزاں کی گئی ہے کہ لنکن نے امریکہ کے صدارتی فرائض انتہائی نازک دور میں نہایت عمدگی سے انجام دیئے تھے اور بڑی ایمانداری سے کام کیا تھا۔ لہٰذا سارے صدر اس تصویر کو سامنے رکھتے ہیں تاکہ اسی کی طرح عمدگی اور ایمانداری سے اپنے فرائض انجام دیں۔ امریکہ کی سب سے بڑی عدالت سپریم کورٹ کے سامنے دنیا کے دس مشہور مقننین اور عدل گستر شخصیتوں کے مجسمے ۱۹۰۳ء میں اس لئے نصب کئے گئے تھے کہ سپریم کورٹ کے جج ان مجسموں کو سامنے دیکھ کر ان اکابر سے روحانی امداد حاصل کریں گے اور صداقت وایمانداری اور عدل وانصاف میں ان حضرات کی پیروی کریں گے۔ یہ دسوں مجسمے حسب ذیل شخصیتوں کے ہیں:۔

۱۔ حضرت موسیٰ ۲۔ حضرت محمدؐ ۳۔ کنفیوشس۔ ۴۔ زرتشت ۵۔ بھگوان منو۔ ۶۔ اسپارٹا۔ ۷۔ سولن۔ ۸۔ جستو نان۔ ۹۔ الفریڈ۔ لوئی نہم فرانس

نہ ان مجسموں کے بنانے کی غرض ان کی پرستش تھی۔ (۱۹۵۶ء میں پاکستان میں ہنگاموں کے باعث آنحضرت کا مجسمہ ہٹا دیا گیا۔ پاکستان یا دوسرے اسلامی ممالک کے مسلمانوں کو حضرت موسیٰ کے مجسمے پر کوئی اعتراض نہیں تھا لہٰذا وہ بدستور موجود ہے) نہ یہ اس لئے نصب کئے گئے ہیں کہ لوگ ان کی پرستش کریں۔ دراصل چونکہ دنیا میں ہمیشہ سے عبادت گاہوں کو سب سے زیادہ محترم ومقدس مقام سمجھا گیا ہے۔ اس لئے جن شخصیتوں کو جس وجہ سے بھی لوگ قابل احترام اور مقتدر ومحترم سمجھتے اور انہیں یاد رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے مجسمے یا تصویریں بنا یا بنوا کر اپنی عبادت گاہوں میں رکھتے ہیں۔ موجودہ تمام مذاہب کی عبادت گاہوں میں مجسموں اور تصاویر کا موجود ہونا اسی سبب سے ہے۔ قبل از اسلام اہل عرب بھی جن شخصیتوں کو قابل احترام سمجھتے تھے ان کے مجسمے اور مرقعے تیار کراتے تھے اور انہیں سب سے محترم جگہ یعنی خانہ

کعبہ میں رکھتے تھے۔ اہل یونان اور اہل مصر نے اپنے مجسموں کو حفاظت کے لئے ایک علیحدہ مکان منتخب کر رکھا تھا۔ یہ رواج عرصے سے چلا آ رہا ہے۔ پلوٹارک (وفات ۱۲۰ء) نے قدیم قوموں کے ذکر میں لکھا ہے کہ وہ اپنے تمام بڑے بادشاہوں' جرنیلوں' بہادروں اور پہلوانوں کے مجسمے اپنی اپنی عبادت گاہوں میں رکھتے تھے۔ اب فی زمانہ اس کی جگہ عجائب گھر یا نمائش گاہ ہو گئی ہے۔ یا غیر معمولی لوگوں کے مجسمے شاہراہوں یا مخصوص مقامات یا گھروں پر نصب کئے جاتے ہیں۔ اسی لئے یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ اسلام نے مجسمہ سازی کو حرام قرار دیا ہے کیونکہ اس سے بت پرستی کا اندیشہ ہے۔ بت پرستی کا تعلق مجسموں اور تصویروں سے مطلقاً نہیں کہ اسلام ان فنون لطیفہ کو حرام قرار دیتا۔ تصویر کشی اور مجسمہ سازی کا تعلق صرف فن اور صنعت سے ہے جس پر اسلام نے کسی طرح کی کوئی پابندی عائد نہیں کی بلکہ قرآن نے اس طرف واضح اشارہ کیا ہے کہ تصویر کشی و مجسمہ سازی قطعاً" جائز ہے اور مسلمانوں کو ان فنون لطیفہ میں قرار واقعی حصہ لینا چاہیے۔ قرآن اصول کی کتاب ہے اور رہنمائی کا ذمہ دار' اس لئے وہ ہر اس اصول کی طرف نشان دہی کرتا ہے جس کی انسانوں کو ضرورت ہو۔ اور اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ:۔

لیھلک من ھلک عن بینته و یحیی من حی عن بینته (انفال۔ ۵)

ترجمہ "جس کو ہلاک ہونا ہے وہ بھی دلیل سے ہلاک ہو اور جو جیتا رہے وہ بھی دلیل سے جئے۔"

میں اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں یہ واضح طور پر بتا چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی تعلیمات ہمیشہ ایک رہی ہیں۔ یعنی جو بھی پیغمبر آئے ان کی تعلیمات اصولی حیثیت سے ایک تھیں اور شریعت اللہ تعالیٰ مقرر کرتا ہے' پیغمبر نہیں۔ اب دیکھئے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ذکر میں کہا گیا ہے کہ:۔

یعلمون لہ ما یشاء من محاریب و تماثیل (سبا ۳۴۔۱۳)

ترجمہ "جنات' سلیمان کی خواہش و مرضی کے مطابق ان کے لئے بناتے تھے محاریب و تماثیل۔"

اس آیت میں حضرت سلیمان کے تماثیل بنوانے کا ذکر ہے۔ عربی زبان کے لغت کی مشہور کتاب "تاج العروس" کے نزدیک قرآن میں وارد لفظ تماثیل سے مراد انبیاء کرام کی تصویریں ہیں۔ یہی لفظ تماثیل حضرت ابراہیم کے ذکر میں آیا ہے کہ عبادت گاہ میں جب ان کے باپ اور افراد قوم اپنے باطل معبودوں کے حضور مصروف عبادت تھے۔ حضرت ابراہیم نے سوال کیا کہ:۔

ما ھذہ التماثیل التی انتم لھا عاکفون (انبیاء ۵)

ترجمہ "یہ کیسی تماثیل ہیں جس کے سامنے تم لوگ جمے بیٹھے ہو۔"

"پھر کچھ سوال وجواب کے بعد حضرت ابراہیم نے انہیں "تماثیل" کے متعلق فرمایا کہ:۔

تاللہ لا کیدن اصنامکم (انبیاء ۵)

ترجمہ "اللہ کی قسم، میں تمہارے ان اصنام کے ساتھ ایک چال چلوں گا۔"

یعنی جن چیزوں کی وہ لوگ عبادت کرتے تھے انہیں ایک جگہ "تماثیل" کہا گیا ہے اور دوسری جگہ "اصنام" ۔ اس سے ظاہر ہوا کہ "تماثیل" کا مطلب ہے "شکل" اور اگرچہ شکل کا اطلاق اس پر بھی ہوتا ہے جو کاغذ' پردہ' دیوار یا ظروف وغیرہ پر بنائی جاتی ہے اور جسے "تصویر" کہا جاتا ہے اور اس پر بھی جو پتھر شیشے اور مٹی وغیرہ سے بنائی جاتی ہے اور جسے "مورتی" یا "مجسمہ" کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اس لفظ "تماثیل" کا ترجمہ بھی دونوں جگہ یہی ہوا یا کیا گیا ہے۔ مگر درحقیقت "تماثیل" سے مراد "مجسمہ" ہی ہے۔

ہندوستان مسلمانوں میں سب سے مستند انگریزی ترجمہ قرآن علامہ عبداللہ یوسف کا سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے تماثیل کا ترجمہ (IMAGES) کیا ہے انگریز مترجمین میں پکتھال سب سے بہتر مترجم قرآن خیال کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے اس لفظ تماثیل کا ترجمہ (STATUES) کیا ہے۔ ان دونوں لفظوں کے معنی علی الترتیب تصاویر اور مجسمہ کے ہیں۔ اب زیر بحث آیت کا ترجمہ اردو میں دیکھئے :۔

ا۔ "جو کہ سلیمان علیہ السلام چاہتے' وہ جنات تیار کر دیتے ہیں۔ مثلاً" "قلعے اور مجسّے" ..... (تماثیل کہتے ہیں تصویروں کو۔ یہ تانبے کی تھیں اور

بقول قتادہ وہ مٹی اور شیشے کی تھیں) (تفسیر ابن کثیر کا اردو ترجمہ تفسیر محمدی)

۲۔ "(اور وہ جن لوگ) بناتے تھے واسطے اس سیلمان کے جو وہ چاہتا تھا قلعوں سے اور تصاویر (نقشے) محاریب جائے حرب اور علم حاصل کرنے کے واسطے کئی ایک شکلیں' انسانی ڈھانچے یا دوسرے حیوانات اور جانوروں کی جان پہچان کی تصویریں)"۔ (تفسیر بیان للناس' خواجہ احمد الدین صاحب)

۳۔ "وہ بناتے اس کے واسطے جیسا وہ چاہتا تھا قلعے اور مورتیں"۔ (عبدالحکیم خاں صاحب)

۴۔ "تو سیلمان علیہ السلام کو جو کچھ بنوانا منظور ہوتا۔ یہ جنات ان کے لئے بناتے ...... جیسے عمارتیں اور ڈھلی ہوئی مورتیں"۔ (ڈپٹی نذیر احمد صاحب)

۵۔ "بناتے اس کے واسطے جو چاہتا قلعے اور تصویریں"۔ (شاہ عبدالقادر صاحب)

۶۔ "بناتے تھے واسطے اس کے جو کچھ چاہتا تھا۔ قلعوں سے اور ہتھیاروں سے اور تصویریں"۔ (شاہ رفیع الدین صاحب)

۷۔ "وہ جنات ان کے لئے وہ چیزیں بناتے جو ان کو منظور ہوتا بڑی بڑی عمارتیں اور مورتیں"۔ (اشرف علی صاحب)

۸۔ "بناتے اس کے واسطے جو کچھ چاہتا' قلعے اور تصویریں" (محمود الحسن صاحب)

۹۔ "وہ اس کے لئے بناتے تھے جو وہ چاہتا تھا۔ قلعوں کی تعمیر' ہتھیار اور تصاویر" (حفظ الرحمٰن صاحب)

۱۰۔ "وہ جو چاہتے یہ ان کے لئے بناتے یعنی قلعے اور مجسمے" (فتح محمد خاں صاحب)

۱۱۔ "سلیمان کو جو بنوانا منظور ہوتا۔ یہ جنات ان کے لئے بناتے تھے جیسے مسجدیں' محل' قلعے اور فرشتے' انبیاء کی تصویریں" (فرمان علی صاحب)

۱۲۔ "سلیمان کے لئے جیسا وہ چاہتا جن محرابیں اور مورتیں بناتے تھے" (احسان اللہ عباسی صاحب)

۱۳۔ "اس کے لئے بناتے جو وہ چاہتا' اونچے اونچے محل اور تصویریں" (احمد رضا خاں صاحب)

۱۴۔ "وہ اس کے لئے جو وہ چاہتا تھا' بناتے تھے یعنی مسجدیں اور مجسمے" (محمد علی صاحب لاہوری)

۱۵۔ وہ جو کچھ چاہتا تھا جن (یعنی سرکش قوموں کے سردار) اس کے لئے بناتے تھے۔ یعنی مساجد اور ڈھلے ہوئے مجسمے" (مرزا بشیرالدین محمود احمد صاحب)

۱۶۔ "وہ سلیمان کے لئے جو وہ چاہتے تھے' بناتے تھے۔ قلعہ اور صورتیں" (مرزا حیرت صاحب)

۱۷۔ "بناتے تھے جینان واسطے سلیمان کے جس چیز کو چاہتے تھے۔ وہ خانہ ہائے خوب سے اور صورتوں سے" (عطارد الزمان بیگم)

۱۸۔ "وہ جنات بناتے تھے۔ سلیمان کے لئے جو وہ چاہتے تھے۔ قلعے اور مورتیں" (عاشق الہی صاحب)

۱۹۔ "اس کے لئے بناتے جو وہ چاہتا اونچے اونچے محل اور تصویریں" (احمد رضا خاں صاحب)

۲۰۔ "(وہ وحشی قبائل) اس کے لئے وہ تمام چیزیں بناتے تھے جو وہ چاہتا تھا (مثلاً) بڑی بڑی عمارتیں اور تصویریں" (غلام احمد پرویز صاحب)

یہ بیس ترجمے ہیں جن میں سے "تماثیل" کا ترجمہ بعض نے "تصویریں" لکھا ہے' بعض نے صورتیں' بعض نے "مورتیں" اور بعض نے "مجسمے" اسی طرح "محاریب" کا ترجمہ بعض نے "قلعے" کیا' بعض نے "محل"' بعض نے "مسجدیں" اور بعض نے "عمارتیں"۔ "تماثیل" جمع ہے۔ "تمثال" کی۔ اور "تمثال" صورت کو کہتے ہیں۔ جب جبرائیل حضرت مریم کو بیٹا عطا کرنے گئے تو انہوں نے ایک مرد کامل کی

صورت اختیار کیا۔

فتمثل لھا بشرا سویا (مریم۔ ۲)

ترجمہ "سو وہ اس کے پاس مرد کامل کی صورت میں ظاہر ہوا"

اس کا مادہ "مثل" ہے جس کے معنی "اس جیسا" کے ہیں۔ قرآن کے منزل من اللہ ہونے پر کافروں نے شک کیا تو دلیل یہ پیش کی گئی کہ:۔

فا تو بسورہ من مثلہ (بقرہ۔ ۳)

ترجمہ "تو پھر اس جیسی کوئی ایک صورت ہی لے آ"

لہٰذا "تماثیل" کی معنی ہیں، تصویر، صورت، مورتی، مجسمہ اور اسٹیچو۔ اسی طرح "محاریب" سے بعضوں نے مراد عبادت گاہ" لیا ہے۔ یہ بھی نادرست نہیں کیونکہ اگلے زمانے میں بالعموم عبادت گاہوں میں مقدس حضرات کے مجسمے اور محترم لوگوں کی تصاویر رکھی جاتی تھیں:۔

ا۔ حضرت جریرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا ذو حلفہ یمن میں خشعم اور قبیلہ بجیلہ کا بنایا ہوا ایک مکان تھا۔ وہاں بہت سے بت تھے جن کی عبادت کی جاتی تھی" (روایت نمبر ۱۴۲۰۔ تجرید البخاری صفحہ ۳۲۹)

۲۔ "حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ ام حبیبہؓ اور ام سلمہؓ نے حضورؐ سے ایک گرجے کا تذکرہ کیا جس میں تصویریں تھیں اور حبش میں دونوں نے اسے دیکھا تھا۔ آپ نے فرمایا، ان لوگوں میں جب کوئی نیک آدمی مرجاتا تھا تو اس کی قبر پر مسجد بنا لیتے تھے۔ اور یہ تصویریں وہاں بناتے تھے" (روایت نمبر ۲۴۳ تجرید البخاری صفحہ ۱۸)

۳۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ جب مکہ تشریف لائے تو کعبے میں داخل ہونے سے انکار کر دیا کیونکہ وہاں بت موجود تھے .... حضرت ابراہیم واسماعیل کی تصاویر بھی وہاں موجود تھیں" روایت نمبر ۷۷۳ تجرید البخاری ص ۱۶۵)

۴۔ خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت تھے۔ یہ کل پتھر کی مورتیں نہ تھیں کہ اتنی تعداد تو کعبے کی وسعت میں سما بھی نہیں سکتی تھی۔ بلکہ ان میں ایک خاصی تعداد اور رنگین تصاویر کی تھی۔ دیواروں پر بزرگوں اور دیوتاؤں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں"

(ارض القرآن جلد نمبر ۲ صفحہ نمبر ۱۸۷)

"پاپائے رومتہ الکبریٰ کے مقتدیوں (رومن کیتھولک) کے یہاں دستور ہے کہ اپنے راہبوں اور اولیاؤں کی تصویریں، گرجاؤں میں بطور تبرک کے لٹکا دیتے ہیں اور .... ان تصویروں کے نیچے بتیاں اس نیت سے جلاتے ہیں کہ ان کی روشنی ان کے چہروں کو منور کر دے اور وہ اور بھی پر عظمت و رونق نظر آئیں" (تذکرہ علامہ مشرقی ص ۲۷۱)

۶۔ شہر قطانیہ .... میں یونانی علم الاصنام میں جن رومیوں کے نام آتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کے نام پر عبادت گاہیں قائم تھیں جن میں ان کے مجسمے رکھے تھے" (تاریخ صقلیہ جلد نمبر ۲ ص ۱۴۷)

بادشاہوں کے درباروں یا خاص کمروں میں بھی مذہبی وغیرمذہبی اکابر کی تصویریں ہوتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ فرمان علی صاحب نے حضرت سلیمان کی تماثیل کے سلسلے میں حاشیے میں وضاحت کی ہے کہ یہ تماثیل:۔

فرشتے اور انبیاء

کی تھیں۔ فتح محمد خاں صاحب نے بھی حاشیہ میں لکھا ہے کہ:۔

"حضرت سلیمان کی .... یہ مورتیاں انبیاء اور صلحاء اور علماء اور ملائکہ کی ہوتی تھیں جو مساجد و معابد میں رکھی جاتی تھیں اور مقصود یہ ہوتا تھا کہ ان کو دیکھ کر لوگوں کے دلوں میں عبادت کا زیادہ شوق ہو"

حضرت سلیمان علیہ السلام پیغمبر تھے اور ان کی شریعت کوئی انوکھی نہ تھی۔ کیونکہ "شریعت" پیغمبر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ متعین کرتا ہے اس لئے اصولی طور پر تمام پیغمبر صرف ایک ہی پیغام لائے۔ آنحضرتؐ سے کہا جاتا ہے:۔

ا۔ انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح والنبین من بعدہ واوحینا الی ابراہیم واسمعیل واسحاق ویعقوب والاسباط وعیسی وایوب ویونس وھرون وسلیمن (نساء ۱۶۳)

ترجمہ "ہم نے تم پر جو کچھ وحی کیا ہے وہی کچھ ہم نے نوح علیہ السلام اور ان

کے بعد کے نبیوں پر وحی کیا تھا اور وہی کچھ وحی کیا تھا ابراہیم اور اسمٰعیل علیہ السلام اور اسحٰق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام آل یعقوب علیہ السلام اور عیسیٰؑ اور ایوب علیہ السلام اور یونس علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام پر"

۲۔ یا یھا الرسل .... ان ھذہ امتکم امۃ واحدہ (مومنون۔۴)

ترجمہ "اے پیغمبرو .... یہ ہے تمہارا طریقہ کہ وہ ایک ہی طریقہ ہے"

۳۔ سنۃ من قد ارسلنا قبلک من رسلنا و لا تجد لسنتنا تحویلا (بنی اسرائیل۔۸)

ترجمہ "ہم تم سے پہلے جس قدر پیغمبر بھیج چکے ہیں ان سب کا معاملہ میں ہماری سنت ایک ہی رہی ہے اور تم میری سنت میں کبھی کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے"

ان آیات سے ظاہر ہے کہ "شریعت" ہمیشہ ایک رہی ہے۔ البتہ اس شریعت کو نافذ کرنے والی' مختلف دور اور حلقے میں شخصیتیں مختلف ہوئی ہیں۔ اس لئے جہاں تک اصول کا تعلق ہے۔ ان تمام پیغمبروں کی تعلیمات اور عمل میں کوئی فرق نہیں۔ معراج کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ تمام پیغمبروں نے حضرت محمدؐ کے پیچھے نماز پڑھی تھی۔ یعنی حضور اکرمؐ امام تھے اور باقی سب پیغمبر مقتدی۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس سے بڑھ کر اور ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ تمام پیغمبروں کی شریعت ایک تھی ورنہ تمام پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح آنحضرتؐ کے پیچھے کیونکر نماز پڑھتے؟ حضرت مخدوم الملک بہاری نے بھی اپنے چھبیسویں خط میں فرمایا تھا۔

"اس بارے میں سب انبیاء برابر ہیں۔ سبھوں کی ایک پکار ہے۔ سب کا ایک ہی دین ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے حضرت محمد مصطفیٰ کے عہد تک کل نبیوں کی خدائی باتوں میں کوئی فرق نہیں"

قرآن نے بھی مسلمانوں کو یہی سمجھنے اور کہنے کی تاکید کی ہے کہ:۔

لا نفرق بین احد من رسلہ۔ (بقرہ۔۴۰)

ترجمہ "ہم خدا کے رسولوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے"۔

لا نفرق بین احد منھم (بقرہ ۱۶۔ آل عمران۔۹)

ترجمہ "ہم ان پیغمبروں میں سے کسی کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے"۔

اب غور فرمایئے کہ جب شریعت اللہ تعالیٰ مقرر کرتا ہے اور کسی چیز کو ہمیشہ کے لئے حلال وحرام کرنے کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ حضرت سلیمان پیغمبر تھے اور ان کے تماثیل یعنی مجسمے بنوانے کا خود اللہ تعالیٰ بطور خاص مسلمانوں سے ذکر کرتا ہے تو کیا اس کا صاف اور واضح مطلب یہ نہیں کہ اس میں ضرور کوئی مصلحت ہے؟ یقیناً اس میں کوئی نکتہ ہے؟ لاریب اس میں کوئی اشارہ ہے۔ بلاشبہ اس میں ہمیں کچھ سکھایا اور سمجھایا جا رہا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس بطور خاص ذکر سے ہمیں یہی اشارہ کرنا مقصود ہے کہ تصویر کشی ومجسمہ سازی ایک اہم آرٹ ہے۔ یہ ایک ضروری فن ہے یہ ایک پیغمبر کی سنت ہے۔ یہ ایک وقیع صنعت وحرفت ہے۔ جس پر مسلمانوں کو بطور خاص توجہ کرنی چاہیے۔ ہمیں اس فن میں وہی کمال حاصل کرنا چاہیے۔ جو عہد سلیمانی میں ان کے اہل دربار کو حاصل تھا۔ تمام لوگ بلااستثنا" اس حقیقت پر متفق ہیں کہ قرآن' حضرات انبیاء کرام یا اقوام وملل کے قصص میں صرف انہیں اجزاء کو لیتا اور بیان کرتا ہے جو استدلال واستشہاد' نصائح ونتائج' نظائر وامثال اور موعظت وہدایت کے کسی نہ کسی اعتبار سے نہایت ضروری اور بہت اہم ہیں۔ خود قرآن نے بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

ولقد انزلنا الیکم ایت مبینت ومثلا من الذین خلوا من قبلکم وموعظتہ للمتقین (نور۔۴)

ترجمہ "اور ہم نے تم لوگوں کے پاس کھلی آیات بھیجی ہیں اور جو لوگ تم سے پہلے گزر چکے ہیں ان کے بعض قصے بھی اور نصیحتیں تقویٰ شعاروں کے لئے۔"

علامہ عبدالرزاق ملیح آبادی نے "ذکر آزاد" کے نام سے جو کتاب لکھی ہے۔ اس میں صفحہ نمبر۲۲۵ پر لکھتے ہیں:۔

"ایک عبرت انگیز واقعہ سنئے! مولانا محمد سورتی مرحوم کھرے اہلحدیث

تھے۔ مرحوم مولانا محمد علی کو ہندوستان ابھی بھولا نہیں۔ آکسفورڈ کا یہ گریجویٹ' یوروپین فیشن کا یہ پیکر آخر میں بڑا دیندار بن گیا تھا۔ واڑھی بھی رکھی لی تھی' جبہ پہنتا تھا۔ مگر فنون لطیفہ سے کیونکر بیگانہ ہو جاتا؟ ایک دن مولانا سورتی' مولانا محمد علی کے کمرے میں جاتے ہیں۔ دیواروں پر مشہور مصوروں کے شاہکار دیکھتے ہیں اور آؤ دیکھتے ہیں نہ تاؤ' لٹھ اٹھا لیتے ہیں اور آرٹ کے بہترین نمونوں کو برباد کر ڈالتے ہیں۔

مولانا سورتی نے جو کچھ کیا' ایمانی جذبہ وجوش سے کیا ہو گا مگر یہ ظاہر پرستی اور تنگ دلی تھی۔ وہ بھول گئے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص نے جب مدائن فتح کیا ور کسریٰ کے محل میں واخل ہوئے تو محل تصویروں اور اسٹیچوں سے بھرا پڑا ہے۔ حضرت سعد نے یہ نہیں کیا کہ محل کو ان چیزوں سے خالی کرا دیا ہو بلکہ تصویروں اور اسٹیچوں کے جھرمٹ میں رب العلمین کے حضور میں جھک گئے اور سجدہ شکر بجالائے۔

اور مولانا سورتی کو یہ فنی دولت تباہ کرتے وقت نہ حضرت سلیمان یاد آئے' نہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے آرٹ کے مجسمے اور اسٹیچو قرآن میں خدا کی وہ نعمتیں مذکور ہوئی ہیں جو حضرت سلیمان پر ارزانی کی گئی تھیں:۔

یعملون لہ ما یشاء من محاریب وتماثیل وجفان کالجواب وقدور رٰسیت اعملوا ال داؤد شکرا وقلیل من عبادی الشکور

۔ (سورہ سبا رکوع۔ ۲)

ترجمہ "وہ سلیمان علیہ السلام کے لئے وہ سب چیزیں بناتے جسے وہ چاہتے تھے۔ بڑی بڑی عمارتیں مورتیں اور لگن ایسے بڑے جیسے حوض اور بڑی بڑی دیگیں۔ جو ایک ہی جگہ جمی رہیں اے خاندان داؤد تم سب شکریہ میں نیک کام کرو اور میرے بندوں میں شکر گزار کم ہی ہوتے ہیں"۔

یہی علامہ ملیح آبادی کے نزدیک آرٹ کے نمونے' فنی دولت ہیں۔ اسی لئے حضرت سلیمان علیہ السلام کو شاندار مجسمے اور فنی اعلیٰ نمونے تیار کرنے پر اللہ کا شکر ادا

کرنے کو کہا گیا اور حضرت سعد ابن وقاص کا عمل' اسلامی تعلیم کے اظہار کے لئے اس سے زیادہ مستند اور قابل اعتبار ہے جو بناوٹی روایتوں کے بل پر ہمارے سامنے پیش کی جاتی ہے۔

یعنی احکام اور اگلوں کے بعض قصے ہماری نصیحت کے لئے ہمارے پاس بھیجے گئے ہیں۔ تفریحاً" نہیں۔ اس کے لئے یہ ماننا ناگزیر ہے کہ حضرت سلیمان کے قصے میں جب ان کی سنت بطور خاص مذکور اور بیان ہوئی ہے کہ وہ "تماثیل" (تصاویر اور مجسمے) بنوایا کرتے تھے تو استدلال واستشہاد کی حیثیت سے یقیناً" یہ بطور موعظت وہدایت ہے۔ ہدایت کے معنی کیا ہیں؟ راہ دکھانا۔ کیا راہ دکھانے کا مطلب صرف عبادت گاہ کی راہ دکھانا ہے؟ اور صنعت گاہ کی نہیں؟ رہنمائی کے لئے صرف دین کی شرط تو ہے نہیں؟ قرآن دین کا دستور العمل بن کے تو آیا نہیں۔ جب وہ ہماری دنیوی زندگی کا دستور العمل بن کے آیا ہے تو وہ ہماری دینی اور دنیوی زندگی دونوں کے لئے ہادی اور رہنما ہونا چاہیے۔ قرآن کو "دستور العمل" کہا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ "عمل" کا تعلق زندگی سے ہے اور زندگی سے مراد یہی "دنیوی زندگی" ہے نہ کہ "دینی زندگی"۔ اس لئے ہماری دنیوی زندگی کا وہ "دستور العمل" ہے۔ مرنے کے بعد کا تو وہ دستور العمل ہے نہیں۔ پھر جب قرآن ہمارا' زندگی کے ہر شعبے اور حیات کے ہر مسئلے میں ہادی اور رہنما ہے تو اس کا یہ بیان کرنا کہ سلیمان صنعت کاروں سے اپنی مرضی کے مطابق اور مجسمے بنوایا کرتے تھے' یقیناً اس بات کا اشارہ کرتا ہے کہ مسلمان یعنی قرآن کو ماننے والے اس فن پر خاص توجہ کریں۔ کسی ناخدا شناس کے تصاویر اور مجسمے بنوانے کا ذکر کیا جاتا تو سمجھا جاتا کہ یہ ممانعت وعبرت کے لئے ہے۔ جیسے سامری کے گوسالہ بنانے اور لوگوں کے سامنے اسے پرستش کے لئے پیش کرنے کا قصہ۔ مگر جب یہ ایک پیغمبر کے تصاویر اور مجسمے بنوانے کا ذکر ہے تو مقصد واضح ہے کہ اس خصوصیت سلیمانی کا ذکر مسلمانوں سے اس لئے کیا گیا کہ وہ بھی تصویر کشی' مجسمہ سازی اور تعمیرات ومصنوعات کے فنون میں مہارت تامہ حاصل کریں۔ بنی اسرائیل کے پیغمبر حضرت موسیٰ کے ذکر میں ذبح بقرہ کے لئے جانور کی چند خصوصیات بتائی گئی ہیں کہ وہ کیسا ہو؟ مگر مسلمانوں کے یہاں بھی قربانی کے جانوروں میں وہ خصوصیات مدنظر رکھی جاتی ہیں اور جب کہا جاتا ہے کہ

مسلمانوں کے لئے حج کے موقع پر قربانی کا جہاں ذکر آیا ہے۔ وہاں تو جانور کی یہ خصوصیات مذکور نہیں کہ مسلمان ان کا لحاظ کریں۔ بلکہ یہ تو صرف بنی اسرائیل کی مخصوص قربانی کے لئے نشانیاں تھیں تو جواباً" دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ وہ ذکر قرآن میں خواہ مخواہ اور فضول تو کیا نہیں گیا بلکہ اسی غرض سے ذکر کیا گیا ہے کہ مسلمان بھی جب کوئی جانور قربان کریں تو وہ ان خصوصیات کا لحاظ کریں۔ ڈاڑھی کے سلسلے میں جب کہا جاتا ہے کہ قرآن میں تو مسلمانوں کو ڈاڑھی رکھنے کا کوئی حکم موجود نہیں؟ تو کہا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کے پیغمبر حضرت ہارون علیہ السلام کی ڈاڑھی حضرت موسیٰ نے پکڑ کر انہیں تنبیہہ کی تھی۔ اس کا ذکر قرآن میں فضول نہیں ہوا:

"چونکہ ہم کو انبیاء کے اقتدا کرنے کا حکم کیا گیا ہے ... اس لئے ہم کو بھی اس امر' ایک مشت میں ان کا اقتدا کرنا ہو گا"۔ (اعفاء اللحیہ ص ۸)

ظاہر ہے کہ جب بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر کے ذکر میں قربانی کے جانور کی خصوصیات بیان ہو جانے سے مسلمانوں کو بھی اپنی قربانیوں کے وقت جانور میں ان خصوصیات کا لحاظ کرنا ہو گا کیونکہ وہ فضول بیان نہیں ہوئی ہیں۔ یا بنی اسرائیل کے دوسرے پیغمبر کے ذکر میں ان کی ڈاڑھی کے پکڑے جانے کے بیان سے مسلمانوں کو ایک مشت کی ڈاڑھی رکھنی ہو گی کیونکہ اس کا ذکر فضول نہیں کیا گیا تو بنی اسرائیل ہی کے تیسرے پیغمبر کے بیان میں ان کی تصاویر اور مجسمے بنوانے کے ذکر سے مسلمانوں پر یہ کیوں لازم نہیں آتا کہ وہ تصاویر اور مجسمے بنانے اور بنوانے میں لازما حصہ لیں اور اس فن میں وہ قرار واقعی اور کامل دستگاہ حاصل کریں؟

"محترم جناب مودودی صاحب نے "حلال وحرام" پر تبصرہ فرماتے ہوئے کہا ہے کہ:۔

"قرآن مجید میں حضرت سلیمان کے لئے جن "تماثیل" کے بنائے جانے کا ذکر ہے ان میں پالوی صاحب نے تصاویر' انسانی مجسمے یا جانداروں کے مجسمے لئے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید میں ایسی کوئی تصریح موجود نہیں کہ تماثیل سے مراد بے جان اشیاء یا مناظر کی تصاویر نہ لی جائیں اور خواہ مخواہ انہیں جانداروں کے مجسمے ہی سمجھا جائے۔ بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ

جانداروں ہی کے مجسمے تھے تب بھی علمائے اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ زندگی کے جن معاملات کے بارے میں خدا کی آخری کتاب اور اس کے آخری رسول کی سنت میں واضح احکام آ گئے ہیں' ان معاملات میں سابق شرائع ہمارے لئے حجت نہیں ہیں۔ تصویر اور مجسمے کے بارے میں چونکہ سنت محمدیہ میں صریح احکام موجود ہیں اس لئے ایسے معاملے میں سابق شریعت سے کسی مجمل اور ذومعنی جز سے استناد کیسے صحیح قرار دیا جا سکتا ہے؟"

غور فرمایئے' سب سے پہلے تو آپ کا کہنا ہے کہ "تماثیل سے مراد بے جان اشیاء کی تصاویر ہیں۔ معلوم ہوتا ہے مودودی صاحب نے قرآن کے مترجموں کے وہ ترجمے نہیں دیکھے جن میں "تماثیل" کا ترجمہ "مجسمہ" کیا گیا ہے۔ یا پھر "مجسمہ" کے معنی وہ نہیں جانتے اور دیگ اور لگن کو "مجسمہ" سمجھتے ہیں یا پھر انہوں نے پوری کتاب پڑھی ہی نہیں جس میں "تماثیل" کو "اصنام" ثابت کیا گیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر حضرت سلیمان علیہ السلام نے تصاویر بنوائی تھیں یا مجسمے ڈھلوائے تھے تو یہ سابق شریعت تھی جو ہم پر حجت نہیں اس لئے کہ خدا کے آخری رسول کی شریعت میں تصویر کشی و مجسمہ سازی حرام و ناجائز قرار پا چکی ہے۔ گویا ان کے نزدیک حضرت سلیمان علیہ السلام کی شریعت اور تھی اور حضرت محمدؐ کی شریعت اور؟

حالانکہ قرآن میں شریعت بنانے والے اللہ تعالیٰ کا فرمانا ہے کہ:۔

شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحا والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ ابراھیم وموسے وعیسی۔ (شوریٰ۔۲)

ترجمہ "دین میں اس نے وہی شریعت تم لوگوں کے لئے مقرر کی ہے جس کا اس نے نوح علیہ السلام کو حکم دیا تھا اور جو تم پر وحی کی ہے اور جس کا ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام اور عیسی علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا"۔

یعنی اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ شریعت میں سابق اور موجودہ کوئی چیز نہیں۔ ایک ہی

شریعت ہمیشہ کارفرما رہی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام سے حضرت محمدؐ تک۔ مگر مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ جی نہیں شریعت دو تھی۔ ایک وہ جو سابق پیغمبروں کی تھی جس کی ہم پر کوئی پابندی نہیں اور آنحضرتؐ کی شریعت دوسری تھی جس کے ہم لوگ پابند ہیں۔ مودودی صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس پر علماء اسلام کا اتفاق ہے"۔ حالانکہ علامہ سیلمان ندوی کا دعویٰ ہے کہ:۔

"اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ دین الٰہی ایک ہی ہے جو آدم علیہ السلام سے محمد رسول اللہ صلعم تک یکساں پیغمبروں کے ذریعہ بھیجا جاتا رہا اور قرآن پاک میں جو کچھ ہے وہی اگلی کتابوں میں بھی تھا"۔

(مضامین سید سیلمان ندوی حصہ اول صفحہ نمبر ۲۴۳)

قرآن نے تو حضرت نوح علیہ السلام سے آنحضرت تک کی شریعت ایک ہی بتائی تھی اور ندوی صاحب کا دعویٰ ہے کہ جی نہیں بلکہ حضرت آدم سے حضرت محمدؐ تک شریعت ایک ہی تھی۔ یہ عجیب تماشا ہے کہ ایک طرف تو یہ حضرات فرماتے ہیں کہ اسلام ملت ابراہیمی ہے اور قرآن بھی اسی تصور کا حامی ہے' وہ کہتا ہے کہ:۔

ملتہ ابیکم ابراھیم۔ (حج۔ ۱۰)

ترجمہ "تمہاری ملت وہی ہے جو تمہارے باپ ابراہیم کی تھی"۔

دوسری جانب یہی حضرات یہ بھی فرماتے ہیں کہ ابراہیم کے ایک بیٹے حضرت سیلمان علیہ السلام کی شریعت کچھ اور تھی اور دوسرے بیٹے محمد رسول اللہؐ کی شریعت دوسری ہے۔ اس سے بھی زیادہ پرلطف دعویٰ یہ ہے کہ علماء اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے"۔ حالانکہ "علماء" اور "اتفاق" دو ایسے لفظ ہیں جن کا باہم ملنا آج تک دیکھا ہی نہیں گیا۔

بقول سرخیل علماء حضرت ابوالکلام آزاد:۔

"فساق وفجار تو خرابات میں بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کی تندرستی کا جام صحت پیتے ہیں' چور اور ڈاکو بھی مل جل کر رہزنی کرتے ہیں مگر یہ گروہ خدا کی مسجد اور زہد وعبادت کے صومعہ وخانقاہ میں بیٹھ کر بھی

متحد یک دل نہیں ہو سکتا اور ہمیشہ ایک دوسرے کو درندوں کی طرح چیرتا پھاڑتا اور مارتا رہتا ہے۔ میکدوں میں محبت واتفاق کے ترانے اور پیار والفت کی باتیں سننے میں آ جاتی ہیں۔ مگر عین محراب مسجد کے نیچے پیشوائی وامامت کے لئے ان میں سے ہر ہاتھ۔ دوسرے کی گردن پر بڑھتا اور خونخواری کی ہر آنکھ دوسرے بھائی کے خون پر لگی ہوتی ہے"۔ (تذکرہ صفحہ نمبر۱۰۳' ۱۰۴)

سن لیا کہ "علماء کے اتفاق" کا کیا حال ہے؟ اور یہ قول کسی عامی کا نہیں بلکہ علماء اسلام کے سرخیل کا ہے۔ مودودی صاحب کا دعویٰ ہے کہ علماء اسلام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ سابق شریعت کچھ اور تھی اور آنحضرتؐ کی شریعت کچھ اور۔ یہ تو بڑی بات ہے۔ ساری دنیا کا مشاہدہ ہے کہ معمولی سے معمولی دینی مسئلے اور اسلامی امر پر بھی " علماء" باہم متفق نہیں۔ مثلاً" ۱۹۵۳ء میں پاکستان کے اندر جو مسلمانوں کے مابین فسادات ہوئے تھے ان کی تحقیقات کے لئے حکومت پاکستان نے ایک تحقیقاتی کمیٹی بنائی تھی۔ اس کمیٹی کے صدر جسٹس منیر تھے۔ اس کمیٹی نے سارے فرقوں کے اکابر علماء کو بحیثیت گواہ شہادت میں طلب کیا تھا۔ اور منجملہ دیگر سوالات کے سب سے پوچھا تھا کہ بتایئے "اسلام کیا ہے"؟ اور مسلمان کسے کہتے ہیں؟" غور فرمایئے یہ کس قدر معمولی اور ابتدائی سوال تھا مگر ان "اکابر علماء اسلام" نے جو کچھ اس سوال کا جواب دیا اور اس کے بارے میں جو رپورٹ میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا اندازہ ذیل کے چند اقتباسات سے لگایئے۔ جسٹس منیر نے لکھا ہے کہ:۔

ا۔ "یہ امر موجب ہزار تاسف تھا کہ وہ علماء جن کا سب سے پہلا فریضہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ ان معمولی بنیادی سوالات کو طے کریں۔ وہ ان سوالوں کے جوابات میں بری طرح ایک دوسرے کے خلاف ہیں"۔

۲۔ "ان فاضل علماء میں سے کوئی دو بھی اس اصولی مسئلہ کے جواب میں باہم متفق نہیں ہیں۔ اگر ہم اپنی طرف سے "مسلمان کی کوئی تعریف پیش کریں اور وہ تعریف ان فرمودات سے مختلف ہو تو ہم فوراً" دائرہ اسلام سے خارج سمجھے جائیں گے اور اگر ہم ان علماء کی بیان کردہ تعریف میں سے

کسی ایک کو صحیح تسلیم کر لیں تو ہم صرف اسی عالم کے نزدیک مسلمان ٹھہریں گے اور باقی تمام کے نزدیک "کافر" قرار پا جائیں گے"۔

۳۔ اگر ہمارے علماء کے ذہن میں اس قدر سیدھے سے سوالوں کے متعلق بھی ایسا انتشار ہے تو زیادہ پیچیدہ مسائل کے متعلق ان میں جو اختلافات ہو سکتے ہیں۔ اس کا اندازہ خود لگایا جا سکتا ہے"۔

غور فرمایئے۔ یہ "علماء" ہیں۔ دین کے ٹھیکیدار بنے ہوئے ہیں کہ اسلام کی بات صرف ہم سے پوچھو' مگر یہ اتنا بھی نہیں بتا سکتے کہ "اسلام کیا ہے؟ اور مسلمان کسے کہتے ہیں؟" پھر یہ اور کچھ کیا جانیں گے۔ لطف کی بات یہ بھی سنتے ہی چلئے کہ ان شاہد اور گواہی دینے والے علماء کرام میں ہمارے یہ مودودی صاحب بھی تھے۔ جو فرما رہے ہیں کہ اس امر پر علماء اسلام کا اتفاق ہے کہ حضرت سلیمان کی شریعت دوسری تھی اور اس کی ہم پر پابندی نہیں' اور حضرت محمدؐ کی شریعت دوسری تھی جس کی پابندی ہم پر فرض ہے اور پابندی یہ ہے کہ "شریعت اسلامیہ" اور "سنت محمدیہ" میں تصویر ناجائز ہے۔ پھر اس سے بھی زیادہ باکیف یہ خبر ساعت فرمایئے کہ قولاً" شریعت سلیمانی کی عدم پیروی اور شریعت محمدیہ میں تصویر کی حرمت کے دعویدار مودودی صاحب' وہ ہیں جو عملاً" تصویر کی حرمت کے قائل نہیں۔ علامہ شاہ جعفر صاحب ندوی پھلواروی نے جو پہلے مودودی صاحب کی "جماعت اسلامی" کے ایک ممبر اور مودودی صاحب کے قوت بازو تھے۔ "اپنے مضمون" اسلام اور مصوری میں کہا ہے کہ:۔

"مولانا عبدالحامد بدایونی' مولانا احتشام الحق' مولانا مودودی' مولانا داؤد غزنوی' مولانا عبدالماجد دریابادی وغیرہ کے فوٹو ہم نے بارہا دیکھے ہیں اور ان کو دیکھنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ باقاعدہ اتروائی گئی ہیں اور کسی دھوکے یا مجبوری کو اس میں دخل نہیں۔" (ثقافت لاہور مارچ ۱۹۶۰ء صفحہ ۳۰)

نہ صرف اتنا بلکہ صفحہ نمبر ۲۷ میں انہوں نے لکھا ہے کہ:۔

"آج جن زندہ حضرات کے فوٹو ہم نے دیکھے ہیں ان میں سے ایک محترم دوست کا فتویٰ تو یہ ہے کہ فوٹو ناجائز ہے۔ پھر اپنا فوٹو بھی کھچوایا جب

لوگوں نے اعتراض کیا تو فرمایا کہ میری لاعلمی میں فوٹو لیا گیا ہے (حالانکہ اس کا پوز بتا رہا ہے کہ یہ شوق سے کھچوایا گیا ہے) اس کے بعد اپنے ماہنامے کے "رسائل ومسائل" میں لکھتے ہیں کہ فلموں سے بہت سے مفید کام بھی لئے جا سکتے ہیں"۔

دیکھا آپ نے؟ یہ ہیں "علماء" جن کا قول کچھ ہوتا ہے اور "عمل" کچھ۔ آپ کو علماء کے اس رویہ کی اور بھی مثال ملے گی اور ظلم یہ ہے کہ یہ حضرات پیغمبروں کے افعال کو بھی جھٹلانے میں پس وپیش نہیں کرتے۔ سوچئے تو اگر تصویر کشی ومجسمہ سازی واقعی ناجائز اور خدائی حکم کے خلاف ہے تو کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی پیغمبر بھی ناجائز فعل کا مرتکب ہو؟ حضرت سیلمان علیہ السلام پیغمبر تھے۔ ان کی شریعت وہی تھی جو حضرت محمدؐ کی۔ کیونکہ دونوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد اور ملت ابراہیمی کے پابند تھے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ شریعت سیلمانی میں تو تصویر ناجائز ہو مگر شریعت محمدیہ میں ناجائز؟ بھلا جب قرآن میں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی سازی کے ذکر سے کشتی سازی' سنت پیغمبری اور حجت ہو جاتی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بکریاں چرانے اور مزدوری کرنے سے شبانی اور مزدوری سنت پیغمبری اور حجت ہو جاتی ہے اور جب حضرت داؤد کے زرہ بنانے کے ذکر سے حراوی سنت پیغمبری اور حجت ہو جاتی ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت سیلمان علیہ السلام کی تصویر کشی ومجسمہ سازی کیوں سنت پیغمبر اور حجت نہیں ہو سکتی؟ اور کس طرح اور پیغمبروں کا فعل تو مسلمانوں کے لئے قابل عمل اور حلال وجائز بن جاتا ہے لیکن حضرت سیلمان علیہ السلام کا فعل ناقابل تقلید اور ناجائز ہو جاتا ہے؟ اگر ایک مشت ڈاڑھی سنت ہارونی ہے تو تصویر کشی ومجسمہ سازی سنت سیلمانی ہے۔ اگر مسلمان خواب کی تعبیر بیان کرنے میں دستگاہ حاصل کر سکتے ہیں اور بیان کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ سنت یوسفی ہے تو وہ تصاویر اور مجسمے کیوں نہیں کھینچ اور بنا سکتے۔ جب وہ سنت سیلمانی ہے؟ اور وہ گانا کیوں نہیں گا سکتے جب وہ سنت داؤدی ہے؟

افتومنون ببعض الکتب وتکفرون ببعض۔ (بقرہ۔۱۰)

ترجمہ "کیا تم لوگ قرآن کے کچھ حصے کا تو اقرار کرتے ہو اور کچھ کا

انکار کرتے ہو؟"

اگر مسلمان گھوڑے کی تصویر بنائیں تو ناجائز مگر برق کی تصویر جائز؟ پرندوں میں سے طوطا' مینا کی تصاویر تو حرام مگر سورہ فاتحہ کا طغریٰ' جانوروں کی شکل میں حلال؟" الارشاد جدید" (کراچی) کی اشاعت مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۵۵ء میں ایک کھلی چھٹی بنام مدیر رسالہ شائع ہوئی ہے جس میں ہے کہ:۔

"قادیانی اخبار میں کسی نے فتوے کا جواب قرآن سے یہ لکھا پایا کہ سلیمان جنوں اور دیوازوں سے تصویر بنایا کرتے تھے ..... یہ انکی قرآنی ترجمے میں تحریف تھی کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے تذکرے میں' جب وہ جنات سے کام لیتے تھے تصویر نہیں بلکہ جنگی اور ملکی ضروریات کے نقشے ہوتے تھے۔ دیکھو تفسیر ثنائی" اگر "تماثیل" کے معنی "جنگی اور ملکی ضروریات کے نقشے" ہی ہیں تو کیا قوم ابراہیم بیٹھی ہوئی "جنگی اور ملکی ضروریات کے نقشے دیکھ اور پڑھ رہی تھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال کیا تھا کہ:۔

ما ھذہ التما ثیل التی انتم لھا عا کفون قالو وجدنا اباءنا لھا عا بدین قال لقد کنتم أنتم وا باوکم فی ضلل مبین۔ (انبیاء۔۵)

ترجمہ "یہ کیسی تماثیل ہیں جن پر تم لوگ جمے بیٹھے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ان کی پرستش کرتے دیکھا ہے "ابراہیم نے کہا" تو بیشک تم بھی اور تمہارے آباؤ اجداد بھی' سب کے سب صریح گمراہی میں ہو"۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم نے فرمایا کہ:۔

تاللہ لا کیدن اصنامکم۔ (انبیاء۔۵)

ترجمہ "اللہ کی قسم میں تمہارے ان اصنام سے ایک چال چلوں گا"۔

یہی لفظ "اصنام" وہاں استعمال ہوا ہے جہاں بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے کے بعد ایک بت پرست قوم پر گزر ہونے کا ذکر ہے:۔

فاتوا علی قوم یعکفون علی اصنام لھم۔ (اعراف)

ترجمہ "سو ان کا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جو اپنے چند اصنام پر جمی بیٹھی تھی"۔

غور فرمایئے، یہ قوم اپنے "اصنام" پر عاکف جمی بیٹھی تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اس قوم سے جو اپنے "تماثیل" پر عاکف تھی۔ فرمایا تھا کہ میں تمہارے ان "اصنام" سے ایک چال چلوں گا اور انہیں ایک دن موقع پا کر انہیں پاش پاش کر دیا تھا۔ کس طرح؟

فجعلھم جذاذا۔ (انبیاء۔۵)

ترجمہ "سو انہوں نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا"۔

یہ ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی کیا صورت کیا ہوئی؟"

فراغ علیھم ضربا بالیمین۔ (والصٰفٰت۔۳)

ترجمہ "وہ ان پر پوری قوت سے جا پڑے اور ضربیں لگانے لگے"۔

مولوی ثناء اللہ صاحب یہ سمجھیں کہ یہ "نقشے" تھے اور مودودی صاحب کی سمجھ میں یہ نہ آئے تو نہ آئے کہ یہ "جانداروں کے مجسمے ہی تھے"۔ مگر اس سے ساری دنیا کے لوگ یہی سمجھیں گے کہ یہ مٹی یا پتھر کی مورتیاں تھیں اور "جانداروں کے مجسمے" تھے۔ جن کو حضرت ابراہیم نے ضرب لگا کر توڑا تھا اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر منتشر ہو گئے نیز جب لفظ "تماثیل" محاریب (عمارتیں) اور جفان (لگن) وغیرہ کی ٹھوس شکل کی مجسم مصنوعات کے ساتھ استعمال ہوا ہے تو اس سے مراد "مجسمہ" ہی ہو سکتا ہے اور "مجسمہ" جانداروں اور صرف جانداروں کی مورتیوں اور شکلوں کو کہتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ بتوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک جگہ "اصنام" کہا تھا اور دوسری جگہ تماثیل"۔ حضرت سلیمان کے ذکر میں آیا ہے۔ پھر "تماثیل" کے معنی:

"جنگی اور ملکی ضروریات کے نقشے" یا بے جانوں کی تصاویر"۔

کیونکر ہو سکتے ہیں؟ قرآن کا لغت' قرآن کی تفسیر اور قرآن کی شرح خود قرآن ہے۔ عجمیوں کے لکھے ہوئے لغات' مصریوں کی لکھی ہوئی تفاسیر اور ہندیوں کی شروح' قرآن کے لئے سندوحجت نہیں قرار دی جا سکتیں۔ حضرت سیلمان علیہ السلام کی بنائی ہوئی "تماثیل" کا تھوڑا بہت اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے:

ا۔ سیلمان علیہ السلام نے حیرام کو کہلا بھیجا.... سو دیکھ خداوند اپنے خدا کے نام کے لئے ایک گھر بنانے کا میرا ارادہ ہے۔ جیسا خداوند نے میرے باپ داؤد سے کہا تھا کہ تیرا بیٹا.... میرے نام کے لئے گھر بنائے گا"۔

(توراۃ' سلاطین اول' باب نمبر۵ آیات ا-۵)

۲۔ "اور اس نے پیتل کی دس کرسیاں بنائیں .... حاشیوں پر جو پٹڑوں کے درمیان تھے۔ شیرہ اور بیل اور کروبی بنے تھے"۔

(باب ۷ آیات ۲۷ یا ۲۹)

۳ ۔ "اور حاشیوں پر اس نے کروبیوں اور شیروں اور کھجور کے درختوں کو ہر ایک کی جگہ کے مطابق کندہ کیا.... اور اس نے پیتل کے دس حوض بنائے۔ ہر ایک حوض میں چالیس بت کی سمائی تھی .... پس حیرام نے وہ سب کام' جسے وہ سیلمان بادشاہ کی خاطر خداوند کے گھر میں بنا رہا تھا' تمام کیا"۔

(باب ۷ آیات ۳۶ تا ۴۰)

معلوم نہیں کہ اور کس کس نوعیت کی "تماثیل" حضرت سیلمان علیہ السلام نے بنوائی تھیں کیونکہ:

اور سلیمان کا باقی حال' اور سب کچھ جو اس نے کیا اور اس کی حکمت جو کیا' وہ سیلمان کے اصول کی کتاب میں درج نہیں"۔

(سلاطین اول باب ۱۱ آیت ۱۴)

بہرکیف' فرمان علی صاحب اور فتح محمد خاں صاحب کا بھی یہ کہنا کہ حضرت سیلمان انبیاء وغیرہ کی تصاویر اور مجسمے بنواتے تھے۔ محض قیاسی نہیں' علامہ حفظ الرحمٰن

سیوہاروی نے اپنی کتاب "بلاغ مبین" کے ۱۲۰٬۱۲۱ پر مشہور محدث ابن جوزی کے حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے۔

ابن جوزی چھٹی صدی ہجری (وفات ۵۹۷ھ ۱۲۰۰ء) کے بڑے مشہور و معروف واعظ خطیب' مورخ' محدث اور فقیہہ ہوئے ہیں۔ روایت کی جرح و تعدیل میں نہایت سخت تھے اور مالکی فقہ کی اثبات میں روایات پر بہت جرح کی ہے۔ امام غزالیؒ تک کی پیش کردہ روایات کو بھی معاف نہیں کیا ہے۔ چونکہ روایات کو بڑی جرح قدح کے بعد اور کم ہی مانتے تھے۔ اس لئے اہل حدیث حضرات ان سے خوش نہیں اور انہیں اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ چنانچہ رسالہ "اہلحدیث نمبر" میں صفحہ نمبر۱۰۶ پر ان کو "منکرین حدیث کا امام ابن جوزی"۔ کے نام و لقب سے یاد کیا گیا ہے' لہٰذا جب ابن جوزی کے سے متشدد کسی روایت کو صحیح مان لیں تو اس کا درجہ مسلم ہو جاتا ہے۔ پھر یہ روایت بھی دحیہ کلبی کی ہے اور یہ وہ بزرگ ہیں جن کے بارے میں اہل روایت کا فرمانا ہے ، کہ جب جبرائیل انسانی شکل میں وحی لاتے تھے تو زیادہ تر دحیہ کلبی ہی کی صورت میں آتے تھے۔ علامہ عبدالقیوم ندوی اپنی کتاب "قرآن اور اس کی تعلیمات" کی جلد نمبر۳ ص ۸۴ میں وحی آنے کی چھ صورتیں بتاتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"حضرت جبرائیلؑ انسانی شکل میں تشریف لاتے اور حکم پہنچا جاتے"۔ (یہاں اس مخمصے میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ جبرئیلؑ جب قلب رسول پر وحی پہنچاتے تھے تو انسانی شکل کر کے وحی پہنچانے کی کیا بات ہوئی؟ :۔)

یہ سب سے آسان تر صورت تھی۔ اور اکثر و بیشتر حضرت دحیہ کلبی کی صورت میں حضرت جبرئیلؑ تشریف لاتے تھے"۔

سیرۃ الصحابیات کے ص ۵۹ پر بھی اس بات کا ذکر کیا گیا ہے۔ "صحیح بخاری" میں بھی اس کا ذکر ہے۔

"اسامہ بن زیدؓ کہتے ہیں کہ حضرت جبرئیل' رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ کے پاس حضرت ام سلمہؓ بیٹھی تھیں۔ جبرئیل آپؐ سے باتیں کرنے لگے اور اس کے بعد کھڑے ہو گئے۔ حضرت نے ام سلمہ سے پوچھا۔ "یہ کون تھے؟" ام سلمہؓ نے کہا کہ "یہ دحیہ کلبی تھے"۔ ام سلمہ کا

بیان ہے کہ خدا کی قسم! میں ان کو وحیہ کلبی ہی سمجھ رہی تھی یہاں تک کہ میں نے نبیؐ کا خطبہ سنا کہ آپ جبرئیلؑ سے روایت کر رہے تھے"۔

(روایت نمبر ۱۴۵۷ تجرید البخاری ص ۲۸۶)

انہیں حضرت وحیہ کلبی کو ۷ھ ۶۲۹ء میں' رسول اللہ نے اپنا سفیر بنا کر ہرقل (قیصر روم' کے پاس بھیجا تھا۔ اس سفارت کا واقعہ انہوں نے یہ بیان کیا ہے۔

"جب قیصر روم نے اپنی قوم کے عمائد کو اسلام کی دعوت قبول کرنے میں تنفر پایا تو مجلس برخاست کر دی اور دوسرے دن مجھ کو ایک علیحدہ عالی شان محل میں بلایا۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ مکان کے چار جانبین تین سو تیرہ تصاویر لگی ہیں۔ قیصر نے مجھ کو مخاطب کر کے کہا۔

"یہ کل تصاویر' جو تم دیکھتے ہو' نبیوں اور رسولوں کی ہیں۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس میں تمہارے صاحب کی شبیہ کون سی ہے؟"

میں نے بغور دیکھ کر ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا کہ "یہ شبیہہ! بادشاہ نے کہا۔

"بے شک یہی آخری نبی کی شبیہہ ہے"۔

قیصر نے پھر دریافت کیا کہ۔

"اس تصویر کے داہنی طرف کس کی شبیہ ہے؟"

میں نے جواب دیا کہ "یہ نبی آخر الزماں کے ایک رفیق ابوبکرؓ کی شبیہہ ہے"۔ بائیں جانب یہ کس کی شبیہہ ہے' میں نے کہا اس نبی کے دوسرے رفیق عمر بن خطابؓ کی شبیہہ ہے۔ قیصر نے یہ سن کر کہا کہ۔

"توراۃ" کی پیشین گوئی کے مطابق یہی وہ دو شخص ہیں جن کے ہاتھوں اس دین کی ترقی معراج کمال کو پہنچے گی"۔

میں جب سفارت کو انجام دے کر خدمت نبویؐ میں حاضر ہوا تو یہ سارا قصہ آپ کو سنایا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ۔

"قیصر نے سچ کہا۔ واقعی اس دین کی ترقی انہیں دو شخصوں کے ہاتھوں کمال تک پہنچے گی"۔

اس روایت کو "بلاغ مبین" میں نقل اور پیش کرنے کے بعد علامہ حفظ الرحمٰن صاحب نے لکھا ہے کہ۔

"ابن جوزی کی یہ روایت بے اصل نہیں کہی جا سکتی"۔

اب آپ ان فروعات کو تو نظرانداز کیجئے کہ۔

(ا) اس روایت میں پیغمبروں کی تعداد تین سو تیرہ بتائی گئی ہے۔ حالانکہ مشہور ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر ہوئے ہیں۔ اور قرآن نے تعداد بتائی ہی نہیں تو ان میں بھی کوئی تعداد مذکور نہیں۔

(۲) اگر یہ تین سو تیرہ ان پیغمبروں کی تعداد ہے جو بنی اسرائیل کے تھے تو ان میں آنحضرتؐ کیونکر آگئے؟

(۳) ہرقل نے کہا کہ "؟یہ کل تصاویر' جو تم دیکھتے ہو' نبیوں اور رسولوں کی ہیں"۔ مگر انہیں تین سو تیرہ تصاویر میں حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کی بھی تصویریں شامل تھیں۔ حالانکہ یہ پیغمبر نہیں۔

(۴) ہرقل نے کہا کہ "توراۃ" کی پیشین گوئی کے مطابق یہی وہ دو شخص ہیں جن کے ہاتھوں اس دین کی ترقی معراج کمال کو پہنچے گی"۔ حالانکہ "توراۃ" موجود ہے اور اسمیں ابوبکرؓ اور عمرؓ اور ان کے ہاتھوں دین اسلام کی ترقی کا کیا ذکر' اس میں تو آنحضرت کا بھی نام موجود نہیں ورنہ یہود ان کا انکار کس طرح کرتے؟

اصل چیز اس روایت میں دیکھنے کی یہ ہے کہ اس روایت سے ایک طرف تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہرقل کے عہد تک پیغمبروں کی تصاویر بنوانے کا رواج تھا۔ اس لئے حضرات علامہ فرمان علی و فتح محمد خاں کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان نے انبیاء کی تصاویر بنوئی تھیں کیونکہ وہ صرف نبی ہی نہیں بلکہ بادشاہ بھی تھے۔ اور دوسری جانب مسلمانوں کے لئے تصاویر و تماثیل جائز قرار پاتی ہیں کیونکہ۔

(ا) اس روایت کے راوی حضرت وحیہ کلبی ہیں اور یہ وہ محترم بزرگ ہیں جو رسول اللہ کے صحابی اور سفیر رہے ہیں اور زیادہ تر حضرت جبرئیل انہیں کی شکل میں آتے اور وحی لاتے تھے۔

(۲) اس روایت کو ابن جوزی کے سے متشدد محدث نے بھی صحیح مانا اور علامہ حفظ الرحمٰن کے سے مقتدر مصنف نے بھی درست تسلیم کیا ہے۔

(۳) اس روایت میں تین سو تیرہ پیغمبروں کی تصاویر کا ذکر ہے۔ خود رسول اللہؐ اور ان کے دو مکرم اصحاب کی تصاویر کا ذکر ہے اور ایک معزز صحابی کے ان تصاویر کو دیکھنے کا ذکر ہے۔

(۴) اس روایت کو خود رسولؐ اللہ نے سماعت فرما کر تصدیق کی کہ ہرقل نے درست کہا ہے اور یہ نہ فرمایا کہ تصاویر بنانا یا بنوانا غلط ہے۔ یا انبیاء کی تصاویر بنانا یا بنوانا حرام ہے۔

بہر کیف اب جبکہ یہ بات ثابت ہو چکی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام انبیاء کے بھی مجسمے یا ان کی تصاویر یا غیر انبیاء کے تماثیل بنواتے تھے۔ اور قرآن میں تصویر کشی و مجسمہ سازی کی کوئی ممانعت نہیں تو پھر کون سی وجہ ہو سکتی ہے کہ تصویر کشی و مجسمہ سازی کو اسلام میں حرام یا ناجائز یا ممنوع بتایا جائے؟ "صحیح بخاری" میں دو روایتیں ہیں:۔

۱۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ حضورؐ نے ایک منقش چادر اوڑھ کر نماز پڑھی اور نماز میں نقوش کو ایک دفعہ دیکھا۔ جب فارغ ہوئے تو فرمایا "اس چادر کو ابو جہم کے پاس لے جاؤ اور ایک بے نقش چادر لے آؤ۔ ان نقوش نے مجھے اس وقت نماز سے غافل کر دیا۔"

۲۔ انسؓ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کے پاس ایک پردہ تھا جس کو آپؓ نے اپنے مکان کے ایک طرف لگا دیا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا: اپنا یہ پردہ میرے سامنے سے ہٹا دو۔ نماز میں اس کی تصویریں میرے سامنے آتی ہیں"۔

(روایت ۲۳۷، ۲۳۸ تجرید البخاری ۸۲)

۳۔ آپ نے ایک مرتبہ ایسی چادر دوسرے کو تحفہ بھی دی تھی۔ "ام خالد کہتی ہیں کہ میں ایام طفولیت میں حبشہ سے آئی رسول اللہ نے مجھ کو ایک چادر عنایت کی جس میں نقوش تھے اور آپ اس کے نقوش پر ہاتھ

پھیر کر فرماتے جاتے تھے کہ اچھی ہے اچھی ہے"

(روایت ۱۵۲۵ تجرید البخاری)

ان روایتیں سے نہ تو ثابت ہوتا ہے کہ چادر اور پردے پر جانداروں کی تصاویر تھیں اور نہ یہ کہ آپؐ نے تصویر کے اسلام میں ناجائز ہونے کی وجہ سے انہیں بدلوایا اور ہٹوایا تھا بلکہ ان روایتوں ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں منقش چادروں اور مصور پردوں کا عموماً رواج تھا۔ اور یہ کہ یہ دونوں مصور چیزیں پہلے سے رسول اللہ کی گھر میں موجود چلی آتی تھیں۔ البتہ جب ایک دن عین حالت نماز میں نظر ان نقوش تصاویر پر چلی گئی جو چادر پر تھیں تو آپؐ نے انہیں بدلوا دیا۔ آپؐ کے الفاظ ہیں۔ "ان نقوش نے مجھے اس وقت نماز سے غافل کر دیا۔" اور جب چند روز ایسا ہوا کہ نماز میں نگاہ پردے پر برابر چلی گئی تو بالآخر آپ نے اس پردے کو بالکل ہی ہٹوا دیا۔ آپؐ کے الفاظ ہیں۔ "نماز میں اس کی تصویریں میرے سامنے آتی ہیں" اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ حالت نماز میں توجہ کے منتشر ہونے کے خیال سے رسول اللہ نے وہ تصویر دار پردہ ہٹانے کو کہا تھا۔ خیالات، توجہ اور انہماک کو انتشار سے بچانے کے لئے تصویر کو سامنے نہ رہنے دینا کوئی ایسی چیز نہیں جس کا تعلق دین سے ہو۔ آنحضرت صلعم سے پانچ سو برس پہلے کا مشہور یونانی مصنف پلوٹارک (وفات ۱۲۰ء) اپنی شہرہ آفاق کتاب "السیر" کی پہلی جلد میں آٹھویں صدی قبل مسیح (آنحضرتؐ سے چودہ سو برس پہلے) کی فرمانروائے اسپارٹا "لکرگس" کے ذکر میں لکھتا ہے:

"اسپارٹا میں کوئی ایوان مجلس یا دوسری عمارت نہ تھی اور آرائش وزیبائش کو لکرگس اس قدر غیر مفید سمجھتا تھا کہ تصاویر یا مورتیں یا چھتوں کے نقش ونگار، جو یونانیوں سے عام طور پر رائج تھے۔ اس کے نزدیک توجہ کو منتشر کرنے والے اور اس لئے غور وبحث میں خلل ڈالنے والے تھے۔ چنانچہ اس کے عہد میں قومی جلسے کھلے میدانوں میں ہوتے تھے"

(مشاہیر یونان "وروما" جلد ا ص ۱۳۴)

پھر جب ایک عامی لکرگس نے تصاویر والی عمارت کو مقننین کے لئے اس بنا پر ناپسند کیا تھا کہ ان کی توجہ ان کی تصاویر کی طرف منعطف ہو جایا کرے گی اور لوگ

قوانین پر پوری فکر اور توجہ صرف نہ کر سکیں گے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز وعبادت کے وقت تصویر دار پردہ ہٹانے کو کہنا کیا تعجب خیز ہے؟ آج بھی لوگ اس خیال کے موجود ہیں۔ ہندوستان میں حکومت کے نزدیک ایک منصوبہ زیر غور ہے کہ موہن جوداڑو سے گاندھی جی کے عہد تک کی ہندوستانی تاریخ اور کلچر کو پارلیمنٹ ہاؤس کی دیواروں پر تصاویر کی شکل میں پیش کیا جائے۔ اسکیم یہ ہے کہ یہ تین ادوار پر منقسم ہوں۔

۱۔ راجپوتوں کے عہد کی تصاویر جن کا پس منظر آثار قدیمہ سے ماخوذ ہو گا۔

۲۔ مغلوں اور اسلامی عہد کی تصاویر جن کا پس منظر مختلف ہو گا۔ مثلاً" فیروز شاہ تغلق کی تصویر میں کوٹلہ فیروز شاہ کو پس منظر کے طور پر پیش کیا جائے گا۔ شیر شاہ کی تصویر کا پس منظر پرانے قلعے کا پھاٹک ہو گا۔

۳۔ برطانوی عہد کی تصاویر جن میں حیدر علی' رنجیت سنگھ وغیرہ کی تصاویر مختلف پس منظر پر پیش ہوں گی۔

یہ منصوبہ زیر غور ہے مگر بعض اکابر ارکان پارلیمنٹ ہاؤس میں اس منظر کشی کے خلاف ہیں۔ انکا کہنا ہے کہ ممبر جو قانون سازی کے لئے جمع ہوں گے۔ قانون کی نزاکتوں کے بجائے ان مناظر کی نزاکتوں میں ذہن ودماغ مصروف رکھیں گے۔ اس لئے پارلیمنٹ ہاؤس کی دیواریں سادہ رکھی جائیں۔ اب اگر دنیا کے سب سے بڑے مدبر' مفکر' مقنن اور سب سے اعلیٰ فطرت شناس' معلم انسانیت اور خدا پرست' ہمارے محمد رسول اللہ نے نماز کے وقت توجہ' انہماک' استغراق اور محویت کو انتشار سے بچانے کے لئے تصویر دار پردہ ہٹانے کو کہا تو اس کے معنی یہ کہاں ہوئے کہ اسلام میں فی نفسہ تصویر ہی حرام ہو گئی؟ "مسند احمد بن حنبل" میں ایک روایت ہے کہ ایک دن آنحضرت نے حضرت عثمانؓ کو بلایا اور فرمایا کہ:۔

"میں نے بھیڑ کے سینگ بیت اللہ میں داخلے کے وقت اندر دیکھے تھے اور مجھے یاد نہ رہا کہ میں تمہیں ان کو ڈھانکنے کو کہوں۔ جاؤ انہیں ڈھک دو۔ بیت اللہ میں کوئی ایسی چیز نہ ہونی چاہیے۔ جو نمازی کو اپنی طرف متوجہ

بھرے"

(تفسیر ابن کثیر بسلسلہ سورہ والصفت)

اگر تصویر دار پردے کو نماز کے وقت حضورؐ نے ہٹانے کے لئے فرمایا تھا اس لئے کہ تصاویر حرام ہے۔ تو بھیڑ کے سینگ تو حرام نہیں کہ رسول اللہؐ نے انہیں ڈھک دینے کو کہا؟ آخری جملہ کہ:۔

"کوئی ایسی چیز نہ ہونی چاہیے جو نمازی کو اپنی طرف متوجہ کرے"

خود معاملہ صاف کئے دیتا ہے کہ وہاں تصویر دار پردہ اور یہاں بھیڑ کے سینگ محض اس لئے ہٹانے اور ڈھک دینے کو فرمایا تھا کہ وہ نماز کے وقت استغراق و محویت میں خلل انداز ہوں۔ بھلا خدا کے اس برگزیدہ نبی اور فطرت انسانی کے اس سب سے بڑے رازداں سے زیادہ کون جان سکتا تھا کہ بت پرستی کا تعلق تصویر سے نہیں بلکہ تصور سے ہے۔ محض کسی تصویر یا مجسمے یا مورتی کا وجود یا اس کے سامنے رہنا کوئی چیز نہیں۔ البتہ اس "شخصیت" کی الوہیت کا تصور باطل ہے جس کی وہ تصویر یا مجسمہ ہے۔ صاحب تصویر یا صاحب تمثیل کو معبود (الٰہ) تصور کرنا غلط ہے۔ حضور اکرمؐ کے جدامجد حضرت ابراہیم نے اپنے باپ اور اکابر قوم سے پوچھا تھا۔

ما ھذہ التماثیل التی انتم لھا عاکفون۔ (انبیاء۔۵)

ترجمہ "یہ کیسی مورتیاں ہیں جن پر تم لوگ جمے بیٹھے ہو؟

اگر فی نفسہ مجسمے یا مورتیاں یا تصاویر کا سامنے رہنا حرام' ناجائز اور غلط ہوتا تو حضرت ابراہیم کے الفاظ یہ نہ ہوتے بلکہ (شاید) وہ فرماتے کہ:۔

"تم لوگ تصاویر اور مجسموں کے سامنے نہ بیٹھا کرو"

مگر یہ نہ فرمایا بلکہ جن تماثیل کے سامنے وہ بیٹھے اور جھکے ہوئے تھے۔ انکے متعلق لوگوں کا تصور اور ان کی نیتیں جاننے کے لئے دریافت فرمایا تھا کہ:۔

"یہ کیسی مورتیاں ہیں جن کے سامنے تم جمے بیٹھے ہو؟"

چنانچہ ان لوگوں نے جو کچھ جواب دیا اس میں انہوں نے بھی اپنے

اس تصور ہی کو ظاہر کیا جو انہوں نے ان تماثیل کے متعلق قائم کر رکھا تھا۔ کہا۔

وجدنا اباءنا لها عابدین۔ (انبیاء۔۵)

ترجمہ "ہم نے اپنے آباؤاجداد کو ان کی پرستش کرتے دیکھا تھا"

اس سوال وجواب نے ظاہر کر دیا کہ معاملہ "تصویر" کا نہیں بلکہ "تصور" کا تھا۔ وہ لوگ اپنے جن اکابرین یا اجرام یا عناصر کی الوہیت کے قائل تھے ان کی عبادت کے لئے' انکی مورتیوں کے سامنے بیٹھے تھے۔ چونکہ یہ تصور باطل تھا اسی لئے حضرت ابراہیم نے فرمایا تھا کہ:۔

لقد کنتم انتم وا باو کم فی ضلل مبین۔ (انبیاء۔۵)

ترجمہ "جب تم بھی اور تمہارے آباؤ اجداد بھی سب کے سب صریح گمراہی میں مبتلا ہو"

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کا اعتراض "تصویر" پر نہیں بلکہ "تصور" پر تھا۔ ان کی قوم یہ تصور رکھتی تھی کہ یہ مورتیاں' قاضی الحاجات' نفع وضرر پہنچانے والی غیبی امور سے باخبر' صاحب اختیار' حیات وموت کی ضامن اور سزاوار عبادت شخصیتوں کی ہیں۔ اس لئے اہم ہیں۔ چنانچہ آپ کے اس جواب پر جب لوگوں کو سخت حیرت ہوئی کہ:۔

اجئتنا بالحق ام انت من اللعبین۔ (انبیاء۔۵)

ترجمہ "کیا واقعی ایسا ہے تم سنجیدگی سے یہ کہ رہے ہو؟ یا مذاق کر رہے ہو؟"

تو آپ نے ان کے اس تصور کی اصلاح کی اور فرمایا کہ:۔

ربکم رب السموت والارض الذی فطرھن۔ (انبیاء۔۵)

ترجمہ "تمہارا پروردگار تو وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے اور جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے"

مگر ان کا اطمینان نہ ہوا۔ اس لئے یہ دکھا دینے کی غرض سے جن اشخاص و اجرام کے مجسموں کو یہ لوگ پروردگار، صاحب اقتدار، لائق عبادت، نجات دہندہ اور بھلائی برائی کا اختیار رکھنے والے سمجھتے ہیں وہ اس قدر مجبور و بے بس اور لاچار و بے بس ہیں کہ نہ اپنی حفاظت کر سکتے ہیں اور نہ اپنے قاتلوں کا پتا نشان تک بتا سکتے ہیں ان مورتیوں کو ایک دن موقع پاکر توڑ پھوڑ دیا تھا۔

سومناتھ کا مشہور مندر نویں صدی میں بنا تھا اور چونکہ تصور کی کبھی اصلاح نہ ہوئی یا نہ کی گئی۔ اس لئے اس مندر کی تباہی و بربادی سے بھی صورت حال میں کبھی کوئی فرق نہ آیا۔ بیرونی حملوں سے کئی بار یہ مندر برباد ہوا مگر حالات کے سازگار ہونے پر پھر وہ بدستور قائم ہو گیا۔ چودھویں صدی میں جب تباہ ہوا تو حالات کے پیش نظر ہندوؤں نے اسے علیٰ حالہ چھوڑ دیا تھا مگر اس سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اگرچہ مندر برباد ہو چکا تھا اور اس میں کئی کئی مورتیاں ناپید ہو چکی تھیں لیکن تصور بدلا نہ تھا۔ اس لئے کئی سو برس کے بعد پھر وہ مندر قائم ہو گیا اور ۲۲ مئی ۱۹۵۱ء کو خود صدر جمہوریہ ہند نے وہاں جاکر لنگم نصب کرنے کی رسم ادا کی اور تیس لاکھ روپے اس کی تعمیر کے لئے جمع کر لئے گئے۔ اب سوچئے کہ محض بت کو توڑ دینے سے کیا ہوا؟ ایک گیا تو دوسرا آ گیا۔ اس لئے تصویر کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اصل چیز تصور ہے جس کی اصلاح ہونی چاہیے۔

حضرت ابراہیم نے وہ مورتیاں اس لئے نہ توڑی تھیں کہ نہ یہ مورتیاں رہیں گی اور نہ لوگ ان کی عبادت کریں گے۔ اگر ایسا ممکن ہوتا کہ محض ان مورتیوں کو توڑ دینے یا ہٹا دینے سے لوگوں کی اصلاح ہو جاتی تو حضرت ابراہیم سوال وجواب سے پہلے ہی کسی دن ایسا کر ڈالتے۔ دراصل حضرت ابراہیم نے ان مورتیوں کو توڑ کر ان کے تصور کی یوں اصلاح کی تھی کہ لوگ انہیں اس حالت میں دیکھ کر سمجھیں اور سوچیں کہ جن لوگوں کی مورتیوں کو یا انہیں جن کی یہ مورتیاں ہیں وہ اپنے اچھے برے کے مالک ومختار سمجھتے ہیں۔ اس قدر عاجز و درماندہ ہیں کہ وہ اپنے دشمنوں کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ چہ جائیکہ دوستوں کو کچھ فائدہ پہنچائیں گے۔ قرآن نے اپنے اولین مخاطب اہل مکہ سے سوال کیا تھا کہ:۔

افرء یتم اللات والعزی ومناۃ۔ (نجم۔۱)

ترجمہ "کیا تم نے لات' عزی اور مناۃ کے حال میں غور کیا ہے؟"

کیا آپ نے غور کر کے یہ سمجھا ہے کہ یہ واہمہ کی مظہر شکلیں تھیں؟ یا یہ دیویاں یوں ہی تصور کر لی گئی تھیں؟ جی نہیں۔ یہ کبھی عہد قدیم کی باجبروت شخصیتیں رہی تھیں جن کی عظمتوں کی بنا پر لوگ ان کی الوہیت کے قائل چلے آتے تھے اور ان کے مر جانے کے باوجود انہیں اب تک صاحب اختیار و کارساز گردانتے تھے۔ انہیں موت کے بعد بھی بارگاہ الہی میں مقبول و مستجاب سمجھ کر خدا کے نزدیک اپنا شفیع وسفارشی قرار دیتے تھے۔ جس طرح آج ہم لوگ خود بہت سے متوفی بزرگوں کو زندہ وجاوید وبااختیار مان کر ان سے رجوع کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کے وسیلے سے ہم درگاہ خداوندی تک اپنی معروضات پہنچا اور منوا سکیں گے۔ چونکہ وہ شخصیتیں اس وقت موجود نہ تھیں۔ لہذا لوگوں نے ان کے مجسمے بنا لئے تھے۔ جو درحقیقت ان شخصیتوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ آپ اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔ آنحضرت صلعم کے دادا "عبدالمطلب" کہلاتے تھے۔ دراصل ان کا نام "عامر" تھا۔ یہ اپنے والد ہاشم کے انتقال کے بعد بچپن ہی میں اپنی ناہنال یثرب چلے گئے تھے۔ جب کچھ سیانے ہوئے تو ان کے چچا مطلب ان کو جا کر مکہ لے آئے اور پرورش کرنے لگے۔ جس وجہ سے لوگ "عبدالمطلب" (مطلب کا غلام) کہنے لگے۔ آپ اسی سے اندازہ کیجئے اور سمجھئے کہ لات' عزی اور مناۃ بھی کبھی زندہ حقیقتیں رہی تھیں جن کے محسوس مظہر بنا کے بخیال پرستش رکھے گئے تھے' چونکہ اسلام جلد آ گیا اس لئے "مطلب" کو جان لیا گیا۔ ورنہ کچھ عرصہ کے بعد لات ومنات اور عزی کی طرح مطلب بھی مسجود عرب بن جاتے اور کوئی نہ جانتا کہ ان کا عہد کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اسلام آیا تو اس نے اعلان کیا کہ:۔

یا ایھا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم۔
(بقرہ۔۳)

ترجمہ "اے لوگو! عبادت اختیار کرو اپنے پروردگار کی۔ جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو پیدا کیا تھا جو پہلے گزر چکے ہیں"

یہ آخری ٹکڑا ہی ثابت کرتا ہے کہ جن کی عبادت کی جاتی تھی وہ قدیم

شخصیتیں رہی تھیں جو ہماری ہی طرح معمولی مخلوق تھیں مگر لوگوں کی عقیدت نے انہیں خدا اور معبود بنا ڈالا تھا۔ انہیں یہ بات باربار سمجھائی گئی کہ وہ سب محض انسان تھے اور اب جب کہ وہ مرچکے ہیں' ذرہ برابر کوئی اختیار نہیں رکھتے اس لئے ان کو نہ پکارو ان سے مدد نہ چاہو۔ ان کی پرستش نہ کرو' وہ بیکار و بے مصرف ہیں:

ا۔ واتخذوا من دونہ الھۃً لا یخلقون شیاء وھم یخلقون ولا یملکون لانفسھم ضراو لا نفعا ولا یملکون موتا ولا حیوۃ ولا نشورا۔ (فرقان۔۱)

ترجمہ "اور لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر جن کو معبود بنا لیا ہے وہ تو کچھ پیدا نہیں کر سکتے بلکہ وہ خود پیدا کئے گئے ہیں۔ اور خود اپنی ذات کے لئے بھی وہ نہ کسی نقصان کا کوئی اختیار رکھتے ہیں۔ اور نہ نفع کا۔ وہ نہ تو موت ہی پر کوئی قدرت رکھتے ہیں نہ زندگی نہ مر کے ودبارہ جی اٹھنے کا"

۲۔ والذین یدعون من دون اللہ لا یخلقون شیئا وھم یخلقون اموات غیر احیاء۔ (نحل۔۲۰)

ترجمہ "خدا کو چھوڑ کر جن کی یہ لوگ پرستش کرتے ہیں' وہ تو کسی چیز کو پیدا کر نہیں سکتے بلکہ وہ تو خود مخلوق ہیں اور مردہ ہیں زندہ بھی نہیں"۔

۳۔ والذین تدعون من دونہ ما یملکون من قطمیر ○ ان تدعوھم لا یسمعوا دعاء کم ولو سمعوا ما استجابوا لکم و یوم القیمۃ یکفرون بشرککم۔ (فاطر۔۱۳۔۱۴)

ترجمہ "اور اللہ کے سوا جن کو تم پکارتے ہو وہ تو کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے برابر بھی کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ اگر تم ان کو پکارو تو وہ تمہاری سن نہیں سکتے۔ سنیں تو تمہارا کہا نہیں مان سکتے اور قیامت کے دن تو وہ تمہارے شرک کے سخت مخالف ہی ہوں گے"۔

ان آیتوں پر غور فرمایئے کہ کیا یہ فی نفسہ ان مجسموں سے متعلق ہیں جن کی اہل عرب پہلے پرستش کرتے تھے؟ یا ہندو آج پوجا کرتے ہیں؟ یا یہ

سب ان شخصیتوں کے بارے میں ہے جن کی تماثیل وتصاویر کی پوجا کی جاتی تھی؟:۔

۱۔ واذا حشر الناس کانوالهم اعداء وکانو بعبادتهم کفرین۔ (احقاف۔۶)

ترجمہ "اور جب بروز قیامت سب اکٹھے کئے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن ہو جائیں گے اور ان کی عبادت ہی کا انکار کر دیں گے"

۲۔ ویوم یحشرهم وما یعبدون من دون الله فیقول ءانتم اضللتم عبادی هولاء ام هم ضلوا السبیل قالوا سبحنک ما کان ینبغی لنا ان نتخذ من دونک من اولیاء۔ (فرقان۔۲)

ترجمہ "اور جس دن اللہ انہیں اکٹھا کریگا' جن کو وہ چھوڑ کر پوجتے تھے تو ان سے پوچھے گا کہ تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا؟ یا وہ خود بھٹک گئے تھے۔ تو وہ کہیں گے کہ تو پاک ہے۔ بھلا میری یہ مجال تھی کہ ہم تیرے سوا کسی دوسرے کو معبود بنانے کو کہتے"

کیا قیامت کے روز یہ تصاویر وتماثیل اٹھائے جائیں گے یا وہ شخصیتیں اٹھائی جائیں گی جن کی تصاویر وتماثیل کی پرستش کی جاتی ہے؟ کیا یہ سوال وجواب ان تصویروں اور مورتیوں سے ہو گا جن کو یہاں پوجا جاتا ہے؟ یا ان لوگوں سے ہو گا جن کی تصاویر وتماثیل ہیں؟ دراصل ہر جگہ مجسموں' تصویروں اور قبروں کی نہیں بلکہ ان شخصیتوں اور افراد کی پرستش ہوتی ہے جن کے وہ مجسمے ہوتے ہیں یا جن کی وہ تصویریں اور قبریں ہوتی ہیں۔ اہل عرب کے بت بھی محض واہمہ کی پیداوار نہ تھے بلکہ وہ کبھی قدیم عرب کی انسان کی شخصیتیں رہی تھیں۔ لہٰذا پوجا' تصویر و تمثیل کی نہیں بلکہ ان افراد کی ہوتی تھیں۔

خود آنحضرت کی زندگی اس بات کی شاہد ہے کہ "تصویر" کوئی چیز نہیں۔ اصل چیز "تصور" ہے۔ خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت مقیم تھے اور بقول علامہ سید سلیمان ندوی:۔

"یہ کل پتھر کی مورتیں نہ تھیں .... بلکہ ان میں ایک خاصی تعداد

رنگین تصاویر کی تھی۔ دیواروں پر بزرگوں اور دیوتاؤں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں" (ارض القرآن)

کیا ان مورتیوں اور تصاویر ہی کی پرستش ہوتی تھی؟ ہرگز نہیں' بلکہ دراصل ان اجرام وعناصر یا ان شخصیتوں کی پرستش ہوتی تھی جن کی یہ تصاویر یا مورتیاں تھیں :۔

"عرب کے مشہور بت' لات' ود' سخوث وغیرہ پہلے زمانے کے بزرگوں کے نام ہیں۔ بعد میں اہل عرب ان کی شکلیں بنا بنا کے پوجنے لگے" (صحیح بخاری)

اس سے ظاہر ہوا کہ دراصل بت پرستی میں "شخصیت پرستی" کا تصور پنہاں ہے اہل عرب بھی بذاتہ ان مورتیوں اور تصویروں کی نہیں بلکہ شخصیتوں کی پرستش کرتے تھے جن کے مظہر یہ مجسمے تھے۔ ان میں حضرات ابراہیم واسماعیل علیہ السلام کے مجسمے بھی تھے۔ ہندو بھی ہر تصویر یا ہر مجسمے کو نہیں پوجتے بلکہ خاص خاص شخصیتوں کی تصاویر اور مجسموں کو پوجتے ہیں۔ اسی لئے قرآن نے جب اہل مکہ کو مخاطب کیا تو فرمایا کہ:۔

ان الذین تدعون من دون الله عبادا مثالکم۔

ترجمہ "جنہیں تم لوگ خدا کے سوا پکارتے ہو وہ تو تمہاری ہی طرح میری مخلوق ہیں"

اس سے ظاہر ہے کہ اہل عرب چونکہ اپنے بزرگوں اور اگلوں کی مورتیاں اور تصاویر بنا بنا کے' ان "تماثیل" کی نہیں' بلکہ دراصل ان شخصیتوں کی پرستش کرتے تھے جنکی یہ تماثیل تھیں۔ اس لئے قرآن نے بھی ان کے صرف تصور کا ابطال کیا اور کہا کہ جن لوگوں کی یہ تصاویر اور مورتیاں ہیں۔ وہ بھی تو تمہاری ہی طرح میرے معمولی بندے ہی تھے۔ پھر تم انہیں کیوں پکارتے ہو؟ قرآن نے فی نفسہ تصاویر اور مورتیوں کی تنقیص وتکذیب نہیں کی کہ تصویروں اور مجسموں کو کیوں پوجتے ہو؟ بلکہ ان اجسام واجرام کی پرستش کو باطل قرار دیا جن کی تصویروں اور مورتیں کو وہ پوجتے تھے۔ چنانچہ دیکھئے چونکہ خود رسول اللہ کا تصور درست تھا اور آپ ان اشخاص وافراد کی

پرستش نہ فرماتے تھے۔ جن کے مرقعے اور مجسمے خانہ کعبہ میں رکھے تھے بلکہ خدا کی پرستش کرتے تھے اس لئے جب تک مکہ میں مقیم رہے۔ خانہ کعبہ ہی میں جا کر نماز پڑھتے رہے اور ان تصاویر وتماثیل کی موجودگی سے انکی نماز یا عبادت میں کوئی حرج یا نقص واقع نہ ہوتا تھا جو خانہ کعبہ میں موجود تھیں۔ مگر مشرکین مکہ کے نزدیک وہ مورتیاں اور تصاویر ہی اہم اور قابل پرستش تھیں کیونکہ وہ ان لوگوں اور شخصیتوں کی محسوس مظہر تھیں جنہیں وہ الوہیت کا درجہ دیئے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد آپ نے اپنے جدامجد حضرت ابراہیم کی تقلید کی اور اہل مکہ کو جنہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کیا گیا تھا۔ اور ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا یہ دکھانے کے لئے کہ یہ مورتیں اور تصویریں جن کے آگے وہ جھکتے تھے یا وہ شخصیتیں جنہیں اب تک صاحب اختیار اور لائق پرستش سمجھتے تھے۔ سب کے سب بیکار محض ہیں اور تین سو ساٹھ میں سے ایک بھی ان کی مدد نہ کر سکا اور مکہ کو فتح ہونے سے نہ بچا سکا۔ تمام تصاویر اور مورتیوں کو برباد کرا دیا تھا۔ رسول اللہؐ نے خانہ کعبہ کے بتوں کو اس لئے نہ توڑا تھا کہ نہ وہ رہیں گے نہ بعد میں لوگ ان کی عبادت کریں گے۔ اس سے کیا ہوتا؟ وہ لوگ دوسری مورتیاں لا کر گھروں میں رکھ لیتے' دراصل ان کے اس تصور کی اصلاح کی جس کے سبب وہ ان مورتیوں اور شخصیتوں یا عناصرواجرام کی پرستش کرتے تھے اور اس طرح سمجھا دیا کہ یہ ایسے ناچار تھے اور ہیں کہ نہ اہل مکہ کی مدد کر سکے نہ مکہ کو دشمن سے محفوظ رکھ سکے اور نہ خود اپنی ذات کی حفاظت کر سکے۔ اس لئے فی نفسہ مورتیوں اور تصویروں میں کوئی خرابی نہیں بلکہ خرابی تصور کی قابل گرفت ہوتی ہے حنفی حضرات جب میدانوں اور راستوں پر نمازیں پڑھنے لگتے تو سامنے کوئی چیز خاص طور سے رکھ لیتے ہیں۔ اہل تشیع حضرات سنگی یا نباتاتی سجدہ گاہ سامنے رکھے بغیر کبھی نماز پڑھتے ہی نہیں۔ ظاہری اعتبار سے کیا فرق ہوا۔ ہندوؤں سے جو سامنے مٹی یا پتھر کا پتلا رکھ کر پوجا کرتے ہیں؟ جو کچھ فرق ہے وہ تصور کا ہے۔ مسلمان اس سامنے کی شے کو بے حقیقت جانتے ہیں لیکن اگر کسی ہندو کے سامنے گنیش جی کی مورتی یا تصویر ہے تو وہ گنیش جی کو اپنے سامنے حاضروموجود تصور کر کے ان کی پرستش کرتا ہے۔ یا گنیش جی کو اپنے اور خدا کے درمیان ایک ذریعہ اور وسیلہ سمجھتا ہے۔ جو لوگ بھی جس شخص کی تصویر یا مورتی کی پرستش کرتے ہیں۔ انکا تصور یہی ہوتا ہے کہ:۔

۱۔ ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفی ط۔ (زمر۔۲)

ترجمہ "ہم تو ان کی پرستش محض اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں خدا سے قریب کردیں گے"

۲۔ ھو لاء شفعاؤنا عند اللہ۔ (یونس۔۲)

ترجمہ "یہ تو صرف اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں"

کیا وہ لوگ حقیقتاً" ان مورتیوں اور مجسموں کے بارے میں یہ عقیدہ وتصور رکھتے تھے کہ وہ سفارش کریں گی؟ نہیں' بلکہ ان اجسام و اجرام اور اشخاص وافراد کو اپنا سفارشی قرار دیتے تھے جن کے وہ مجسمے ہوتے ہیں اور جو کبھی زندہ شخصیتوں کے مالک تھے' مسلمان جن مزاروں پر جاکر حاجت روائی کی استدعا کرتے ہیں۔ تو کیا وہ ان قبروں اور مٹی چونا کے ڈھیروں سے کوئی امید وابستہ کرتے ہیں؟ نہیں' بلکہ ان بزرگوں سے امداد کے خواہاں ہوتے ہیں جو کبھی زندہ فرد تھے اور موت سے ہمکنار ہو کر ان قبروں میں دفن ہیں۔ اور یہی تصور باطل ہے۔ جسے اسلام مٹانے آیا تھا' یا مٹاتا ہے۔ ورنہ محض تصویر سے کیا ہوتا ہے؟ حضرت سلیمان کے تماثیل بنوانے یا آذر کے خود تماثیل بنانے میں بظاہر کوئی فرق تھوڑا ہی تھا؟ جو کچھ فرق تھا وہ تصور کا تھا۔ حضرت سلیمان کے عہد میں جب لوگوں کا تصور درست تھا۔ تو خود پیغمبر نے اپنے حکم سے تماثیل بنوائے تھے۔ لیکن حضرت ابراہیم کے وقت میں جب لوگوں کا تصور نادرست تھا تو خود پیغمبر نے اپنے ہاتھ سے تمام تماثیل کو پاش پاش کر دیا تھا۔

ادارہ علوم اسلامیہ علی گڑھ کے ریسرچ اسسٹنٹ محمود الحق صاحب نے مفتی اعظم مصر محمد عبدہ کی اصلاحی تحریک سے متعلق جو مقالہ علی گڑھ کے "مجلہ اسلامیہ" میں لکھا ہے' اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ:۔

"شیخ محمد عبدہ نے زندگی سے متعلق چند اہم شرعی مسائل کی جدید تشریح کی ...... انہوں نے تصویر کشی اور مجسمہ سازی کو جائز ٹھہرایا جہاں تک موخرالذکر مسئلہ کا تعلق ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ احادیث صحیح میں ان کی ممانعت کا حکم صراحتاً" موجود ہے۔ مثلاً" ایک حدیث ہے کہ قیامت

کے دن سب سے زیادہ عذاب کے مستحق مصور ہوں گے۔ محمد عبدہ ان احادیث کی صحت سے انکار نہیں کرتے بلکہ ان کا کہنا ہے کہ یہ حکم اس وقت دیا گیا تھا۔ جب بت پرستی رائج تھی۔ اب اس طرح کی کوئی مصلحت درپیش نہیں ہے۔ اس کے علاوہ تصویر کشی کے فوائد مسلم ہو چکے ہیں۔ لہٰذا عارضہ کے زائل اور فائدہ کے ظاہر ہونے کے بعد حکم ممانعت زائل ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں ذی روح اور غیر ذی روح اشیاء کی تصویر کشی میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا"

یہی وجہ ہے کہ جب لوگوں کا یہ غلط تصور قائم ہو گیا کہ ہم جن شخصیتوں یا ان کی مورتیوں اور تصویروں کی پرستش کرتے ہیں:۔

ھو لاء شفعا ونا عنداللہ۔ (یونس۔۲)

ترجمہ "یہ تو اللہ کے پاس صرف ہمارے سفارشی ہیں"

تو قرآن نے ان سے سوال کیا کہ:۔

قل اتنبؤن اللہ بما لا یعلم فی السموت ولا فی الارض ط۔ (یونس۔۲)

ترجمہ "اے پیغمبر! ان سے پوچھو کہ کیا تم اللہ کو ان کے ذریعے سے خبر پہنچاتے ہو جنہیں خود ہی نہ آسمانوں کی کسی شے کا علم ہے اور نہ زمین کی؟"

یعنی جن شخصیتوں کی تصویروں اور مورتیوں کو تم لوگ سامنے رکھ کر محض اس لئے پرستش کرتے ہو کہ وہ تمہیں خدا کے قریب کر دیں گے۔ یا خدا کے یہاں تمہاری سفارش کریں گی۔ وہ تو خود اس قدر عاجز و درماندہ ہیں کہ نہ انہیں آسمانوں کی کسی شے کا علم ہے اور نہ زمین کی۔ پھر وہ خدا کے یہاں تمہاری کوئی خبر یا سفارش کیا پہنچائیں گی؟ اور اس غلط تصور کی اصلاح یوں کی کہ:۔

وان یمسسک اللہ بضر فلا کاشف لہ الا ھو ط وان یردک بخیر فلا راد لفضلہ ط۔ (یونس)

ترجمہ "اور تمہیں اللہ کوئی تکلیف پہنچادے تو بجز اس کے دوسرا کوئی بھی اسے دور کرنے والا نہیں اور اگر اللہ تمہیں کوئی راحت پہنچانا چاہے تو اس کے فضل کو کوئی بھی روک یا ہٹا دینے والا نہیں"

اس لئے اگر یہ تصور درست ہے تو سب ٹھیک ہے اور اگر یہ تصور ہی غلط ہے تو سب غلط ہے۔ تصویر یا مورتی یا مجسمے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ بت پرستی کا تعلق صرف تصور سے ہے۔ حضرت مخدوم الملک بہاری اپنے اکیسویں خط میں لکھتے ہیں:۔

"اہل حقیقت کے نزدیک شرک' اصنام پرستی یا زنار یا بت کو سجدہ کرنا نہیں ہے بلکہ اللہ کے سوا کسی سے طمع رکھنا یا ڈرنا ہے' یا آرام لینا ہے .... بت میں نہ تو نفع پہنچانے کی قوت ہے۔ نہ ضرررسانی کی۔ مگر جب کافر نے بت سے طمع رکھا یا اس سے خوف کھایا یا اس پر اعتقاد جمایا تو حقیقی توحید کو اس نے خراب وبرباد کر دیا"

اور پچیسویں خط میں لکھتے ہیں کہ:۔

"ہر قصد کے لئے شرط ہوا کرتی ہے"

یعنی اعمال کا تعلق نیت سے ہے۔

خود قرآن نے جہاں حلال وحرام کا صاف وصریح فیصلہ کیا ہے۔ وہاں یہ بتاتے ہوئے کہ خون' مردار' سور کا گوشت اور غیر اللہ سے نامزد شے کے سوا تمہارے لئے وہ تمام چیزیں حلال ہیں جو تمہیں اچھی معلوم ہوں اور تمہارے لئے مفید ہوں' محرمات کے بارے میں یہ کہا ہے کہ:۔

فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فان ربک غفور رحیم۔ (انعام ۱۸)

ترجمہ "سو اگر اضطراری کیفیت ہو اور طلب لذت یا قانون شکنی کی نیت نہ ہو تو یہ سب بھی حلال ہیں۔ اللہ معاف کرنے والا ہے"

ازروئے قرآن' اپنی نیت پاک اور اپنا ضمیر مطمئن ہو تو زبانی کفر بھی معاف ہے

من كفر با الله من بعد ايمانه الا من اكره و قلبه مطمئن بالا يمان ولكن من شرح بالكفر صدرا " فعليهم غضب من الله ولهم عذاب عظيم (نحل۔۱۰۶)

ترجمہ "جو شخص ایمان لانے کے بعد اللہ کا انکار کرے مگر ہاں وہ نہیں جسے کفر پر مجبور کیا جائے حالانکہ اس کا قلب ایمان پر مطمئن ہو' البتہ وہ جس کا کفر پر سینہ کھل جائے تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب نازل ہو گا اور انکے لئے ایک دردناک سزا تجویز کر دی گئی ہے"

اگر نیت درست اور قلب صاف نہ ہو تو نماز و عبادت بھی لغو و عبث ہے:

فویل للمصلین ..... الذین هم یرا ئون۔ (ماعون)

ترجمہ "افسوس ہے ان نمازیوں پر ..... جو دکھلاوے کے لئے پڑھتے ہیں"

یہی وجہ تھی کہ پیغمبروں کی شرح صدر کا قرآن میں بطور خاص ذکر ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ نے اسی لئے دعا کی تھی کہ:۔

رب شرح لی صدری۔

ترجمہ "اے میرے پروردگار' میرا سینہ کھول دے"

حضرت محمدؐ سے اسی لئے فرمایا گیا تھا کہ:۔

الم نشرح لک صدوک

ترجمہ "کیا ہم نے تمہارا سینہ نہیں کھول کر دیا؟"

"جب ہی آنحضرت صلعم ۳۶۰ بتوں کے گہوارہ' مسجد حرام میں بطیب خاطر نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ آج ہم لوگ مصلے پر جب بیٹھتے ہیں۔ تو اگرچہ سامنے کوئی تصویر و تمثیل نہ ہو مگر دل و دماغ کے سارے بت سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ خیال درست نہیں کہ تصویر و تمثیل کو دیکھتے ہی اس کی پوجا کے لئے دل مچلنے لگتا ہے۔ لہٰذا تصور و تمثیل پر نظر پڑنی ہی نہیں چاہئے۔

اب اگر کسی مشہور تصویر یا مجسمے کے لئے پرستش اور اسے معبود سمجھنے کا تصور قائم ہے تو ضرورت اس تصویر و تمثیل کو اس کی جگہ سے ہٹانے کی نہیں بلکہ اس تصور کو دماغ سے نکالنے کی ہے جس کے سبب وہ معبود بن گئی ہے ورنہ ایک تصویر ہٹائی جائے گی تو دوسری آ جائے گی۔ اس لئے یہ کہنا اور سمجھنا قطعاً" باطل ہے کہ اسلام نے تصویر کشی اور مجسمہ سازی کو حرام اور ممنوع قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ اس سے آیت پرستی کا اندیشہ ہے ـــــــــــــ رسالہ "طلوع اسلام" (کراچی) سے کسی نے اسی طرح کا سوال کیا تو اس نے نہایت معقول جواب دیا تھا کہ۔

"اس میں شبہ نہیں کہ زمانہ جہالت میں انسان مظاہر پرست اور انسان پرست واقعہ ہوا تھا۔ اس لئے وہ مجسمات اور تصاویر کی پرستش شروع کر دیتا تھا۔ لیکن ہر مجسمے اور ہر تصویر کی نہیں بلکہ صرف انہیں کے مجسموں اور تصویروں کی جن کی اسے پرستش مقصود تھی۔ اس لئے وجہ ممانعت' مظاہر فطرت یا انسانوں کی پرستش تھی نہ کہ نفس تماثیل۔ اگر اس دلیل کو محکم تسلیم کر لیا جائے کہ انسان اللہ کے سوا جن چیزوں کی پرستش کرتا ہے انہیں باقی نہیں رہنے دینا چاہئے تاکہ دنیا سے شرک مٹ جائے تو غور فرمایئے کہ اس سلسلہ کائنات میں کس کس چیز کو مٹانا پڑے گا؟ انسان پہاڑوں اور دریاؤں کی پرستش کرتا ہے۔ زمین کی اور اجرام سماوی (چاند' سورج' ستاروں) کی پرستش کرتا ہے۔ وہ ان چیزوں کی تصاویر کی پرستش نہیں کرتا بلکہ خود ان چیزوں ہی کی پرستش کرتا ہے تو کیا اس شرک کو مٹانے کے لئے ان تمام چیزوں کو مٹا دیا جائے گا جن کی یہ پرستش کرتا ہے؟ اور کیا ان کا مٹانا ممکن بھی ہے؟ انسان پرستی میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ انسانوں کی تصاویر یا ان کے مجسمے مٹا دینے سے ان کی پرستش نہیں ہو گی۔ لیکن ذرا گہرائی میں جا کر دیکھئے کہ کیا ان کے مٹانے سے واقعی شرک مٹ جائے گا؟ اگر آپ ان تصاویر کو مٹا بھی دیں گے تو ان تصاویر کو کیا کریں گے۔ جو انسانوں نے اپنے قلب کے چوکھٹوں میں محفوظ کر رکھی ہیں؟ اگر آپ شیخ کی تصویر کو سامنے نہیں رکھنے دیتے تو وہ مراقبے میں تصور شیخ سے اپنے سینے کو بت کدہ

بنا لیتا ہے۔ سو اصل شے انسان کے دل و دماغ کے بت کدوں کو' معبود ان باطل سے پاک کرنا ہے۔ اگر ان کی تطہیر ہو جائے تو خارجی معبود (تصاویر' مجسمے بلکہ زندہ انسان ازخود فنا ہو جاتے ہیں لیکن اگر دل میں یہ بت موجود ہوں تو محسوس و مشہور بتوں تصویروں اور مجسموں) کے استیصال سے کچھ نہیں بنتا۔ کتنے مسلمان ہیں جو تصویر کشی و مجسمہ سازی' قبرپرستی کو حرام سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کے سینوں کو ٹٹول کر دیکھئے اور غور کیجئے کہ ان میں کتنے کتنے بڑے لات اور منات اور ہبل اور مری چھپے بیٹھے ہیں:

"رہ مدہ اقبال راورکعبہ اے شیخ حرم!
ہرزماں درآستیں دارو خداوندے دگر"

"طلوع اسلام" نے بت پرستی کے سلسلے میں "تصور شیخ" کا بھی ذکر کیا ہے۔ چونکہ "طلوع اسلام" کے خلاف ایک طبقہ محاذ قائم کئے ہوئے ہے۔ اس وجہ سے شاید عوام کو اس کی رائے صحیح نہ معلوم ہو۔ لہٰذا میں عرض کر دوں کہ یہ صرف اس کا گناہ نہیں مرزا مظہر جان جاناں کے مکتوبات پر جناب عبدالرزاق قریشی کا ایک مضمون معارف (اعظم گڑھ) میں شائع ہوا ہے۔ اس میں ایک خط کی عبارت ملاحظہ فکر ہے۔ یہ خط فارسی میں ہے۔ ذیل میں اس کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے:

ہندوؤں کی بت پرستی کی حقیقت اتنی ہے کہ چند شخصیتوں کی صورتیں بناتے ہیں۔ مثلاً" ان ملائکہ کی جو بحکم خداوندی عالم کون وفساد میں تصرف کرتے ہیں یا بعض کاملوں کی ارواح کی' جن کا تصرف جسم چھوڑنے کے بعد ان کے اندر اس جہان میں بھی باقی رہتا ہے۔ یا بعض زندہ لوگ جو ان کے خیال میں حضرت خضر کی طرح زندہ جاوید ہیں۔ ان کی صورتیں بنا کر وہ ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس توجہ کی وجہ سے ایک مدت کے بعد ان ہستیوں سے جن کی یہ تصویریں ہیں' خاص مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس مناسبت کی وجہ سے وہ اپنی معاشی ومعادی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ یہ عمل ذکر رابطہ سے مشابہ ہے جو صوفیہ اسلامیہ کا معمول ہے۔ وہ شیخ کا تصور کرتے ہیں اور فیوض حاصل کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ صوفیہ کوئی

ظاہری تصویر نہیں تراشتے ....."

بہرکیف نقل اتارنے اور روپ دھارنے کا جذبہ فطرت کا خاص عطیہ ہے۔ تصویر کھینچنے اور کھچوانے، مجسمہ بنانے اور بنوانے، مورتیاں ڈھالنے اور ڈھلوانے کا مدار اسی نقل اتارنے کے فطری جذبے پر ہے۔ اسلام فطرت انسانی کا آئینہ دار ہے جس کا دستور العمل قرآن ہے۔ اسی لئے قرآن نے تصویر و مجسمہ پر کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ذکر کے ذریعے سے جس طرح ہوابازی، تعمیرات، پرندوں کی بولیاں سمجھنے، زیرزمین دھاتوں کے چشموں سے فائدہ اٹھانے وغیرہ کی صنعتوں کی طرف توجہ کرنے کی رہنمائی کی گئی ہے۔ اسی طرح تصویر کشی اور مجسمہ سازی کے فنون لطیفہ کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ تصویر کشی و مجسمہ سازی کا تعلق بت پرستی کے عقیدے سے ہرگز نہیں بلکہ فن سے ہے اور فن زندگی کے آغوش میں تربیت پاتا اور زندگی ہی کی عکاسی کرتا ہے۔ فن اور زندگی باہم اس طرح پیوست ہیں کہ فن زندگی کے بغیر مردہ اور زندگی فن کے بغیر بے جان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فن تصویر سے فطرتاً" ہر انسان کو حسب حیثیت وذوق دلچسپی ہے۔ مکانوں کی آرائش اور باغ کی زینت جن کے قبضہ اقتدار میں ہے۔ وہ فن مصوری کے اعلیٰ نمونوں سے دلچسپی رکھتے ہیں اور جو لوگ جھونپڑیوں میں ہوتے ہیں وہ محض ایک تصویر میں یہ دونوں چیزیں سمیٹ کر اپنے اس فطری جذبے اور جبلی خواہش کی تسکین کر لیتے ہیں۔ آپ ہر انسان کو دیکھیں گے کہ وہ "تصویر کا شوق ضرور رکھے گا۔ اس لئے کہ فطری جذبے کا مطالبہ ہے۔ اب چاہے وہ انسانوں کی تصویریں ہوں، یا حیوانوں کی، مناظر کی تصویریں ہوں یا مقابر کی، تاج محل اور خانہ کعبہ کی ہوں یا سومناتھ اور بنارس گھاٹ کی، لیڈروں کی ہوں یا عالموں، ادیبوں، شاعروں اور ایکٹرسوں کی اور اسی فطری جذبے کا اثر ہے کہ" مجسمہ" انسانی معاشرت کا ایک ناقابل ترک عنصر بن گیا ہے اور انسان کسی طرح اسے اپنی زندگی سے علیحدہ کر ہی نہیں سکتے۔ ہمارے لڑکوں کے لئے سینکڑوں کھلونے ہیں جو جانوروں، اونٹ، بلی، گھوڑا، بندر، چوہا، مرغ وغیرہ کی شکل میں ہیں۔ یہ تماثیل ہی ہیں۔ اگر ہم خریدتے نہیں تو گھر پر خود بنا لیتے ہیں۔ ہماری لڑکیاں، گڑیاں کھیلتی ہیں۔ وہی گڑیاں جو حضرت عائشہؓ کھیلتی تھیں اور جن کے بارے میں آج تک کبھی نہیں سنا اور

کہیں نہیں پڑھا کہ رسول اللہ نے اس کے لئے حضرت عائشہؓ کو کبھی ممانعت کی تھی۔ یہ بھی تماثیل ہی ہیں۔ ہمارے بچے لاتعداد مٹھائیاں اور پکوان مصور شکل میں کھاتے ہیں' چڑیا' مور' بطخ وغیرہ کی شکل کی مٹھائیاں عموماً" بازاروں میں بھی ملتی ہیں۔ اور گھروں میں بھی بچوں کے لئے انہیں شکلوں کے پکوان بنا دیئے جاتے ہیں۔ یہ سب تماثیل ہی ہیں۔ ہمارے کاشت کار اپنے کھیتوں میں آدمیوں کی شکلیں بنا کر کھڑی کر دیتے ہیں تاکہ کاشت کو خراب کرنے والے جانور اور پرندے انہیں انسان سمجھ کر ڈریں اور فصل خراب نہ کریں۔ یہ سب تماثیل ہی ہیں کیا ان کا مقصود بت پرستی ہے؟

فن مصوری' ایک نعمت خداوندی ہے اور جہاں تمام ذرائع ختم ہو چکے ہوں وہاں واحد ذریعہ رحمت بن جاتا ہے۔ "ماہ نو" (کراچی) کے اگست نمبر ۱۹۵۵ء میں پاکستان کے مشہور مصور زین العابدین نے اپنا ایک دلچسپ واقعہ "لکیروں کی زبان" سے لکھا ہے کہ وہ الحمرا اور قرطبہ کو دیکھنے اسپین گئے۔ وہاں پہنچ کر دقت یہ پیش آئی کہ اسپینی یا فرانسیسی زبان جانتے ہیں یا اسپینی اور زین العابدین صاحب ان دونوں زبانوں سے ناواقف تھے۔ وہاں اردو' فارسی' انگریزی کوئی سمجھتا ہی نہ تھا۔ ہوٹل والے ان کے اشارے سمجھنے کی کوشش کرتے مگر کچھ پلے نہ پڑتا تھا۔ بڑی مشکل پیش آئی مگر زین العابدین صاحب کو القاء سا ہوا کہ کیوں نہ مافی الضمیر تصاویر کے ذریعے سے ظاہر کیا جائے؟ سب سے زیادہ پریشانی کھانے کی تھی۔ اس لئے انہوں نے اس کے بعد کھانے پینے کا مسئلہ برابر تصویروں ہی سے حل کیا۔ مثلاً" اگر ابلا ہوا انڈا کھانا چاہا تو یوں ظاہر کیا کہ ایک طرف ابلنے کی تصویر بنائی اور دوسری جانب مرغی کی۔ پھر اس کے قریب انڈے کی تصویر بنائی اور انڈے کی تصویر کو ابلنے والی تصویر سے ایک تیر کے ذریعے سے ملا دیا۔ اس طرح ویٹر سمجھ گیا کہ ابلا ہوا انڈا چاہتے ہیں۔ غور فرمایئے' اگر وہ اس نعمت سے محروم ہوتے تو شاید زندہ ہی نہ رہتے یا دوسرے ہی دن واپس آ جاتے۔ چنانچہ انہوں نے اپنا مقالہ ان الفاظ پر ختم کیا ہے:۔

> "اسپین کے سفر میں لکیروں کی زبان ہی میری مادری زبان تھی اور اس کی مدد سے میں نے سب کام نکال لئے"

ہمارے علماء ویسے تو ریڈیو کی ساری خبروں پر اعتماد کامل رکھتے ہیں' خود تقریر و تفسیر

نشر کرتے اور اس پر عمل ور آمد رکھتے ہیں مگر جب رمضان وعید وغیرہ کی روایت ہلال کی خبر ریڈیو سے نشر ہوتی ہے تو اس کو نہیں مانتے۔ اس لئے کہ "روایت" نہیں ہوتی۔ دلیل یہ ہے کہ کیا پتہ ہے کہ کون یہ خبر نشر کر رہا ہے' آدمی یا شیطان؟ اور آدمی بھی مستند ہے یا نہیں؟ ہرچند کہ یہ دلیل ان لوگوں کی طرف سے عجیب تھی اور ہے جو راوی در راوی کلبیان کی ہوئی یا سنی سنائی باتوں پر یقین کامل رکھتے ہیں اور ایک راوی سے بھی یہ خود نہیں پوچھ سکتے کہ تم نے خود سنا ہے؟ تصویر کے فن کی ترقی نے یہ رکاوٹ بھی دور کر دی۔ ٹیلیویژن سیٹ ایجاد ہو گیا ہے۔ اس سیٹ کے بالائی حصہ پر پردہ لگا ہوتا ہے۔ نچلے حصہ سے آواز آتی ہے اور جس شخص کی آواز ہوتی ہے۔ سینما کی طرح اس شخص کی تصویر اوپر کے پردہ پر آ جاتی ہے۔ اب بہ اطمینان یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ بولنے والا آدمی ہے یا شیطان؟ صرف اتنا ہی نہیں تصویر کا فن اتنا آگے بڑھ گیا ہے کہ انسان محو حیرت ہو جاتا ہے اور اندازہ نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اس کا عروج کہاں تک ہو گا۔ آپ اخباروں میں بعض تصاویر کے نیچے لکھا ہوا دیکھیں گے۔ "ریڈیو فوٹو" اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ تصویر ریڈیو کے ذریعہ ہزاروں' لاکھوں میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اخباروں کے دفتروں کے پہنچتی ہے۔ جس طرح ٹیلی ویژن میں روشنی کی لہروں کو برقی ارتعاشات میں تبدیل کر کے نشر کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح انتقال تصویر کے لئے ایک آلہ استعمال کیا جاتا ہے جسے "فوٹو ٹیلیگراف" کہتے ہیں۔ تصویر اس کے ایک سرے پر لگا دی جاتی ہے اور ایک دوسرے آلہ کی مدد سے اس پر تیز روشنی ڈالی جاتی ہے جو منعکس ہونے کے بعد ایک دوسرے پرزے پر پڑتی ہے جس کا نام " فوٹو الیکٹرک سیل" ہے۔ وہ روشنی کی کرنوں کو برقی ارتعاشات میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جو ٹیلیگراف لائن یا وائرلیس کے ذریعہ آن کی آن میں دوسری جگہ بھیجے جا سکتے ہیں۔ منزل مقصود پر ایک ریسیور انہیں وصول کرتا اور خاص طرز کے لیمپ میں داخل کرا دیتا ہے جو نہایت حساس ہوتا ہے۔ اس کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی فوٹو گرافک کاغذ پر پڑتی ہے اور وہ تصویر مرتب و مکمل ہو جاتی ہے جو ہزاروں لاکھوں میل کے فاصلہ پر رکھی تھی۔ ہر نیوز ایجنسی اور بڑے بڑے اخباروں کے دفتر میں تصویریں حاصل کرنے کا یہ جدید انتظام موجود ہوتا ہے۔ اس جدید ایجاد کو بہت سے ترقی یافتہ ملکوں میں جرائم کی بیخ کنی

اور مجرموں کو گرفتار کرنے کے لئے بھی استعمال کیا جانے لگا ہے۔ اس کی مدد سے انگلیوں کے نشانات، جعلی دستخط، جعلی تحریریں اور دوسری ضروری دستاویزات کی تصاویر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کی جاتی ہیں اور جرائم کا سدباب کیا جاتا ہے۔ بڑے بڑے ڈاک خانوں میں بھی یہ سہولت عام کی جا رہی ہے کہ اگر آپ کوئی تحریر اپنے کسی عزیز دوست کو بھیجنا چاہیں تو اس کی تصویر ریڈیائی لہروں کی مدد سے وہاں پہنچا دی جائے گی۔ ابھی حال میں برطانوی سائنسدانوں نے تصویر کشی کا ایک عجیب طریقہ ایجاد کیا ہے جسے "لیزر" کہتے ہیں۔ اسی طریقے سے وہ ایسی شعاعیں پیدا کرتے ہیں جو دس لاکھ سورجوں کی شعاعوں کے برابر چمکدار ہوتی اور ٹھوس سے ٹھوس مادے کے اندر رکھی ہوئی چیز تک پہنچ سکتی ہیں۔ یہ ریڈیو کی لہروں کی طرح بھیجی اور حاصل بھی کی جا سکتی ہیں۔ اس شعاع کے ذریعہ برطانوی سائنسدان ماسکو اور واشنگٹن یا دنیا کے کسی بھی مقام پر منعقد ہوتی ہوئی مجلسوں کی خفیہ تصاویر حاصل کر سکیں گے۔ فضاؤں کی جاسوسی کر کے انکی بھی تصاویر لی جا سکیں گی۔ تصاویر کے انتقال و وصول سے متعلق ان ترقیات نے سائنسدانوں کو ایک عجیب راہ پر لگا دیا ہے وہ سوچ رہے ہیں کہ اگر ریڈیائی لہروں کو آوازیں، الفاظ، صورتیں اور تصاویر منتقل کرنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ تو ان کے ذریعہ مادی اشیاء کو ایک جگہ سے دوسری جگہ کیوں منتقل نہیں کیا جا سکتا؟ فوٹو گرافی اتنی ترقی کر چکی ہے کہ ایک سیکنڈ کے دس لاکھویں حصے میں تصویر اتاری جا سکتی ہے۔ آپ جتنی دیر میں پلک جھپکتے ہیں۔ کیمرہ اس سے بھی کم وقفے میں پانچ سو تصویریں اتار لیتا ہے۔ اگر سائنسدان اپنی دھن میں لگے رہے تو وہ مادی اشیاء کو بھی منتقل کر کے رہیں گے۔ اس کے لئے قرآن کا اشارہ کافی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے عہد میں علم سائنس ترقی کر گیا تھا۔ ان کے دربار میں ایک شخص تھا۔ جو نہ پیغمبر تھا نہ ولی۔ بلکہ وہ کتابی علم رکھتا تھا۔ جس کے ذریعے وہ مادی اشیاء کو چشم زدن میں، دور دراز فاصلے پر منتقل کر دیتا ہے۔ حضرت سلیمانؑ نے جب اپنے درباریوں سے کہا کہ ملکہ سبا کے میرے پاس پہنچنے سے پہلے اس کا تخت شاہی کون میرے پاس لا سکتا ہے تو ایک عفریت نے کہا کہ میں آپ کا دربار برخاست ہونے سے پہلے لا سکتا ہوں۔ مگر حضرت سلیمانؑ جانتے تھے کہ ان کے دربار میں صاحب علم بھی موجود ہیں جو اس سے بھی جلد

تر لا سکتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے عفریت کی پیشکش کو قبول نہیں کیا۔ آخر:۔

قال الذی عندہ علم من الکتب انا اتیک بہ قبل ان یرتد الیک طرفک فلما راہ مستقرا عندہ قال ھذا من فضل ربی۔ (نمل۔ ۳)

"اس نے جس کے پاس کتاب کا علم تھا کہا کہ میں اس کو آپ کی آنکھ جھپکنے سے پہلے لا سکتا ہوں۔ چنانچہ جب سلیمانؑ نے اس کو اپنے سامنے رکھا پایا تو کہنے لگے یہ بھی مجھ پر میرے پروردگار کا ایک فضل ہے"۔

اور فلم سازی کے شعبہ میں' تصویر نے افادی حیثیت سے جو ترقی کی اور کامیابی حاصل کی ہے۔ اس کا تفصیلی ذکر تو ایک مستقل کتاب چاہتا ہے اسکولوں اور کالجوں میں اساتذہ لیکچر دینے کے علاوہ تاریخ' جغرافیہ اور سائنس کے پیچیدہ اسباق کو سہل بنانے کے لئے فلموں سے غیر معمولی طور پر مدد لے رہیں۔ دنیا میں ہر روز تقریبا چار کروڑ افراد تعلیم و تربیت میں اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں کاش مسلمان نیند سے جاگیں۔

بہرکیف تصویر کشی ہو یا تصویر بینی یا مجسمہ سازی' اس کا تعلق فنون لطیفہ سے ہے اور جب قرآن اس کے جائز ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے تو یہ قطعاً" جائز ہے اور مسلمانوں کا ان لطیف فنون میں حصہ لینا ضروری۔ عربوں نے اسی لئے اس فن کا شمار ریاضی میں کیا تھا۔ یعنی اس طور پر انہوں نے بتایا کہ اس کا تعلق علم و ہنر سے ہے۔ ایمان و عقیدہ سے نہیں۔ اور علم و ہنر پر' اسلام ہرگز کوئی پابندی عائد نہیں کرتا۔ ہر وہ علم و ہنر جو قرآن کے خلاف نہیں ہے۔ "طیب" ہے۔ البتہ جس علم و ہنر کو اسلام کے نصب العین سے ہٹ کر اپنایا جائے وہ "خبیث" ہے۔

رقص و موسیقی

شاعری کی دنیا میں اک عالمگیر پیغام رواں دواں ہے کہ: ۔

"زندگی" زندہ دلی کا ہے نام مردہ دل' خاک جیا کرتے ہیں

دنیائے نثر کا مشہور مقولہ زبان زد خاص و عام ہے کہ :۔

"زندگی کو ہنسی خوشی گزارو"۔

اردو زبان میں اسد اللہ خان غالب سے بڑا شاعر ابھی تک پیدا نہیں ہوا۔ اس کا عام پیغام ہے کہ :۔ ۔

اے شمع! تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزاریا اسے رو کر گزار دے

اسی طرح علامہ ابولکلام آزاد سے بڑا نثر نگار ابھی تک اردو زبان کو نصیب نہیں ہوا۔ انہوں نے کہا ہے کہ۔

"اگر آپ نے خوش رہنے کا ہنر سیکھ لیا ہے تو یقین کیجئے کہ زندگی کا سب سے بڑا کام سیکھ لیا۔

واقعہ یہ ہے کہ "زندگی" نام ہی ہے کیف و سرور کا' فرحت و انبساط' مسرت و شادمانی کا۔ مگر بقول علامہ آزاد۔

"یہ عجیب بات ہے کہ مذہب' فلسفہ اور اخلاق' تینوں نے "زندگی" کا مسئلہ حل کرنا چاہا اور تینوں میں خود زندگی کے خلاف رجحان پیدا ہو گیا۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ایک آدمی جتنا زیادہ بجھا دل اور سوکھا چہرہ لے کر پھرے گا۔ اتنا ہی زیادہ مذہبی' فلسفی اور اخلاقی قسم کا ہو گا۔ گویا علم اور تقدس دونوں کے لئے یہاں "ماتمی زندگی" ضروری ہوئی۔ "زندگی" کی تحقیر اور توہین صرف یونان کے کلیسہ ہی کا شعار نہ تھا۔ بلکہ رواقی اور مشائی نقطہ نگاہ میں بھی اس کے عناصر برابر کام کرتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ رفتہ افسردہ

دلی اور ترش روئی فلسفیانہ مزاج کا ایک نمایاں خط و خال بن گئی۔......
مذہب اور روحانیت کی دنیا میں تو زہد خشک اور طبع خنک کی اتنی گرم بازاری
ہوئی کہ اب زہد مزاجی اور حق آگاہی کے ساتھ' کسی ہنستے ہوئے چہرے کا
تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ دینداری اور ثقالت طبع تقریباً" مرادف لفظ بن
گئے ہیں"۔ (غبار خاطر)

انقلاب آفرین' قرآنِ عظیم نے نازل ہو کر تمام مذاہب عالم اور نظریات فلسفہ و اخلاق پر ایک کاری ضرب لگائی تھی۔ اس نے سب سے زیادہ شدت کے ساتھ اعلان کیا تھا کہ "اسلام" مذہب نہیں بلکہ "دین" ہے جو "مذہب" کی ساری خشکی و افسردگی سے لوگوں کو نجات دلا کے اور ترش روئی و مردہ دلی سے انسان کو پاک و صاف رکھ کر اس کو ایک دلنواز دلپذیر بنانے والا دستور زندگی اور شاداں و فرحاں رکھنے والا قانون حیات عطا کرتا ہے۔ اس نے تمام بنی نوع انسانی کو پیغام دیا تھا کہ نزول قرآن سے یہ نہ سمجھو کہ "اسلام" تم پر خشکی و یبوست طاری کرنے یا تم سے زندگی کی مسرتیں چھیننے یا تمہیں مکروہ صورت ساکت و جامد بت بنانے کے لئے آیا ہے۔ بلکہ وہ تمہاری مسرتوں اور شادمانیوں کو بعنوان شائستہ درجہ کمال پر پہنچا دینے کے لئے آیا ہے۔ لہٰذا سب سے پہلا کام تم یہ کرو کہ نزول قرآن ہی کی خوشیاں مناؤ اللہ تعالیٰ نے خود تمام لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ۔

یا یھا الناس قد جا ئتکم موعظتہ من ربکم وشفاء لما فی الصدور وھدی ورحمتہ للمومنین ○ ۱۰/۵۷

"اے بنی نوع انسان! تمہارے پاس' تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک ایسی چیز آپہنچی ہے جو نصیحت ہے اور تمہاری صحیح رہنمائی کرنے والی ہے اور ان تمام لوگوں کے لئے رحمت ہے جو اس پر یقین رکھتے ہیں"۔

ساتھ ہی اپنے خندہ رو اور متبسم جبیں پیغمبر کو حکم دیا کہ۔

قل بفضل اللہ وبرحمتہ فبذلک فلیفرحوا ○ (۱۰/۵۸)

"اے پیغمبر! تم لوگوں سے کہہ دو کہ ایسا محض اللہ کے فضل اور اس کی رحمت

سے ہوا ہے۔ لہٰذا لوگ اس نعمت پر خوب خوب خوشیاں منائیں"۔

چنانچہ قرآن نے "مبوت" تک سے مایوسی و غم کو ختم کر دیا تھا اور سورہ رحمٰن میں کہہ دیا تھا کہ موت و فنائیت بھی نعمت خداوندی ہے۔ اس نے کائنات پر غور کرنے کی تاکید کی تھی تا کہ لوگوں پر ثابت ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی کائنات کیسی مسرور خنداں اور اس کی ہر شے کس قدر ہنستی بستی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب "اسلام" یا بس " مذہب" نہیں بلکہ "رطب" "دین" ہے تو وہ مذہب کی خشکی و یبوست کا کسی طرح پیغامبر ہو سکتا ہے؟ یہ کس طرح ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو یہ تعلیم دیتا کہ اس کی خنداں و شاداں کائنات میں یوں رہو کہ لوگ جب تمہیں دیکھیں تو سمجھیں کہ ابھی ابھی اپنے باپ کو قبر میں دفن کر کے آیا ہے۔ علامہ ابوالکلام آزاد نے بھی اعتراف کیا ہے کہ۔

> "اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکا کہ ایک فلسفی' ایک زاہد اور ایک سادھو کا خشک چہرہ بنا کر ہم اس مرقع میں کھپ نہیں سکتے جو نقاش فطرت کے موقلم نے یہاں کھینچ دیا ہے۔ جس مرقع میں سورج کی چمکتی ہوئی پیشانی' چاند کا ہنستا ہوا چہرہ' ستاروں کی چشمک' درختوں کا رقص' پرندوں کا نغمہ' آب رواں کا ترنم اور پھولوں کی رنگین ادائیں اپنی اپنی جلوہ ترازیاں رکھتی ہوں۔ اس میں ایک بجھے ہوئے دل اور سوکھے ہوئے چہرے کے ساتھ ہم جگہ پانے کے یقیناً مستحق نہیں ہو سکتے۔ فطرت کی اس بزم نشاط میں تو وہی زندگی سج سکتی ہے جو ایک دہکتا ہوا دل پہلو میں اور چمکتی ہوئی پیشانی' چہرے پر رکھتی ہو۔ اور چاندنی میں چاند کی طرح نکھر کر ستاروں کی چھاؤں میں ستاروں کی طرح چمک کر' پھولوں کی صف میں پھلوں کی طرح کھل کر اپنی جگہ نکال لے سکتی ہو"۔ (غبار خاطر)

اب سوچئے کہ جب "زندگی" نام ہو مسرت و شادمانی کا۔ جب دینی دستور حیات معلم ہو خنداں و رقصاں رہنے کا۔ جب فلسفہ حیات یہ قرار پاتا ہو کہ رو کر زندگی گزارنے سے بہتر ہے کہ ہنس کر عہد زندگی پورا کرو اور جب اخلاق کا تقاضا یہ ٹھہرا ہو کہ۔

(۱) "خوش رہنا محض ایک طبعی احتیاج ہی نہیں بلکہ ایک اخلاقی ذمہ داری بھی ہے۔ یعنی انفرادی زندگی کی نوعیت کا اثر صرف ہم ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ دوسروں تک متعدی ہوتا ہے یا یوں کہئے کہ ہماری ہر حالت کی چھوت دوسروں کو بھی لگتی ہے۔ اس لئے ہمارا اخلاقی فرض ہے کہ خود افسردہ خاطر رہ کر دوسروں کو افسردہ خاطر نہ بنائیں"۔

(۲) "یہاں ہماری کوئی بات بھی صرف ہماری نہیں۔ ہم جو کچھ اپنے لئے کرتے ہیں۔ اس میں بھی دوسروں کا حصہ ہوتا ہے۔ ہماری کوئی خوشی بھی ہمیں خوش نہیں کر سکے گی۔ اگر ہمارے چاروں طرف غمناک چہرے اکٹھے ہو جائیں گے۔ ہم خود خوش رہ کر ہی دوسروں کو خوش رکھ سکتے اور دوسروں کو خوش دیکھ کر ہی خود خوش ہو سکتے ہیں"۔

تو پھر یہ کس طرح ممکن تھا یا ہو سکتا ہے کہ اسلام اور اس کا ضابطہ قانون قرآن' فنون لطیفہ میں سے رقص و موسیقی کو' جو زندگی کو خوش رکھنے اور رکھانے کا سب سے بہتر و با اثر ذریعہ و ثبوت ہے۔ حرام و ممنوع قرار دے سکتا تھا یا دے سکتا ہے؟

مگر جب "اسلام" کو زبردستی "دین" کے بجائے "مذہب" بنا دیا گیا' جس کا فلسفہ حیات ہی صرف یہ ہے کہ ہر لطافت سے دور اور ہر بیوست سے نزدیک رہو' تو ظاہر ہے کہ رقص و موسیقی کو اسلام میں حرام وناجائز کیوں نہ ظاہر کیا جاتا؟ چنانچہ یونانی تمام علوم وفنون کے بانی وموجد سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ یونان کے بہت قدیم دیوتا "زیوس" کی نو بیٹیاں تھیں جو "میوزس" کہلاتی تھیں اور وہی تمام علوم وفنون کی بانی تھیں۔ اور انہیں سے "رقص وموسیقی" کا فن ایجاد ہوا۔ "میوز" کا تلفظ یونانی میں "موس" تھا جس طرح ہمارے یہاں نسبت کے لئے یائے معروف لگائی کی جاتی ہے۔ اسی طرح لاطینی اور یونانی میں "ق" لگایا جاتا ہے۔ اس قاعدہ کے مطابق وہ "موسیقی" یا "میوزک" ہو گیا۔ عربوں نے جب اس لفظ کو لیا تو یائے نسبت لگا کے "موسیقی" کر دیا۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے تو "رقص" کا معاملہ یوں ہی رہ جاتا ہے۔ دراصل یہ سب خرافات ہیں۔ "رقص وموسیقی" کے بانی کو تلاش کرنا حماقت کے سوا اور کچھ نہیں اور اسے صرف ترقی یافتہ یا مہذب ومتمدن قوم میں ڈھونڈنا مسخراپن

ہے۔ رقص و موسیقی کی موجد ہر قوم اور ہر سرزمین ہے۔ گانا اور رونا فطرت انسانی ہے۔ اور تمام بنی نوع انسان کا مشترک خاصہ ہے۔ جس روز جو شخص جس قوم کا سب سے پہلے کسی بات پر خوش ہو کے الاپایا اچھلا کودا اور جس دن جس جگہ کی جو عورت سب سے پہلے کسی مسرت کے جذبے سے سرشار ہو کر گنگنائی اور تھرکی' بس اسی دن' اسی جگہ اس قوم میں "رقص و موسیقی" نے جنم لیا۔ اس کو کسی خاص ملک و قوم اور کسی خاص زمانہ وقت سے وابستہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔

تصویر کشی یا تصویر بنی اور مجسمہ سازی ہی کی طرح فنون لطیفہ کے دوسرے شعبوں رقص اور موسیقی کو بھی اسلام میں مطلق حرام' ناجائز اور ممنوع قرار دے دیا گیا ہے اور مسلمان اگرچہ عملاً اس میں بھی کسی قدر حصہ لے بھی لیتے ہیں تو عقیدتاً" اسے غلط ہی سمجھتے یا بتاتے ہیں۔ لہٰذا فن کی حیثیت یا آرٹ کے لحاظ سے مسلمان اس میں کبھی گہری دلچسپی نہیں لیتے جس وجہ سے دوسری قوموں سے بہت پیچھے ہیں۔ حالانکہ اسلام نے ہرگز رقص یا موسیقی کو ممنوع نہیں قرار دیا اور نہ وہ کبھی حرام قرار دے سکتا تھا۔

رقص یا موسیقی ہے کیا۔ یہ ایک فطری جذبہ ہے۔ انتہائی جوش اور مسرت کے وقت ایک اضطراری فعل ہے۔ ایک وجدانی کیفیت اور روحانی سرشاریت ہے۔ ایک نشہ اور متوالاپن ہے۔ جس طرح غصے کے عالم یا رنج والم کی حالت میں انسان کے رونگٹے سے غضب والم کا اظہار ہوتا ہے۔ چہرے پر ایک رنگ آتا' ایک جاتا ہے' آنکھوں سے شعلے نکلنے لگتے ہیں۔ اعضاء میں ایک قسم کی اضطراری حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ زبان اور دل دماغ پر قابو نہیں رہتا۔ بالکل اسی طرح چونکہ خوشی و مسرت کا تعلق جذبات سے ہے اس لئے ایسے مواقع پر بھی انسان کی یہی حالت ہو جاتی ہے۔ اعضاء میں ایک قسم کی حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور انسان ہاتھ' پاؤں اور جسم کو ہلانے لگتا ہے۔

بچوں کو جب کسی امر پر مسرت ہوتی ہے تو وہ بے ساختہ ہاتھ پاؤں مار مار کر اچھلنے کودنے لگتے ہے۔ اس کا نام ہی "خوشی سے ناچنا" رکھا گیا ہے۔ مقدس سے

مقدس انسان اور ضابطہ سے ضابطہ سے آدمی بھی بعض مواقع پر انتہائی مسرت میں جھوم جاتا ہے۔ یہ حرکت گوبے ترتیب اور چند لمحوں کے لئے ہوتی ہے مگر فطری چیز ہونے کے باعث ہوتی ہر شخص میں ہے' چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ بڈھا ہو یا بچہ۔ یورپ کا مہذب ہو یا افریقہ کا۔ وحشی مومن ہو یا کافر۔ اگر اسی حرکت کی بے ترتیبی کو ترتیب دے دیا جائے۔ اسے اصول کی زنجیر میں جکڑ دیا جائے اور اس کا ایک نظام قائم کر دیا جائے تو یہی حرکت ایک فن ہے۔ جس کا اصطلاحی نام "رقص" ہے۔ رقص درحقیقت جذبات کا اظہار اور وجدانی کیفیت ہے جو الفاظ میں ادا ہونے سے پہلے حرکات سے ظاہر ہوتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ انسان اور حیوان دونوں کو جب غصہ آتا ہے یا انہیں مسرت ہوتی ہے تو ان کے منہ سے کوئی آواز نکلنے سے پہلے ان کے اعضاء وجوارح حرکت کرنے لگتے ہیں یا بچے اور گونگے' جو اظہار جذبات کے لئے الفاظ نہیں رکھتے یا نہیں پاتے۔ غصے میں ہاتھ پاؤں ٹپکنے لگتے ہیں مسرت میں ناچنے کودنے لگتے ہیں یا صوفی حضرت کے دلوں میں جب کوئی ایسا جذبہ پیدا ہوتا ہے جو الفاظ میں نہیں ظاہر کیا جا سکتا تو ان کے جسم میں ایک حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اٹھ کر رقص کرنے لگتے ہیں جسے خانقاہی اصطلاح میں "حال" کہتے ہیں۔ انسان جب تک غیرمہذب تھا وہ ان حالتوں پر نگاہ نہ رکھتا تھا۔ اس وقت تک یہ حرکتیں بے معنی سی سمجھی جاتی تھیں یا ناقابل اعتنا تھیں مگر انسان کے دل ودماغ نے ترقی کی' علم وعقل نے اسے سرفراز کیا تو ہر چیز کے اصول وضوابط مقرر کئے جانے لگے۔ چنانچہ فنی حیثیت سے جذبات کے اسی ابتدائی بے لفظ اظہار یعنی وجدانی حرکت کو "رقص" کا نام دیا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ "رقص" فطرت کی ایجاد ہے۔ شمس کنول نے خوب کہا ہے کہ ایک دریا موج میں آگیا۔ پانی لہرانے لگا۔ غیرارادی طور پر انسان نے دریا کی لہروں کو اپنی نظر میں یکجا کیا تو ناچ کا سا لطف آنے لگا۔ گو یہ رقص ایک فطری عمل ہے مگر جہاں تک کہ انسان کا تعلق ہے۔ دراصل حرکات جسمانی کو باقاعدہ بنانے کا نام "رقص" ہے مگر اس کو مکمل طور پر رقص جب ہی کہا جائے گا جب حرکات کی باقاعدگی کو موسیقی کی لے اور آواز کے نشیب وفراز سے بھی تعلق ہو۔ رقص ایک

فطری علم اس لئے ہے کہ احساس اور جذبہ ہر جاندار میں رقص کی تحریک پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ جانور بھی رقص کی فطری تحریک سے مبرا نہیں۔ مور کا ناچ' سانپ کا لہرانا' ہاتھی کا جھومنا' کبوتر کا مٹکنا' فاختہ کا پھڑپھڑانا رقص ہی ہے۔ لیکن انسانی رقص کا سبب جنسی نہیں بلکہ اس کے دوسرے سبب ہیں۔ انسانی رقص سے انسان کی بے پناہ خوشی کا اظہار ہے۔ پیار اور عقیدت کے جذبے کے تحت انسان ناچنے لگتا ہے جس کی ابتدا عبادت سے ہوئی اور اس لئے بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ فن "رقص" کی پرورش مذہب ہی کی آغوش میں ہوئی پھر جب "فن رقص" جس کی بنیاد رضاء الٰہی تلاش کرنے پر رکھی گئی ہے۔ حرام کیسے ہو جائے گا؟ قرآن یا حمد و نعت سن کر لوگ جھومنے لگتے ہیں۔ یہ کیا ہے؟ خانقاہوں میں جسے حال کہا جاتا ہے وہ کون سی چیز ہے؟ مشاعروں میں اچھے شعر پر لہک لہک کے جو داد دی جاتی ہے۔ اسے کیا کہا جائے گا؟ یہ سب رقص ہی ہے۔ مگر اس کی ابتدائی اور نامکمل شکل ہے۔ اعضا و جوارح کا یہی نامکمل یا ابتدائی فعل' جب باضابطہ کی حیثیت اختیار کر گیا تو اس کا اصطلاحی نام "رقص" ہو گیا۔

دراصل "رقص" کوئی خراب چیز نہیں اور نہ موسیقی معیوب ہے مگر اس فن کی بدنامی ایسی ہو گئی ہے کہ ہمارے ذہن میں اس کا کوئی اچھا تصور قائم ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ معیوب و مذموم ہوتا ہے۔ معاشرت کی خرابی نے نسوانی وقار و حیاداری سے قطع نظر کر کے رقاصاؤں کو اسٹیج پر پیش کرنا شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ رقص و موسیقی سے لوگوں کو نفرت ہو گئی ہے۔ حالانکہ یہ فن کا قصور نہیں بلکہ معاشرت کا قصور ہے۔ اگر معاشرت درست ہو جائے اور رقص کی حیثیت فن کی قائم ہو جائے تو ہمارا تصور بھی بدل جائے اور جب تک معاشرت عمدہ تھی رقص کا تصور بھی عمدہ تھا اور مسلمانوں کے خلفاء نے جن کے درباروں میں علماء و فقہا بھی ہوتے تھے۔ اس فن کی بلحاظ فن پذیرائی کی تھی۔ یہی حال موسیقی کا ہے۔

غصہ و مسرت دونوں حالتوں میں اعضا و جوارح کی حرکت کے بعد ان جذبات کا اظہار الفاظ میں کیا جاتا ہے ننھے بچے اس پیدا شدہ فطری جذبے کے اظہار میں حرکت کرتے' ہاتھ' پاؤں ہلانے اور ٹپکنے کے بعد رونے لگتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ ان جذبات

کے اظہار کے لئے الفاظ نہیں رکھتے۔ گونگے اور جانور بائیں بائیں کرنے اور طرح طرح کی آوازیں نکالنے لگتے ہیں۔ اس لئے کہ انہیں ان جذبات وکیفیت کے اظہار کے لئے الفاظ میسر نہیں۔ اچھے انسان' جو اظہار جذبات کے لئے الفاظ نکالتے ہیں۔ حرکتی اظہار کے بعد منہ سے اسی جذبے کے تحت الفاظ نکالتے ہیں۔ جب تک یہ مسرت والم کے مظہر الفاظ فن کی قید میں نہ آئے تھے' محض الفاظ تھے جنہیں کوئی فنی حیثیت حاصل نہ تھی اور جب انہیں فنی حیثیت دی گئی تو اسی کو "شعر" اور "موسیقی" کہا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح "رقص" "موسیقی" اور "شاعری" ایک فطری جذبے کے اظہار کا محض صورتی وصوتی' علمی یا فنی یا اصلاحی نام ہے اور اسلام جو دین فطرت کا علم بردار ہے۔ اس فطری جذبے کے اظہار پر کبھی کوئی پابندی عائد نہ کر سکتا تھا اور نہ ہرگز عائد کرتا ہے۔ چنانچہ اسلام کا جو خدائی قانون قرآن کی صورت میں مدون ہے۔ ہرگز اس فن لطیف پر کوئی قید نہیں لگاتا۔

امام غزالی کی "کیمیائے سعادت" مذہبی طبقے میں بہت مشہور ومقبول کتاب ہے انہوں نے اس کے دوسرے رکن کی آٹھویں فصل "راگ اور حال کے آداب کے بیان میں" ہے۔ اس میں ہے کہ:۔

> ام المومنین حضرت بی عائشہؓ صدیقہ روایت فرماتی ہے کہ عید کے دن مسجد میں حبشی کھیل اور بازی کرتے تھے۔ رسول مقبول نے مجھ سے فرمایا کہ تم چاہتی ہو کہ دیکھو؟ میں نے کہا ہاں چاہتی ہوں۔ آپ دروازے پر کھڑے ہوئے اور دست مبارک بڑھا دئے۔ حتیٰ کہ میں نے اپنی ٹھوڑی آپ کے دست مبارک پر رکھی اور اتنی نظارت اور سیر کی کہ آپ نے کئی بار فرمایا کہ بس نہ کرو گی؟ میں نے کہا نہیں۔ اور یہ حدیث صحیح ہے اور ہم پہلے اس کتاب میں بیان کر چکے ہیں اور اس حدیث سے پانچ اجازتیں اور رخصتیں معلوم ہوئیں:۔
>
> ا۔ ایک یہ کہ کھیل اور لہو اور اس کی نظارت اور سیر اگر گاہ گاہ ہو تو حرام نہیں ہے اور حبشیوں کا کھیل رقص وسرور تھا۔

۲۔ دوسرے یہ کہ مسجد میں بازی کرتے تھے۔

۳۔ تیسرے یہ کہ حدیث میں ہے کہ رسول مقبولؐ جس وقت حضرت بی عائشہؓ کو وہاں لے گئے تو فرمایا دونکم یا بنی ارفدہ یعنی "کھیل میں مشغول ہو" اور یہ حکم ہے تو جو چیز حرام ہوتی اس کا آپ کیوں حکم فرماتے؟

۴۔ چوتھے یہ کہ آپ نے حضرت بی عائشہؓ سے پہل کی اور فرمایا کہ چاہتی ہو کہ دیکھو؟ اور فرمانا تقاضا ہے۔ یہ ویسا نہیں ہے کہ وہ دیکھتی ہوتیں اور آپ خاموش رہتے تو ممکن تھا کہ کوئی یہ کہتا کہ آپ نے ان کو رنجیدہ کرنا نہ چاہا کیونکہ رنجیدہ کرنا بدخوبی ہے۔

۵۔ پانچویں یہ کہ آپؐ خود حضرت عائشہؓ کے ساتھ دیر تک کھڑے رہے۔ باوصف اس کے کہ نظارہ بازی آپ کا کام نہ تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں اور لڑکوں کی موافقت کے واسطے ایسے کام کرنا خلق نیک ہے تاکہ ان کا دل خوش ہو اور اپنے تئیں کھینچنے اور پارسائی جتانے سے یہ بہتر ہے۔

غور فرمایئے' مسجد نبوی میں جو کھیل ہو رہا تھا اور جس کی روایت صحیح بخاری میں ہے۔ اس کے بارے میں حجتہ الاسلام امام غزالی فرماتے ہیں کہ وہ "رقص و سرود" تھا اور اس رقص و سرود کو جناب رسالتماب نے خود کہہ کر ام المومنین کو دکھایا۔ مگر وہ حرام بتایا جاتا ہے۔

امام غزالی نے "کیمیائے سعادت" میں صوفیوں کے حال کو بھی "رقص" بتایا ہے اور بار بار رقص کو جائز بتایا ہے۔ مثلاً" ایک جگہ فرمایا ہے:۔

"رقص مباح ہے اس واسطے کہ حبشی مسجد میں رقص کرتے تھے اور حضرت بی عائشہؓ دیکھنے تشریف لے گئیں اور رسول مقبول صلعم نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ تم مجھ سے ہو اور میں تم سے۔ حضرت علیؓ نے اس کی

خوشی میں رقص کیا اور کئی بار پائے مبارک زمین پر مارا جیسے کہ عرب کی عادت ہے کہ خوشی اور نشاط کی حالت میں کیا کرتے ہیں اور حضرت امام حسین سے فرمایا کہ صورت و سیرت میں تم میرے مانند ہو تو انہوں نے بھی خوشی سے رقص فرمایا اور حضرت زید ابن حارثہ سے فرمایا کہ تو میرا مولا بھائی ہے تو انہوں نے بھی خوشی کے مارے رقص کیا۔ تو جو شخص رقص کو حرام کہتا وہ خطا کرتا ہے۔

مسلمانوں کے یہاں ابتدائی عہد اسلام سے رقص و سرود رائج ظاہر ہوتا ہے۔ تاریخ سے اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ آغانی جلد نمبر۱ صفحہ نمبر۱۷۵ کے حوالہ سے "فجر اسلام" میں داؤد ثقفی کی روایت بیان کی ہے کہ:

"ہم ابن جریج کے حلقہ میں بیٹھے تھے جو ہم سے حدیثیں بیان کر رہے تھے۔ ان کے پاس بڑے بڑے لوگ بیٹھے تھے جن میں عبداللہ المبارک اور کئی دوسرے عراق کے فقہا اور محدثین بھی تھے۔ یکایک سامنے سے ابن میزن مغنی ..... کا گذر ہوا۔ ابن جریج نے اسے بلایا اور اس سے کہا کہ بھیا کچھ گانا تو سناؤ ..... آخر اس نے گانا سنایا اور کہنے لگا کہ اگر تمہارے پاس یہ بوجھل لوگ نہ بیٹھے ہوتے تو میں دیر تک بیٹھتا حتی کہ تمہارا شوق پورا کر کے اٹھتا۔ اس پر ابن جریج نے حاضرین کی طرف متوجہ ہو کر حیرت سے پوچھنے لگے کہ کیا تم لوگوں کو میرا یہ فعل ناپسند ہوا؟ اس پر لوگوں نے کہا کہ ہاں ہم لوگ عراق میں اسے پسند نہیں کرتے۔ ابن جریج نے کہا کہ رجز گوئی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ اور حدی خوانی کے متعلق تم کیا کہتے ہو؟ وہ لوگ کہنے لگے کہ ہمارے نزدیک تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ابن جریج نے کہا کہ آخر رجز اور حدی خوانی اور موسیقی میں فرق کیا ہے؟" (صفحہ نمبر۵۱۹)

سنا آپ نے ایک محدث نے' جلسہ حدیث میں پاس سے جب ایک مغنی کو گزرتے دیکھا تو اس کو بلوا کے گانا سنا۔ اگر یہ حرام ہے تو اس محدث نے یہ حرام کام

کیوں کیا؟ دراصل یہ بے بنیاد بات ہے۔ تاریخ سے رقص و موسیقی عرب میں ابتداء سے مروج ثابت ہوتا ہے۔

علامہ نیاز فتح پوری نے "نگار" (لکھنؤ کے علوم اسلامی و علماء اسلام نمبر) میں جنوری و فروری ۱۹۵۵ء لکھا ہے کہ:۔

دوسری قدیم قوموں کی طرح' عرب جاہلیت میں بھی "رقص" کا رواج پایا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ بعض علماء کا خیال ہے کہ کعبہ کا طواف جو زمانہ جاہلیت میں ہوتا تھا وہ بھی ایک قسم کا رقص تھا۔ آیت "**وما کان صلاتھم عند البیت الا مکاء و تصدیۃ**" کی تفسیر میں زمخشری اور بیضاوی لکھتے ہیں کہ "عورتیں اور مرد ایک دوسرے کی انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر سیٹیاں اور تالیاں بجاتے ہوئے برہنہ طواف کرتے تھے۔" اہل عرب اسلام لانے کے بعد بھی نغمات اشعار پر رقص کرتے تھے اور سب سے پہلا لحن جو خاص طور پر اس کے لئے بنایا گیا تھا۔ "لحن خفیف" تھا۔ اس کے بعد رقص کی مناسبت سے خاص قسم کی لحن اور بحروں کا اضافہ ہوا جن میں ہزج رمل اور خفیف الرمل داخل ہیں۔ الغرض "رقص" عربوں کے ہاں ایام جاہلیت اور اسلام' دونوں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ اسلامی دور میں جو رقص ہوتا تھا وہ بہ اقتضائے ترقی و تمدن زیادہ بہتر اور ترقی یافتہ تھا۔

مسلمانوں نے "رقص" کا شمار "علوم و فنون" میں کیا ہے اور صرف کھیل اور دل بہلانے کی چیز تصور نہیں کیا۔ اور اس فن پر متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ جو ممالک' اسلامی حکومتوں کے زیر نگیں تھے۔ ان کے مختلف حصوں میں مختلف قسم کے رقص پائے جاتے تھے۔ اہل خراسان' فارس' مصر' مغرب اور اندلس' سب کا رقص ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ بلکہ ایک حکومت کا طرز رقص' دوسری حکومت کے طرز رقص سے مختلف تھا دولت اموی و عباسی میں جو رقص کی قسمیں اور شکلیں تھیں۔ وہ حکومت ہائے اندلس مغرب' فارس اور ترکوں سے علیحدہ تھیں۔ اسی طرح فاطمیں اور ممالیک کے عہد حکومت کے رقصوں میں اختلاف تھا۔ اسی طرح عورتوں اور مردوں کا رقص ایک دوسرے سے علیحدہ صورت رکھتا تھا۔ عہد عباسیہ میں اقسام رقص آٹھ تھے۔

خفیف، ہزج، رمل، خفیف الرمل، ثقیل الثانی، خفیف الثانی، خفیف الثقیل الاول اور ثقیل الاول۔

تاریخ اسلام میں بہت سے مشہور رقاصوں کے نام محفوظ ہیں۔ دولت عباسیہ کے زمانہ عروج میں کیش اور عبدالسلام، فن رقص میں بڑے کامل ماہر گزرے ہیں۔ صاحب آغانی نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ یہ دونوں نہایت باکمال رقاص تھے لیکن اسحق موصلی جو عربی موسیقی میں زبردست ماہر گزرا ہے۔ رقص میں ان دونوں پر سبقت لے گیا ہے۔ ابوالفرج اصفہانی، اسحاق موصلی کے اس رقص کا تذکرہ کرتے ہوئے جو واثق باللہ کے سامنے اس نے کیا تھا۔ لکھتا ہے۔ اسحاق کھڑا ہوا اور اس نے نہایت طرب انگیز رقص کیا۔ اس کا رقص کیش اور عبد السلام سے بھی بہتر تھا۔ حالانکہ وہ دونوں نہایت اچھا رقص کرنے والے شمار کئے جاتے ہیں۔ اس پر واثق باللہ نے کہا۔ اسحاق سے زیادہ کوئی اس فن میں کمال نہیں رکھتا"۔

مصرواندلس میں تمدن اسلامی کے عہد عروج میں فن رقص میں بہت سے لوگوں نے کمال پیدا کیا تھا۔ اس دور کے مشہور رقاص جنہوں نے تمام اسلامی ممالک میں شہرت حاصل کی تھی اور وہ بادشاہوں کے حضور میں رقص کرتے تھے۔ حیدربن احمد بن ابراہیم ابوالحسن اور اس کے بھائی ابراہیم تھے۔ یہ دونوں ملک اشرف شاہ مصر کے دربار میں حاضر ہوئے اور رقص و موسیقی کا کمال دکھایا۔ ابن حجر نے "درر کامنہ" میں اس کا تذکرہ کیا ہے ان کے علاوہ مشہور رقص ———— کرنے والوں میں جعفر رقاص بھی تھا۔ دولت عباسیہ کے زمانہ ترقی میں رقص کے لئے خاص قسم کے آلات بھی ایجاد کئے گئے تھے۔ جنہیں خیال، کرج، ورطہ، مونس، کیشہ، لازمی، شقرہ، فناء، عور، قانون اور رباب کہتے تھے اندلس کی رقاصہ عورتیں اپنے فن کے لحاظ سے مشہور تھیں اور تلوار سے کھیلنے میں بھی خاص مہارت رکھتی تھیں۔

تمدن اسلام کے دور ترقی میں "رقص" صرف عورتوں اور عام مردوں تک محدود نہ تھا بلکہ خاص لوگوں میں بھی پایا جاتا تھا اور فقیہہ، محدث، طبیب، قضاۃ اور صوبوں کے گورنر بھی اس میں عملی حصہ لیتے تھے"

سوچنے کہ اگر "رقص" اسلام میں حرام یا ناجائز تھا تو اس فن میں محدث' فقیہہ اور قضاۃ کس طرح حصہ لیتے تھے؟ یہ عجیب تماشا ہے کہ خدا کی جتنی مخلوق ہے وہ محور رقص ہے۔ آسمان کے سارے کرے رقص کر رہے ہیں۔ زمین اور اس کے ساتھ ہر شے ہر وقت محور رقص ہے۔ چاند اور سورج چوبیس گھنٹے ناچ رہے ہیں۔ مگر ہم سے کہا جاتا ہے کہ "رقص" اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے۔ اور اس نے "رقص" کو مسلمانوں پر حرام کر دیا ہے۔

علامہ نے اسی نمبر میں "رقص" سے پہلے دو صفحے میں مسلمانوں کی موسیقی کی بھی تاریخ سے بحث کی ہے۔ اور نہ صرف بڑے بڑے مسلمان ماہرین موسیقی کا ذکر کیا ہے بلکہ ان کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے جو مسلمانوں نے اس فن پر تصنیف کیں یا جن میں عربوں کی عہد اسلام کی موسیقی کی تاریخ بیان ہوئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عہد اسلامی میں شروع سے بڑے بڑے محدث' مفسر' مقنن اور مدبر اس فن سے دلچسپی لیتے رہے اور کوئی زمانہ ایسا نہیں ہوا جس میں موسیقی حرام رہی ہو۔

"موسیقی" اسلام میں اگر حرام وناجائز ہے جیسا کہ عام طور سے مشہور کیا گیا ہے تو اس کی خبر ابتداء عہد اسلام کے مسلمانوں کو زیادہ تھی۔ مگر تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسی عہد میں بڑے بڑے مسلمان مرد اور عورتیں اس فن کے ماہر ہوتے ہیں اور بہتوں نے اس فن پر اہم کتابیں تصنیف کی ہیں۔ مثلاً صاحب "آغانی" نے مالک کا ذکر کیا ہے جو عبداللہ بن جعفر کا متبنی اور شاگرد تھا۔ اس کا سال وفات ۱۳۷ھ (۷۵۴ء) ہے۔ اس کا قیام مدینہ میں تھا وہیں رہا وہیں مرا۔ اس نے ۶۴ھ (۶۸۴ء) میں کعبہ کے گانے سے متاثر ہو کر اس فن کو حاصل کیا۔ خود عبداللہ بن جعفر ماہر موسیقی تھے۔ انہوں نے اس کی پوری تربیت کی۔ مالک نے اس دور کی مشہور مغنیہ جمیلہ سے بھی فن کی تکمیل کی تھی۔ یزید بن عبدالملک اموی خلیفہ اس کا بڑا قدردان تھا۔ اسحاق موصلی جو دوسری صدی ہجری کا بے مثل نامور مغنی ہوا ہے اور جس کا انتقال ۱۸۸ھ (۸۰۴ء) میں ہوا' مالک کو عرب کے اس عہد کے چار نہایت ماہر ومستند گویوں میں شمار کرتا تھا۔ اسی طرح یونس اور الخلیل نے موسیقی پر کتابیں دوسری صدی ہجری میں لکھی

تھیں۔ اب اگر دوسری صدی ہجری کے اور مدینہ کے مسلمان موسیقی کے ماہر تھے۔ اور ان کے یہاں محافل غنامنعقد ہوا کرتی تھیں تو تیسری اور چوتھی کی۔ موسیقی کو حرام بتانے والی روایتیں کس شمار قطار میں ہیں؟ علامہ ریاست علی ندوی۔ "تاریخ صقلیہ" جلد نمبر ۲ صفحہ نمبر ۱۷۴ پر لکھتے ہیں۔

"لحن و موسیقی کو طبائع انسانی سے مناسبت ہوتی ہے۔ اس کے لئے بدویت حضریت کی کوئی قید نہیں۔ تاہم جب کوئی قوم تمدن کی تراش خراش کے بعد۔ عیشات و تکلفات کی منزل میں قدم رکھتی ہے تو موسیقی بھی معاشرت واجتماع کا ایک لازمی جزو قرار پاتی ہے۔ صقلیہ میں عربوں سے پیشتر بھی جو قومیں آباد تھیں ان میں موسیقی کا عام رواج تھا۔ مسلمانوں کے تمدن کے آغاز کے بعد عباسی واموی خلفاء کے درباروں میں شعراء کے مدحیہ قصائد مغنیوں سے سنے جانے لگے۔ اسی طرح موسیقی کو درباروں میں جگہ ملی"

فنون لطیفہ میں موسیقی' رقص وغیرہ دراصل انسان کے تخلیقی جذبے کی ایسی پیداوار ہیں جو غیر شعوری طور پر عالم وجود میں آئی ہیں۔ اس لئے خدا پرستی اور مذہبی رنگ میں یہ چیز موجود ہے اور بہت عرصے سے پائی جاتی ہے۔

بیسویں صدی کے عظیم بنگالی شاعر و موسیقار رابندر ناتھ ٹیگور کا قول ہے کہ:۔

"جب الفاظ ختم ہو جاتے ہیں۔ تب موسیقی شروع ہوتی ہے"

مطلب یہ ہے کہ موسیقی وہ کلام ہے جو مختلف زبانوں کے الفاظ یا مختلف تصورات کی شرح کو جذبات کی دنیا سے بغیر کلام کے قریب لے آتی ہے۔ بالفاظ دیگر جس جذبہ کو زبان' الفاظ میں اظہار نہیں کر پاتی اسے موسیقی دل آویز انداز میں بیان کر دیتی ہے۔ ٹیگور "برہمو" تھے یعنی وہ موحد جو انسان کو صرف انسان کی حیثیت سے قابل احترام سمجھے۔ انہوں نے اپنی قائم کردہ "وشو بھارتی" (ہمہ گیر اخوت) میں جو موسیقی کا شعبہ قائم کیا تھا۔ اس کی وجہ یہی بتائی تھی کہ موسیقی روحانی چیز ہے چنانچہ وسو بھارتی میں جو "خدا کا مندر" قائم ہے وہاں ہفتہ کے پہلے دن سارے طالب علم' سورج نکلنے

سے پہلے نہا دھو کر خدا کی حمد گاتے ہیں اور یہاں وہی نغمہ چھڑتا ہے۔ جسے "منا جاتی نغمہ" کے نام سے ہندوستان کے صرف برہمن ہی الاپا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:۔

لو ان ما فی لا رض من شجرۃ اقلام والبحر یمدہ من بعدہ سبعتہ ابحر ما نفذت کلمت اللہ۔ (لقمٰن ۳)

ترجمہ "کہ ارض پر جتنے درخت ہیں وہ قلم بن جائیں اور یہ جو سمندر ہیں ان کے علاوہ وہ سات سمندر اور ہوں اور وہ دوات بن جائیں تو بھی اللہ کی باتیں ختم نہیں ہو سکتیں"

انداز یہ ہے کہ اظہار عبودیت کی اسی بے بسی وبیچارگی کے پیش نظر خدا کی حمد کے لئے تحریر وتصویر کو ناکافی سمجھ کے موسیقی کو عبادت کے لئے اپنایا گیا اور اظہار جذبات کا ایک جان نواز ودل نشین انداز اختیار کیا گیا۔

رقص وموسیقی کے مذہبی تقدس کا درجہ زمانہ قبل از تاریخ سے ثابت ہے۔ روایتوں کے مطابق برہام دیوتا نے سب سے پہلے رقص وموسیقی کا تصور پیش کیا تھا۔ انہوں نے تمام ویدوں کی اچھی اچھی باتوں کو یکجا کر کے ایک ناٹیہ وید مرتب کیا تھا جس کا مقصد روحانی ترقی کی طرف انسانوں کو لے جانا تھا۔ اس وید میں برہما نے کہا ہے:

"ناٹیہ میں آتما (روح) اور اخلاق کی سچائی پیش کی گئی اور یہ سچائی مختلف قسم کی کلا (آرٹ) سے نمایاں ہے"

چنانچہ اسی بنا پر رقص وموسیقی دونوں آرٹ یا کلا یا فن کی ابتداء ہندوؤں کے مندروں اور مقدس عبادت گاہوں سے ہوئی اور ہرچند کہ اب یہ صرف رسم ومذاق ہو کر رہ گیا۔ جیساکہ ہرمذہب میں ہوا ہے۔ تاہم آج تک مندروں میں ان کی عبادت کا لازم جزو بھجن ہے۔ سوراشٹر کے دیہات میں آج بھی وہی رقص وموسیقی اسی تمثیلی انداز سے رائج ہے جو کرشن جی کے وقت میں وہاں رائج تھی۔ عیسائیوں کے گرجوں' عبادت گاہوں اور خانقاہوں میں بھی آپ نے دیکھا ہو گا کہ عبادتیں نہ صرف آلات

موسیقی سے کی جاتی ہیں بلکہ دعائیں بھی لحن میں مانگی جاتی ہیں۔ خود مسلمان کے یہاں قرآن بھی لحن سے پڑھا جاتا ہے۔

علامہ محمد حنیف ندوی' رکن ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور نے اپنے مضمون "فہم قرآن" (مطبوعہ ثقافت لاہور) دسمبر ۱۹۶۰ء میں لکھا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ:

زینوا القران باصواتکم۔

ترجمہ "قرآن کو حسن صوت سے آراستہ کرو"

آگے وہ لکھتے ہیں:

ایک مرتبہ' آنحضرت" حضرت عائشہؓ کے انتظار میں تھے۔ وہ تاخیر سے آئیں تو آپؐ نے دریافت فرمایا کہ "تمہیں کس چیز نے روکے رکھا تھا؟" آپ نے کہا"میں ایک ایسے خوش آواز شخص کی آواز سن رہی تھی۔ جس سے بہتر پڑھنے والا میں نے نہیں دیکھا۔ آنحضرت اٹھے اور حضرت عائشہؓ کے ساتھ ہوئے اور جا کر خود قرات سماعت فرمائی پھر بولے اور کہا کہ "سالم بن حذیفہ کے غلام ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری امت میں اس مرتبہ کے پڑھنے والے پیدا کئے ہیں" آنحضرت صلعم کا معمول تھا کہ خوش الحان صحابہ سے قرآن سنتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ عبداللہ بن مسعود سے قرآن پڑھنے کو کہا۔ انہوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ ! کیا میں آپ کو سناؤں؟ حالانکہ آپ ہی پر تو یہ صحیفہ خداوندی نازل ہوا ہے" آپ نے فرمایا "میں چاہتا ہوں دوسروں سے سنوں" اس پر انہوں نے پڑھنا شروع کیا اور آنحضرت کے تاثرات کا یہ عالم تھا کہ آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا۔ ایک دفعہ ابوموسیٰ سے قرآن سننے کا اتفاق ہوا۔ یہ ایسے خوش الحان تھے کہ ان الفاظ میں آپ نے داد دی:

"انہیں آل داؤد کے مزامیر سے نوازا گیا ہے"

ان الفاظ کو ذہن میں محفوظ رکھئے کیونکہ اس کا ذکر آگے آئے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن جب خوش الحانی سے پڑھا جاتا ہے تو دل میں ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ کیا ہے؟ نغمہ ہی کا تو اثر ہے۔ درحقیقت قرآن ایک خاص نوع کے ترنم

وموسیقی کا عجیب وغریب صحیفہ ہے۔ محمد حنیف ندوی نے مسئلہ اجتہاد میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:۔

"مویدات فہم قرآن میں سے ایک فواصیل وخواتیم آیات بھی ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ کا مقصد اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ قرآن حکیم کے ہر ہر سلسلہ آیات میں جو ایک طرح کا ترنم وموسیقی ہے ان الفاظ سے ان کو قائم رکھا جائے۔ یہ عجیب بات ہے کہ قرآن اگرچہ شعر نہیں (۹۔۳۶۔۷) لیکن اس میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جس سے شعر شعر کہلاتا ہے۔ وہی مضامین کی گہرائی اور دقت معانی ہے۔ وہی الفاظ کا انتخاب ہے اور موزونیت کے ساتھ انکا استعمال۔ اور اگرچہ بحر کی اس میں کوئی قید نہیں پھر بھی ہر ہر سورت یا آیات کے لئے ایک خاص صوت کا سانچہ مہیا فرمایا ہے۔ جن میں ایک مضمون سے متعلق آیات ڈھلتی چلی گئی ہیں اور جن الفاظ پر اس سلسلہ آیات کو ختم کیا ہے وہ تو اس درجہ اس صوت اور ترنم سے مناسبت رکھتے ہیں کہ بعض حضرات نے ازراہ سہل انگاری اگر یہ سمجھ لیا ہے کہ ان کی غرض ہی آیات سابقہ کی موسیقت ظاہر کرنا اور یہ بتانا ہے کہ یہ آیات کن مخصوص صوتی فضا سے متعلق ہیں تو وہ قطعی معذور ہیں کیونکہ ان کا ایک مقصد بلاشبہ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ قرآن حکیم نے اس نظم اور آواز کی مناسبتوں کو کس حد تک اپنے اسلوب بیان میں مرعی رکھا ہے اور محض ان کی وجہ سے کن کن عام نحوی قواعد کو توڑا ہے۔ یہ ایک دلچسپ اور علمی بحث ہے"

(صفحہ نمبر ۵۴)

مسجدوں کے پیش نماز اور موذن کے انتخاب میں ایک چیز یہ بھی دیکھی جاتی ہے کہ وہ خوش آواز ہے یا نہیں؟ رسول اللہؐ کی شان میں نعت گانا ایک ثواب کا کام مانا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی خانقاہوں میں قوالی اسی جذبے کے پیش نظر ہوتی ہے۔

خواجہ حسن نظامی صاحب نے اپنے "روزنامہ سفر" میں صفحہ نمبر ۱۹۸ و ۱۹۹ کے درمیان ایک تصویر شائع کرائی ہے جو مولانا رومی کے سلسلہ والوں کے حلقہ ذکر کی

تصویر ہے۔ اس میں دس بارہ مشائخ پورے جوش کے ساتھ رقص کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تصویر کے نیچے یہ عبارت لکھی ہوتی ہے:۔

"مولو یہ خاندان کا حلقہ ذکر جس میں یہ لوگ رقص کر کے ذکر کرتے ہیں اور ذکر میں بعض لوگوں کو وجد بھی آ جاتا ہے"

صفحہ نمبر ۲۰۷ میں انہوں نے ان رقاص مشائخ کا بطور خاص ذکر بھی کیا ہے یہی انداز ذکر ہے جو ہندو مذہب میں بھجن کے نام سے موسوم ہے۔ بہت ممکن ہے کہ حضرت داؤد کے ذکر و فکر کی نوعیت بھی یہی ہو۔ دراصل یہ اس جذبہ کا اثر ہے جو فطرت کی خاص ودیعت ہے۔ مذہبی اجتماعوں میں قرآن کسی خوش لحن قاری اور نعت کسی اچھے گانے والے سے پڑھوانے کا رواج بھی اسی جذبے کے تحت ہے کیونکہ اس سے فطری جذبے کو تسکین ملتی ہے۔ گانے یا خوش آوازی پر ہر انسان کا چونک کر متوجہ ہو جانا اور مست ہو کر جھومنے لگنا محض اسی وجہ سے ہے کہ اس کا تعلق انسانی فطرت سے ہے اور فطرت پر پابندی عائد کرنا اسلام کا وطیرہ نہیں۔ آج مسلمان تو نغمہ سنج اور خوش آواز طوائفوں کے ہاں پائے جاتے ہیں۔ مگر بنگالی' ہندو تو قطعاً" نہیں پائے جاتے کیونکہ مسلمانوں کے یہاں رقص و موسیقی حرام قرار پا گئی ہے۔ اس لئے نہ وہ خود سیکھ سکتے اور نہ گھر والوں کو سکھاتے ہیں اور فطری جذبے کے مطالبے کو پورا کرنے کی غرض سے وہ طوائفوں کے یہاں پہنچ جاتے ہیں۔ بہ خلاف اس کے ہندو بنگالی خود رقص و موسیقی میں دخل رکھتا ہے اور اس کے گھر والے موسیقی و رقص کے ماہر ہوتے ہیں اس لئے وہ سامان تسکین اپنے گھر ہی میں پا لیتا ہے۔ اسے طوائفوں کے یہاں جانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

ہندوستان کے پیغمبر کرشن جی مانے جاتے ہیں۔ انکا نغمہ ریزی کا سب کو علم ہے۔ بھلا وہ کس طرح بانسری پر گا سکتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک نغمہ و سرود حرام ہوتا؟ چینی پیغمبر کنفیوشس کو مسلمہ طور پر اللہ کا رسول سمجھا جاتا ہے ان کے جو حالات ہم تک پہنچے ہیں وہ ظاہر کرتے ہیں کہ کنفیوشس بہترین نغمہ سنج تھے۔ ایک تاریخی واقعہ بہت مشہور ہے کہ جب انہوں نے سنا کہ دور دراز ریاست میں ایک ماہر موسیقی سیانگ

نامی رہتا ہے جو قدیم موسیقی کا استاد کامل ہے' تو کنفیوشس بڑی مشقتیں اٹھا کر وہاں تک پہنچے۔ سیانگ نے ان کی خواہش پر اپنے ساز پر ایک نغمہ چھیڑا جس کو شہزادہ وان وانگ نے ترتیب دیا تھا۔ کنفیوشس مدہوش ہو کر سنتے رہے۔ دس دن تک یہ سلسلہ رہا۔ اس کے بعد سیانگ نے خواہش ظاہر کی کہ کنفیوشس بھی کچھ سنائیں۔ کنفیوشس نے نہایت خوبصورتی اور عمدگی سے وہی نغمے سنائے جس کو سن کر سیانگ بے خود ہو گیا۔ جب اس نے مزید خواہش ظاہر کی کنفیوشس نے جواب دیا کہ:

"مجھ کو مہلت دیجئے۔ آپ کی مہربانی اور شفقت سے میں اس نغمہ کو صحیح ادا کر سکا۔ لیکن ابھی تک شہزادہ کے دلی جذبات تک میری رسائی نہیں ہو سکی اور اس لئے میرا اطمینان نہیں ہوا"

سیانگ نے مہلت دی۔ دس دن بعد کنفیوشس نے سیانگ کے پاس آ کر فرمایا:

"میں نے پالیا' میں نے پالیا' ہر چیز اور ہر معاملہ میرے لئے حل ہو گیا۔ گویا کہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں' میں نے ساز اٹھایا' بجانا شروع کیا اور ہر سر کا پوشیدہ مفہوم میرے قلب کی گہرائیوں میں اترتا گیا۔ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا شہزادہ وان وانگ میرے سامنے کھڑا ہے اور میں اس کی بڑی بڑی چمکیلی آنکھوں کو دیکھ رہا ہوں اور اس کی مقدس اور پاکیزہ آواز سن رہا ہوں۔ میرا دل خود بخود اس کی طرف کھنچ رہا تھا گویا کہ ہم دونوں باوجود دو مختلف وجود ہونے کے خیالات کی ہم آہنگی سے ایک تھے"

اس کے بعد کنفیوشس نے وہ نغمہ اپنے ساز پر چھیڑا جسے سنتے ہی وان سیانگ کنفیوشس کے آگے کھڑا ہو کر کہنے لگا۔

"آپ کی نظر اتنی گہری اور آپ کا فن اتنا اکمل ہے کہ میں آپ کا استاد بننے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کے شاگردوں کے حلقے میں شامل ہو جاؤں"

کنفیوشس کے حالات میں یہ واقعہ درج ہے تو اس میں شک ہی نہیں کہ یہ چینی

مفکر پیغمبر تھا۔ مگر اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہزادہ وان وانگ اور سیانگ بھی برگزیدگی کے حامل تھے۔ اور موسیقی و نغمہ ریزی ان کا ذریعہ اجتماع۔ اگر نغمہ و سرود' لہو و لعب ہونے کی وجہ سے حرام ہوتا تو یہ برگزیدہ اشخاص اسے کبھی نہ اپناتے امام غزالی نے لکھا ہے کہ:۔

"عالم علوی' عالم حسن وجمال ہے اور اصل حسن وجمال تناسب ہے اور جو چیز متناسب ہے۔ وہ اس عالم کے جمال سے کسی کلام کی نمود ہے اور اس عالم محسوس میں جو حسن وتناسب ہے وہ اس عالم کے حسن وجمال کا ثمرہ ہے تو اچھی اور موزوں ومتناسب آواز بھی اس عالم کے عجائبات سے مشابہت رکھتی ہے۔ اس سے دل میں آگاہی پیدا ہوتی ہے اور ایک حرکت اور شوق پیدا کر دیتی ہے ــــ اگر دل خالی نہ ہو اور کسی چیز کے ساتھ مشغول ہو تو جس چیز کے ساتھ دل مشغول ہوتا ہے۔ اچھی آواز سننے سے وہ چیز اس طرح حرکت میں آتی ہے جیسے پھونکنے سے آگ زیادہ بھڑک جاتی ہے۔ جس کے دل میں حق تعالے کے شوق کی آگ ہو اس کے واسطے سماع ضرور ہے تاکہ وہ آگ زیادہ تیز ہو جائے"

انہوں نے خود ایک سوال کیا ہے کہ:۔

"اگر کوئی کہے کہ جب صوفیوں کا سماع حق ہے اور حق تعالے کے واسطے ہے تو چاہئے کہ دعوتوں میں پڑھنے والوں کو بٹھاتے اور قرآن شریف پڑھواتے نہ کہ قوالوں کو کہ گائیں"

پھر اس کا لمبا جواب دیا ہے اور متعدد اسباب بیان کئے ہیں اور کہا ہے کہ اگرچہ قرآن شریف کی آیتوں پر بھی سماع ہوتا ہے اور اس سے بہت وجد آتا ہے مگر شعر اور قرآن میں فرق ہے۔ قرآن میں کافروں کا قصہ اور معاملات وغیرہ کے مضامین بیچ بیچ میں آ جاتے ہیں۔ یہ آیتیں عشق کو تیز نہ کریں گی۔ امام موصوف نے نغمہ وسرود کے ساتھ ساتھ رقص اور حرکت کو بھی جائز بتایا ہے اور اس پر بہت کچھ لکھا ہے۔ بہرکیف ! تاریخ سے ظاہر وثابت ہے کہ پیغمبروں اور دینی اکابرین نے رقص وموسیقی کو اپنایا

ہے اور اگر یہ حرام ہوتا تو پیغمبر ایسا کبھی نہ کرتے۔

مسلمانوں کا قرآن ان کے گھر میں موجود ہے جو ایک نہیں دو دو جگہ انہیں اشارہ کر رہا ہے کہ موسیقی سنت پیغمبری ہے۔ حضرت داؤد کے ذکر میں دو دو جگہ ہے کہ:۔

وا تینا داودزبورا۔

ترجمہ "اور ہم نے داؤد کو زبور دی"

(نساء ۲۳۔ بنی اسرائیل ۱۲)

بنی اسرائیل اس کتاب کو "مزامیر داؤد" کہتے ہیں جس کا ترجمہ سام یا سالز کیا گیا ہے۔ جس کے معنی مناجات اور غزل ہیں۔ "توراۃ کے نام سے جو انبیاء بنی اسرائیل کی کتابوں کا مجموعہ اس وقت موجود ہے اس میں جو کتاب مزامیر داؤد کے نام سے ہے وہ پوری کتاب گویا نغمے اور راگ ہی پر مشتمل ہے۔ خود قرآن نے زبور کی تعریف یہ کی ہے کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام اسے پڑھتے تو:

والطیر محشورۃ کل لہ اواب۔

ترجمہ "پرندے وہاں جمع ہو کر اس کے گرد رجوع ہو جاتے تھے"

یہ کس چیز کا اثر تھا؟ لحن، راگ اور نغمے کا۔ اسی لئے خوش آوازی کو لحن داؤدی اور نغمہ داؤدی کہتے ہیں۔ فن تجوید میں لحن داؤدی ایک خاص دلکش لہجہ ہے جو تقریباً ہر قاری کو ضرور سکھایا جاتا ہے۔ نغمہ داؤدی ہر اس سریلے گانے اور دل نشین راگ کو کہا جاتا ہے جسے سن کر انسان جھوم پڑیں۔ قرآن بھی جب خوش لحنی سے پڑھا جاتا ہے تو قطعاً نہ سمجھنے والے جاہل اور گنوار غیر مسلم بھی کھڑے ہو کر سننے اور جھومنے اور متاثر ہونے لگتے ہیں۔ یہ کسی بات کا ثبوت ہے؟ اس کا کہ رقص و موسیقی کا تعلق فطری جذبہ انسانی سے ہے۔ ایک پاکستانی تبصرہ نگار نے "حلال و حرام" پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

مزامیر جمع ہے "مزمار" کی جس کے لغوی معنی اس آلہ کے ہیں جس کو پھونکا جائے۔ چونکہ یہ آلہ ہے اس لئے یہ لفظ ساز کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا

"کیا مصنف کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حضرت داؤد رقص و سرود کی صورت میں عبادت کرتے تھے جیسا کہ ہندو کرتے ہیں؟ اگر یہ مطلب ہے تو یہ سوائے حماقت کے اور کچھ نہیں"

حضرت داؤد اولاد ابراہیم علیہ السلام تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے طواف کعبہ کا رواج ہے۔ زمخشری اور بیضاوی وغیرہ نے ایام جاہلیت کے طواف کو رقص تسلیم کرتے ہوئے عبادت ہی مانا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی جلد پنجم میں بسلسلہ طواف لکھا ہے کہ طواف میں سلا ہوا کپڑا نہیں پہنا جا سکتا اس لئے:۔

"کہ یہ جاہ وجلال کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ اس بنا پر اہل عرب برہنہ طواف کرتے تھے۔ لیکن خدا کی بارگاہ میں یہ بھی ایک بے ادبی تھی اس لئے اسلام نے اس کو جائز نہیں رکھا"

اور پھر آگے بڑھ کر فرمایا ہے کہ:۔

"طواف حقیقت میں ایک قسم کی ابراہیمی نماز ہے جو اس پرانے عہد کی یادگار ہے۔ اسی لئے آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ خانہ کعبہ کا طواف بھی گویا نماز ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ تم اس میں بول سکتے ہو"

اگر طواف کعبہ بھی عبادت ونماز ہے اور رقص ہی کی ایک شکل تو حضرت داؤد کے بارے میں یہ کیسے دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ وہ رقص و سرود کی صورت میں عبادت نہیں کرتے تھے؟ اگر آج خانقاہوں کی قوالی وحال' رقص و سرود کی صورت میں عبادت نہیں تو کیوں اس کو جائز کہا جاتا ہے اور کس لئے لوگ اس مجلس و محفل میں شرکت کو باعث برکت وفلاح تسلیم کرتے ہیں؟ بہرکیف! میں فاضل معترض کے اطمینان کے لئے صاف صاف عرض کرتا ہوں کہ جی ہاں حضرت داؤد علیہ السلام رقص و سرود ہی کی صورت میں عبادت فرماتے تھے۔ نہ صرف اتنا بلکہ حضرت علامہ ابوالکلام آزاد نے (جو بہرحال فاضل معترض سے زیادہ قابل اعتبار محقق قرآن ہیں) "ترجمہ القرآن" جلد نمبر ۲ صفحہ نمبر ۴۸ میں لکھا ہے کہ:۔

"حضرت داؤد ...... پہلے شخص ہیں جنہوں نے عبرانی موسیقی مدون کی اور مصری وبابلی مزامیر کو ترقی دے کر نئے نئے آلات ایجاد کئے"

غور فرمایئے اگر حضرت داؤد رقص وموسیقی کے ذریعہ عبادت الٰہی نہیں کرتے تھے تو انہوں نے موسیقی کو مدون کیسے کیا اور آلات موسیقی کیوں ایجاد کئے تھے؟ علامہ عبدالحلیم شرر رقص وموسیقی کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

ا۔ "حضرت سرور کائنات صلعم نے عورتوں اور لڑکیوں کو بارہا گاتے بجاتے دیکھا اور نہیں روکا تھا۔ حبشیوں کا رقص دیکھا اور نہیں منع فرمایا تھا بلکہ فن تجوید وقرات کی تحصیل کو موجب ثواب آخرت بتایا جو کہ دراصل موسیقی کا ہی ایک روح افزا شعبہ تھا۔ اور ...... صحابہ وتابعین ہی کے زمانے میں ہم اتنے بڑے بڑے اور اس پائے کے لوگوں کو گانا سنتے دیکھتے ہیں کہ ہمیں تحریم موسیقی کے عام فتوے پر تعجب آتا ہے۔ تاہم مسلمانوں میں فن موسیقی کو فطری طور پر ترقی حاصل ہوتی گئی۔ جس کی وجہ غالباً" یہ ہوئی کہ صرف امرا اور ملوک ہی نہیں بلکہ سلف کے مسلمان اتقیا وزہاد بھی دینی خلوص اور بے نفسی کے جذبات کے ساتھ ذوق وشوق سے گانا سننے لگے۔

۲۔ "بنی اسرائیل کی موسیقی کے اصلی عروج کا زمانہ حضرت داؤد کا زمانہ ہے۔ جس کے مزامیر مشہور ہیں۔ قدیم مورخ اسبیلوس کا بیان ہے کہ حضرت داؤد جہاں جاتے' اپنا چنگ ضرور ساتھ لے جاتے۔ انہوں نے مذہبی رسوم وعبادت کے لئے اہل موسیقی کی چوکیاں اور باجوں کے بینڈ مقرر کئے تھے اور ثابت ہوتا ہے کہ عبادت کرتے وقت وہ خدائے ذوالجلال کے سامنے گاتے اور ناچتے تھے۔ جبکہ آلات طرب سے کام لینے والوں کا طائفہ چنگ' رباب' طنبورہ جھانج' قرنا اور ترہیاں بجاتا تھا اور وہ اپنی مناجات کے نغمے کی صدا بلند کرتے۔ ان چیزوں کو ان کے بعد حضرت سلیمان نے اور زیادہ ترقی دی۔ جبکہ معبد الٰہی اور حرم ربانی میں بہت سے گانے بجانے والے مقرر تھے۔ یہ زمانہ بنی اسرائیل کی موسیقی کے شباب کا تھا"

یہ کچھ شرر ہی کا بیان اور توراۃ کے مفسروں ہی کا قول نہیں بلکہ علامہ بدرالدین عینی محدث حنفی نے بھی بخاری کی شرح میں لکھا ہے کہ:۔

"حضرت داؤد کے پاس باجا بھی تھا جس پر وہ گاتے تھے"

یہی بات حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی "فتح الباری" میں کہی ہے۔ امام شوکانی نے اس عنوان پر ایک رسالہ ہی لکھا ہے۔ "رسالہ سماع" اور اس میں کہا ہے کہ:۔

"عبدالرزاق اپنی مسند میں' سند صحیح سے عبداللہ ابن عمر کی روایت لکھتے ہیں کہ حضرت داؤد اپنے باجے کو بجا بجا کر تلاوت زبور کرتے تھے"

غور فرمایئے' جب حضرت داؤد پیغمبر تھے اور وہ تلاوت زبور اس طرح فرماتے تھے کہ نہ صرف "ساز" استعمال کرتے تھے بلکہ اس انداز سے "گاتے" بھی تھے کہ بقول قرآن پرندے بھی متاثر ہو کر ان کے گرد جمع ہو کر حضرت داؤد سے ہم آواز ہو جاتے تھے اور ظاہر ہے کہ حضرت داؤد خواہ پرندے' چپ چاپ بلا حس و حرکت محض زبان نہ چلاتے تھے بلکہ مستی میں جھومتے بھی تھے۔ تو پھر کون ہے جو رقص و موسیقی کو حرام قرار دے سکتا ہے؟ آنحضرت محمدؐ پر یہ بہتان ہے کہ انہوں نے "موسیقی" کو حرام قرار دیا ہے۔ امام شوکانی نے ایک رسالہ ہی اس نام سے لکھا ہے کہ موسیقی کی حرمت اور اس حرمت پر اجماع کا دعویٰ سراسر باطل ہے۔ اس کے بعد انہوں نے لکھا ہے کہ " گانا" اور "باجا" سے متعلق جتنی روایتیں پیش کی جاتی ہیں ایک بھی صحیح نہیں سب باطل ہیں۔ انہوں نے حوالہ دیا ہے کہ یہی قول ابوبکر بن العربی اور ابن حزم کا بھی ہے۔ شوکانی نے بلا استثناء کہا ہے کہ جتنی حدیثیں حرمت موسیقی میں پیش کی جاتی ہیں۔ ایک ایک کر کے موضوع ہیں۔ نہ صرف انہوں نے یہ دعویٰ کیا ہے بلکہ اس پر قسم کھائی ہے۔ تاریخی شہادت بھی اسی صداقت کے حق میں ہے۔ خود عرب فاضل خاتون بخلا عزالدین نے' "عرب دنیا" میں لکھا ہے:

"موسیقی عربوں میں ایک مکمل اور اعلیٰ درجے کا فن بن گئی تھی جسے بڑا رواج حاصل تھا۔ اگرچہ بعض مذہبی مکاتیب خیال موسیقی پر ناک بھوؤں

چڑھاتے ہیں۔ پھر بھی غزالی جیسی ذمہ دار مذہبی شخصیت نے اسے عبادت میں جگہ دی تھی۔ جن کا مقام اکابرین مذہب میں کچھ کم وقیع نہ تھا۔ موسیقی مریضوں پر اطمینان بخش اور راحت آفریں اثر رکھنے کی وجہ سے دواؤں کی معاون سمجھی جاتی تھی اور اسے معالجاتی اہمیت کی بنا پر شفاخانوں میں بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ موسیقی مسلم تعلیمات کا ایک جزو لازم بن گئی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ موسیقی عوام کا فن تھا۔ عوامی تہواروں میں موسیقی ساتھ رہتی تھی اور گھریلو تقریبوں اور اہم خاندانی مواقع پر الگ اس کا دخل رہا کرتا تھا۔

موسیقی میں عربوں نے جو حصہ لیا تھا اس سے موسیقی کا نظریہ اور آلات موسیقی دونوں متاثر ہوئے۔ یورپ نے متعدد آلات موسیقی عرب سے اخذ کئے جن میں ایک قسم کا ستار' (DUTE) اور چھ تارہ (GUITER) ۔۔ وغیرہ شامل ہیں۔ جن میں سے بیشتر کے عربی نام ابھی تک برقرار ہیں۔ موسیقی کے نظرئے کو نہایت چوٹی کے مسلمان فلسفیوں اور سائنسدانوں نے منظم کیا تھا۔ جنہوں نے اپنی ترقی یافتہ ریاضی اور طبیعات کی روشنی میں ورثے میں پائے ہوئے نظریات کی تنقیح کی اور اس میں معتدبہ اصلاحات کیں ....."

غور فرمایئے' یہ فاضل عرب خاتون فرماتی ہیں کہ عربوں نے ریاضی اور سائنس کیطرح موسیقی کو ایک فن قرار دیا تھا اور وہ اس میں ماہرانہ دسترس رکھتے تھے۔
(صفحہ نمبر ۶۷' ۶۸)

قرآن اصول کی کتاب ہے اور اسلام کا جو اصولی مسئلہ ہو گا وہ صرف قرآن ہی سے طے کیا جائے گا۔ فروعات اور تفصیلات کیلئے البتہ روایات سے استمداد کسی حد تک مناسب ہو گی۔ فنون لطیفہ کی حرمت کا مسئلہ اصولی مسئلہ ہے۔ اس لئے اس کا استنباط قرآن سے کیا جائے گا اور قرآن اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ رہنما کتاب ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں' حیات کے ہر مسئلے میں اور "رہنما" اسے نہیں کہتے جو آپ کو ساتھ لے جا

کر منزل تک پہنچا آئے۔ "رہنما" کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ راہ بتا دے اور اس کی رحمتوں اور زحمتوں سے باخبر کر دے۔ اس کے بعد اس راہ پر چل کر زحمتوں سے بچتے اور رحمتوں سے ہمکنار ہوتے ہوئے منزل تک پہنچ جانا خود راہرو کا کام ہے۔ قرآن کی رہنمائی بھی اسی طرح کی ہے۔ اللہ تعالیٰ اشارے کرتا ہے۔ پکارا نہیں کرتا اور یہ اشارے بھی دیکھئے کہ قرآن کس طرح واقعاتی صورت میں کرتا ہے۔ ایک قصہ کہتا ہے کہ جب آدم کے دو بیٹوں میں جنگ ہو گئی اور ایک نے دوسرے کو مار ڈالا تو اس کے بعد وہ پریشان ہونے لگا کہ اب اس بھائی کی لاش کو کیا کرے؟ اللہ تعالے نے پکار کے نہیں کہا کہ "اس مردے کو زمین میں دفن کر دو" بلکہ تدفین کا نکتہ پا لینے کے لئے یوں اشارہ کر دیا:

فبعث اللہ غرابا یبحث فی الارض۔ (مائدہ)

ترجمہ "تو اللہ نے ایک کوا بھیجا جو اس کے سامنے زمین کھودنے لگا"

کس لئے؟

لیریہ کیف یواری سوأۃ اخیہ۔ (مائدہ)

ترجمہ "اس لئے کہ اس شخص کو دکھا دے کس طرح اسے اپنے بھائی کی لاش چھپانی چاہئے"

آدم کے بیٹے کی لاش کو دفن کرنے کی ترکیب یوں بتائی گئی کہ اس کے سامنے آ کر ایک کوا زمین کھودنے لگا تاکہ وہ اسی واقعے سے یہ سیکھ لے کہ لاش کو زمین میں دفن کر دینا چاہیے۔ سورہ (ص) یوں شروع ہوتی ہے:

ص۔ والقران ذی الذکر۔ (ص)

ترجمہ "ص۔ اسی قرآن کی قسم کہ یہ قرآن نصیحتوں سے بھرا ہوا ہے"

درمیان میں ہے:

کتب انزلنا الیک مبرک لیدبروا ایتہ۔ (ص۔۳)

ترجمہ "یہ مبارک کتاب ہے جو ہم نے اس لئے تم پر نازل کی ہے کہ لوگ اس کی آیات میں غور و فکر اور سوچ بچار کریں"

ختم یوں ہوتی ہے:

ان ھو الا ذکر للعلمین ولتعلمن نباہ بعد حین۔ (ص۔۵)

ترجمہ "یہ اور کیا ہے بجز اس کے کہ یہ ساری دنیا والوں کے لئے نصیحت ہے۔ تم لوگوں کو اس کی قدر کچھ دنوں کے بعد معلوم ہو گی"

جو سورت اس شان سے نازل ہوئی ہے کہ اس کی ابتدا اور انتہا دونوں میں اسے "نصیحت کا سرمایہ" کہا گیا ہے اور جس کا قلب اس بات کا معلن ہے کہ اس مبارک کتاب کو اس لئے نازل کیا گیا ہے کہ لوگ اس کی آیات میں غور و فکر کر کے نصیحتیں حاصل کریں اسی سورت میں حضرت داؤد کا یہ واقعہ بیان ہوتا ہے کہ جب وہ نغمہ ریز ہوتے تھے تو وحوش و طیور ان کے گرد جمع ہو جاتے اور وجد کرنے لگتے۔ پہاڑ تک متوجہ ہو جاتے اور جھومنے لگتے تھے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ صرف اشارے کرتا ہے اور وہ بھی واقعے کی صورت میں' تو کیا حضرت داؤد کی نغمہ سنجی وزمزمہ پر وازی کا واقعہ بیان کر کے قرآن اس کی طرف اشارے نہیں کرتا کہ رقص وموسیقی حرام نہیں بلکہ یہ نعمت خداوندی اور سنت پیغمبری میں سے ہے اور اسے انسانوں بالخصوص مسلمانوں کو ضرور حاصل کرنا چاہیے؟ کوے کا واقعہ تو تدفین کا طریقہ بتائے اور نغمہ داؤدی کا ذکر محض یونہی ہو؟ حضرت داؤد کی دو خصوصیتیں قرآن نے بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ زرہیں بناتے تھے اور دوسری یہ کہ وہ بہترین نغمہ سنج تھے۔ اگر صنعت زرہ سازی کا حصول مسلمانوں کے لئے ضروری ہے تو ان کا نغمہ سنجی مسلمانوں کے لئے لائق تقلید کیوں نہیں؟ حضرت امام غزالی حجتہ الاسلام کہلاتے ہیں۔ تصوف وریاضت میں بھی وہ نام آور ہیں۔ علامہ شاہ محمد جعفر ندوی پھلواروی نے' جو حضرت شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کے صاحب زادے اور مشہور اہل حدیث شاہ عین الحق صاحب کے بھانجے

ہیں اور جو کبھی خود خانقاہ سلیمانیہ کے گدی نشین اور بہت عرصہ تک مودودی صاحب کی جماعت اسلامی کے صالح رکن رہ چکے ہیں اپنے ایک طویل و مسلسل مضمون میں جو ۱۹۵۸ء کے رسالہ "ثقافت" (لاہور) کے مختلف نمبروں میں شائع ہوا تھا۔ اسلام میں موسیقی کے قطعی طور پر جائز ہونے کی بڑی مفصل و مدلل بحث کی ہے۔ انہوں نے نہ صرف بڑے بڑے اراکین اسلام کے اقوال پیش کئے ہیں بلکہ قرآن کی یہ روایتیں بھی پیش کی ہیں:۔

۱۔ فاما الذین امنو وعملوا الصلحت فھم فی روضۃ یحبرون۔
(روم۔۲)

ترجمہ "جو لوگ ایمان لائے اور اس کے مطابق عمل کئے وہ چمن میں نغمے سن رہے ہوں گے"

۲۔ ادخلوا الجنۃ انتم وازواجکم تحبرون۔ (زخرف۔۷)

ترجمہ "تم اور تمہارے جوڑے جنت میں جاؤ جہاں تمہیں نغمے سنائے جائیں گے"

انہوں نے فرمایا ہے کہ جنت معاشرے کا مثالی نصب العین ہے اور جب جنت میں نغمے گونجتے ہوں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس دنیا میں حرام ہو۔ اگر یہاں ازواج مطہرہ حلال ہیں تو بہشت میں بھی حلال ہوں گے۔ اگر یہاں ایسی شے مباح ہے جس میں بکواس' دردسر اور نشہ نہ ہو تو وہاں بھی مباح ہوگی۔ اگر یہاں شیروشہد' لحم طیر اور فواکہ جائز ہیں تو وہاں بھی جائز ہوں گے۔ جنت میں جو نعمتیں بھی حلال و مباح ہیں۔ وہ یہاں بھی قطعاً" حلال و مباح ہیں۔ پھر موسیقی و غنا اور نغمہ و سرود جیسے فردوس کوش کو' ان ہی نعمائے الٰہی میں داخل نہ کرنے کی وجہ ہی کیا ہو سکتی ہے؟ چونکہ عام طور پر سے لوگوں نے "حبرۃ" کے معنی صرف سرور اور خوشی کے لئے ہیں۔ اس لئے علامہ موصوف نے بھی لکھا ہے کہ اس معنی سے انکار نہیں مگر "حبرۃ" کے معنی نغمہ و سرود کے بھی ہیں۔ انہوں نے ثبوت میں لکھا ہے کہ امام شریف مرتضٰی حسینی زبیدی نے " تاج العروس" جلد نمبر۳ صفحہ ۱۱۸ میں لکھا ہے کہ:۔

"حبرہ" سے مراد بہشتی نغمہ ہے اور زجاج نے آیت مذکورہ بالا کی یہی تفسیر لکھی ہے اور کہا ہے کہ "حبرہ" لغت میں ہر اچھے گانے کو کہتے ہیں"

"زجاج" لغت اور نحو کے اسی طرح امام ہیں جس طرح راغب اصفہانی وصاحب مفردات اگر راغب کی رائے بطور سند پیش کی جا سکتی ہیں تو زجاج کا قول بھی اسی طرح سند کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ "البستان" عربی کا سب سے آخری مستند لغت ہے۔ اس میں "حبرہ" کے معنی لکھے ہیں:

"ہر عمدہ گانا..... اور جنت میں گانوں کا سننا"

"مصباح اللغات" میں "حبرہ" کے معنی یوں لکھے ہیں:۔

"خوشی، نعمت، ہر عمدہ راگ۔ یہی المنجد میں ہے۔ یعنی ہر اچھا گانا"

تفسیر ابن کثیر جلد نمبر ۳ صفحہ نمبر ۴۲۸ میں ہے کہ:۔

"مجاہد اور قتادہ "یحبرون" کے معنی متنعمون کے بتاتے ہیں اور یحیی بن ابی کثیر نے اس کے معنی گانا سننے کے بتائے ہیں"

تفسیر "مواہب الرحمٰن" میں ہے کہ:۔

یحیی بن ابی کثیر نے کہا ہے کہ وہاں حقیقی تمنا سے مسرور ہوں گے"

صاحب "کشاف" (زمخشری) نے لکھا ہے کہ:۔

"مجاہد سے "یحبرون" کے معنی یہ منقول ہیں کہ اہل جنت کا اعزاز کیا جائے گا۔ قتادہ اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ ان کو نعمتوں سے سرفراز کیا جائے گا۔ ابن کیسان کہتے ہیں کہ انہیں زیوروں سے آراستہ کیا جائے گا۔ ابوبکر بن عیاش کا کہنا ہے کہ ان کے سروں پر تاج رکھے جائیں گے اور وکیع کہتے ہیں کہ اس سے مراد جنت کے نغمے ہیں"

حضرت علیؓ سے ترمذی میں ایک مرفوع روایت ہے کہ:۔

"حضورؐ نے فرمایا کہ جنت میں ایسا اجتماع ہو گا جس میں حوریں بلند آواز سے گائیں گی"

صاحب کشاف نے اپنی تفسیر میں ایک ابودروا علیہ السلام اور دوسری حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مروی دو روایت نقل کی ہے کہ جنت میں عورتوں کے گانے بھی ہوں گے' اور گھنگھرو بھی بجیں گے۔ اسحق اپنی مسند میں مجاہد سے روایت کرتے ہیں کہ ابو ہریرہؓ سے دریافت کیا گیا کہ کیا جنت میں سماع بھی ہو گا؟ آپ نے جواب دیا کہ ہاں ہو گا۔ اس کے علاوہ اس سے بڑی اور ناقابل انکار حدیث ابو موسیٰ اشعری کی ہے جس میں ہے کہ حضورؐ نے ان کی قرآن خوانی سن کر فرمایا کہ "تمہیں تو لحن داؤدی عطا ہوا ہے یہ سن کر ابو موسیٰ اشعری نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ حضورؐ میری قرآن خوانی کو سن رہے ہیں تو:۔

لحبر فدلک تحبیرا ۔ (مسلم)

ترجمہ "میں اور زیادہ خوش آوازی سے پڑھتا"

" تحبیر" کے معنی "بہار الانوار" میں یوں لکھے ہیں:۔

"اس سے مراد خوش آوازی اور سوزودرد ہے"۔

یہ سب پیش کر کے علامہ ندوی موصوف نے لکھا ہے کہ قرآن میں موسیقی کی حرمت کا کوئی حکم موجود نہیں بلکہ اس کے نعمت ہونے کا ذکر موجود ہے۔ نیز:۔

"حلال وحرام کا قانون دینے کا حق ہمارے نزدیک خدا کے سوا کسی کو نہیں"

انہوں نے چند بڑے بڑے بزرگان اور متقدمین کا بھی قول پیش کیا ہے جنہوں نے قرآن وحدیث سب سے موسیقی کا جائز ہی نہیں بلکہ عبادت بتایا ہے۔ مثلاً:۔

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا کا قول ہے کہ:۔

"اس قوم پر قہر الٰہی کیوں نہ نازل ہو جس کے سامنے جواز غنا کی

حدیثیں پیش کی جائیں اور وہ اس کے مقابلے میں قول ابوحنیفہ کا مطالبہ کرے"

حضرت امام غزالی نے فرمایا ہے:۔

"جو شخص دف پر گانا سننے کو حرام کہے اس نے فعل رسول سے انکار کیا لہٰذا مرتکب کفر ہے"

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے کہا ہے کہ:۔

"محدثین کا کہنا ہے کہ حرمت غنا کی کوئی حدیث بھی صحیح نہیں ہے"

محترم سید جمال الدین محدث حنفی کا قول ہے کہ:۔

"حرمت غنا کے متعلق جن احادیث سے بعض متاخرین استدلال کرتے ہیں وہ نہ ثابت ہیں اور نہ ان کی کوئی اصل ہے کیونکہ اگر ایسی کوئی حدیث صحیح ہوتی تو مجتہدین کرام اس کو دلیل قرار دیتے۔ صحیح حسن تو کجا ضعیف حدیثیں بھی ایسی نہیں جن سے حرمت غنا ثابت ہو"

حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیری کا قول ہے کہ:۔

"سماع کے لئے سب سے زیادہ اولیٰ جگہ مسجد ہے"

حضرت شیخ تقی الدین کا قول ہے کہ:۔

"محفل سماع میں شرکت تو قرب الٰہی کا ذریعہ ہے"

حضرت مولانا عبدالرحمٰن لکھنوی فرماتے تھے کہ:۔

"سماع ہماری عبادت ہے اور مسجد عبادت کے لئے مختص ہے"

شیخ الفقہا علامہ خیرالدین آملی کا قول ہے کہ:۔

"جواز کے درجہ سے گزر کر یہ مستحب کے درجہ تک پہنچتا ہے"

نواب صدیق حسن خاں صاحب اہل حدیث جماعت کے نامور فرد ہوئے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ:۔

"مجھے گانے بجانے کی حرمت کے متعلق نہ تو قرآن میں کوئی نص ملی نہ سنت رسول میں کوئی صحیح حدیث نظر آئی"

علامہ شاہ جعفر صاحب نے ان تمام شواہد ودلائل پیش کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ:۔

"ہمیں موسیقی بلکہ سازوں کے ساتھ اباحت پر اجماع امت ہونے میں رائی برابر بھی شک نہیں رہا ہے۔ اس لئے اس کے مطلق جواز پر مزید دلائل پیش کرنے اور بحث کی ہم کوئی ضرورت نہیں سمجھتے"

انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہمیشہ جب موسیقی کا ذکر کرتے ہیں تو شرط لگاتے ہیں کہ:۔

اگر موسیقی وغنا کے ساتھ فواحش ومنکرات ہوں یا یہ فرائض سے غافل کر دیں۔ یا ناجائز ہو۔ شراب' زنا وغیرہ کی محفل ہو یا شہوت انگیز مضامین گائے جائیں یا عورتیں اور امارد موجود ہوں یا کسی مسلمان اور ذمی کی' ہجو وغیرہ ہو تو ایسی موسیقی حرام ہے ..... سمجھ میں نہیں آتا کہ غنا کے ساتھ ان فواحش کا خواہ مخواہ ذکر کر کے اصل مسئلے پر پردہ ڈالنے کی کیا ضرورت پیش آ جاتی ہے؟ .... یہ فواحش تو جس جگہ بھی ہوں گے یا جس محفل یا جس ذکر کے ساتھ وابستہ ہوں گے وہ ناجائز ہوں گی۔ اس کے لئے صرف موسیقی ہی کیوں مخصوص ہو؟ پھر سوال یہ ہے کہ اور احکام کے ساتھ ان فواحش کا لوگ کیوں ذکر نہیں کرتے؟ یہ کیوں نہیں کہتے کہ اگر شرح وقایہ کے بعض حصے پڑھنے سے شہوت پیدا ہو تو اس کا پڑھنا ناجائز ہے؟ یہ کیوں نہیں لکھتے کہ اگر مسجد میں امارد آئیں اور اس سے خراب جذبات پیدا ہوں تو مسجد میں آنا جائز نہیں؟ یہ کیوں نہیں فرماتے کہ عورتوں کو دیکھ کر یا

ان کی آواز سن کر ہیجان انگیز خیالات آئیں تو ان کی گواہی حرام ہے؟

انہوں نے بڑی لمبی بحث کی ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ علامہ شاہ جعفر صاحب نے ان مضامین کے علاوہ اس عنوان پر ایک مستقل کتاب "اسلام اور موسیقی" کے نام سے لکھی ہے۔ جس میں قرآن، حدیث، صحابہ کرام، تابعین اور فقہائے اسلام کے عنوانات سے مفصل بحث کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ موسیقی چاہے وہ ساز کے ساتھ ہو یا بے ساز۔ ہرگز اسلام میں حرام نہیں۔ آنحضرتؐ نے دف پر برابر گانا سنا ہے اور جتنی روایتیں حرمت غنا کے سلسلے میں پیش کی جاتی ہیں وہ سب خود محدثین کے نزدیک موضوع اور ناقابل قبول ہیں۔ صحابہ کرام نے کبھی نغمہ وسرود کی حرمت کا ذکر نہیں کیا۔ فقہا نے بھی موسیقی کو حرام قرار نہیں دیا اور نہ کوئی ایسا حکم دے سکتا ہے اس لئے کہ ابدی حرمت کا حق سوائے خدا کے کسی دوسرے کو نہیں۔ انہوں نے نغمہ وسرود کو مستقل اخلاق قرار دیا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے ان کی سوانح عمری "الغزالی" کے صفحہ ۳۸ پر لکھا ہے:۔

"گانے کے متعلق جہاں بحث کی ہے۔ معترضوں کا یہ قول کہ "گانا لہو ولعب میں داخل ہے۔ نقل کر کے پہلے یہ جواب دیا ہے کہ آنحضرتؐ نے خود حبشیوں کی بازیگری ملاحظہ فرمائی تھی۔ پھر لکھتے ہیں:۔

اس کے علاوہ میں کہتا ہوں کہ لہولعب دل کو فرحت دیتا ہے اور اس سے فکر کی تھکن کم ہو جاتی ہے۔ دل کا یہ حال ہے کہ جب وہ کسی چیز سے گھبرا جاتا ہے تو اندھا ہو جاتا ہے۔ اس لئے اسے آرام دینا اس بات کے لئے تیار کرنا ہے کہ وہ پھر کام کے قابل ہو جائے جو شخص رات دن نفلیں پڑھا کرتا ہے اسے بھی چاہیے کہ بعض اوقات خالی بیٹھے کیونکہ خالی بیٹھنا کام کرنے پر اور کھیل کود میں مصروف ہونا سنجیدہ مشاغل کے لئے آدمی تیار کرتا ہے"

حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اپنے فطری جذبے کی تسکین لازما کرنی ہے۔ اس لئے وہ گانے سے پرہیز کر ہی نہیں سکتا۔ فنکارانہ نہ سہی گنوارا نہ سہی اور ٹھمری اور

داورے کے وسیلے سے نہ سہی۔ حمد ونعت ہی کے ذریعے سے سہی۔ اصحاب رسول میں عبداللہ بن قیس اور ابوموسیٰ اشعری کو اللہ تعالیٰ نے ایسا حسن صوت عطا فرمایا تھا کہ رسول اللہؐ ان کی صحبتوں سے بے حد مسرور ہوا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ انہیں لحن داؤدی عطا ہوا ہے۔ ابو عثمان کا قول ہے کہ:۔

"میں نے چنگ وبربط کی آواز کو بھی ابوموسیٰ اشعری کو خوش لحنی سے بہتر نہیں پایا"

حضرت ابوموسیٰ اشعری کا پورا قبیلہ ہی اس نعمت خداوندی سے سرفراز کیا گیا تھا۔ اسی لئے آنحضرتؐ فرمایا کرتے تھے کہ میں قبیلہ اشعری کو ان کی قرآن خوانی سے فوراً پہچان لیا کرتا ہوں" واقعی موسیقی عجیب وغریب نعمت خداوندی ہے۔ آنکھ سے مجبوراً انسان ہمارے یہاں بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ مگر یورپ وامریکہ کے اندھے آنکھوں والے انسانوں کی طرح خوش ہیں اور ان کی یہ خوشی بڑی حد تک موسیقی کی رہین منت ہے۔ اندھوں کی تعلیم کے لئے اوپٹو فون نام کا ایک آلہ ایجاد کیا گیا ہے جو پڑھنے کا ہے۔ اس میں ایک کتاب دان ہوتا ہے جس میں کتاب رکھ دی جاتی ہے۔ اس کے بعد کتاب کے صفحہ کی ہر سطر پر کنٹرول کی گئی رفتار سے روشنی ڈالی جاتی ہے۔ جس کے نتیجے کے طور پر چھپے ہوئے حروف میں سے سریلی آواز نکلتی اور نغمہ ریزی ہوتی ہے جو حروف کی شکل کے مطابق اونچی نیچی ہوتی رہتی ہے۔ اس طرح چھپے ہوئے حروف تہجی' بولنے والے حروف تہجی میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور مختلف سروں اور ترتیبوں سے روشناس ہونے کے بعد نابینا اشخاص کے لئے پڑھنا ممکن ہو جاتا ہے اس آلہ کی مدد سے وہ ایک منٹ میں ۴۰' ۵۰ الفاظ پڑھ سکتا ہے۔ مگر ہمارے ہاں موسیقی ونغمہ حرام ہے۔ لہٰذا اندھے بھیک مانگا کرتے ہیں جو شاید حلال ہے۔

موسیقی سے جس طرح انسان متاثر ہوتا ہے۔ اسی طرح حیوان بھی۔ سانپ کا بین کی آواز سے مست ہو کر جھومنے لگنا۔ اگر صحیح تسلیم نہ بھی کیا جائے تو اونٹ کا حدی خوانی سے مکیف ہو کر تیز رفتار ہو جانا تو سبھی کا مشاہدہ ہے۔ حال کی دریافت یہ ہے کہ بندروں اور بن مانسوں پر بھی دلکش باجوں اور نغموں کا پورا اثر ہوتا ہے۔ آسام

میں ہاتھی کے تمام شکاری خبر رکھتے ہیں کہ ہاتھی کو ایک خاص قسم کا گانا بے حد پسند ہے۔ جنگ عظیم میں انکشاف ہوا کہ گیدڑوں کو فوجی بینڈ بہت پسند ہے۔ چنانچہ وہ فوجی کیمپ کے اس حصے میں جہاں فوجی بینڈ رات کو بجتے تھے۔ اکٹھے ہو کر بڑے انہماک سے بینڈ سنتے تھے اور بعض اس قدر متاثر ہوتے تھے کہ آسمان کی طرف سر اٹھا اٹھا کر طرح طرح کی آوازیں نکالنے لگتے تھے۔ مسز ڈھپانہ کو آسٹریلیا کے جنگلی گھوڑے بہت پسند ہیں مگر وہ ان کے قابو میں نہ آتے تھے۔ اب انہوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ ان جنگلی گھوڑوں کو نغمے سے متاثر ہو کر گرفتار کریں گی۔ اگر گھوڑا قرآن سن کے متاثر ہو سکتا ہے:

"حضرت اسید بن خضیر کہتے ہیں کہ رات میں سورہ بقرہ پڑھ رہا تھا۔ میرا گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ اس نے کودنا شروع کر دیا۔ میں چپ ہو گیا تو گھوڑا بھی ٹھہر گیا۔ میں نے پھر پڑھنا شروع کیا تو گھوڑا پھر کودنے لگا۔ میں پھر خاموش ہو گیا تو گھوڑا بھی رک گیا" (روایت ۵۷۸۔ تجرید البخاری صفحہ ۳۵۷)

تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ گھوڑا موسیقی سے متاثر نہ ہو یا اور جانور اسے پسند نہ کریں۔ نیویارک میں گایوں پر موسیقی کا تجربہ کیا گیا تو دس سے بارہ فیصد دودھ کا اضافہ ہو گیا۔

ماہرین طب اور علمائے نفسیات مسلسل تجربوں کے بعد اس نتیجے پر پہنچ گئے ہیں کہ موسیقی کے اثرات جسم انسانی پر اسی طرح یقینی ہیں جس طرح سحر کا رادویہ اور بنفشی شعاعوں کے اثرات۔ آپ مضمحل اور مایوس ہوں اور گانا سن لیں تو آپ کی طبیعت شگفتہ اور بحال ہو جائے گی یا خود گا لیں تو رنج وحزن دور ہو جائے گا۔ بالکل اسی طرح جس طرح آپ "مفرح مشکیں" دوا کھا کر کلفت وتعب کو دور کر لیتے ہیں۔ جوزف ہل نے "عربوں کا تمدن" میں لکھا ہے کہ ابتداء عہد اسلام میں جو شفا خانے قائم کئے گئے تھے۔ ان میں مریضوں کو دردو کرب کی شدت میں کمی پیدا کرنے کے لئے موسیقی کا انتظام تھا۔ عرب خاتون بخلا عزالدین نے بھی اپنی کتاب عرب ودنیا میں' اس اہتمام کا ذکر

کیا ہے اور اب تو "موسیقی علاج" ایک عام طبی اصطلاح اور "موسیقی علم العلاج" کا ایک مستقل شعبہ بن گیا ہے۔

مشی گن یونیورسٹی کے چند سربرآوردہ ڈاکٹروں نے موسیقی کے صحت بخش اثرات واوصاف سے متعلق ایک روئداد مرتب کی ہے جس میں کہا ہے کہ وائن' موسیقی کا وہ آلہ ہے جس کا نغمہ سر کے درد کو فوراً" دور کر دیتا اور دماغ کی رسولی کے لئے بے حد مفید ہے اور بربط کی موسیقی احتباس الرحم کے دردوں میں بے موثر ہے۔ ایک جرمن کے خون میں پراسرار قسم کی بیماری پیدا ہو گئی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اتفاقاً" وہ ڈاکٹر جو معالج تھا۔ بینڈ کے ذریعے دھیمے سروں میں کچھ دھنیں بجا رہا تھا۔ اس کا اس جرمن پر بڑا زبردست اثر ہوا اور بالآخر وہ چنگا ہو گیا۔ سرجنوں کا خیال ہے کہ پیٹ کے آپریشن میں موسیقی کو بڑا سکون بخش پایا گیا ہے اور جہاں برومائڈ کارگر نہیں ہوتا وہاں موسیقی کی ایک خوراک بڑا کام کر جاتی ہے۔ دنیا کے دماغی امراض کے سب سے بڑے اسپتال مگرم اسٹیٹ اسپتال کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ہیر جے وردنگ نے کہا ہے کہ کسی باقاعدہ منظم دماغی امراض کے اسپتال کے پروگرام میں موسیقی ایک قطعی اور واضح جگہ رکھتی ہے۔ "۱۹۴۳ء میں" اسپتالوں میں موسیقی کی کونسل نے اس کا لظم کیا تھا کہ دماغی امراض کے تمام اسپتالوں میں باقاعدہ سنگیت منڈلیاں بھیجی جائیں۔ ماہرین نفسیات اس تحقیق میں دن رات سرگرداں ہیں کہ موسیقی کے کون سے مختلف اسلوب کن بیماریوں کے لئے مفید ہیں۔ اور شاید وہ دن کچھ بہت زیادہ دور نہیں جب موسیقی' دواؤں کی جگہ اور صحت بخشی کے فرائض انجام دینے لگے۔ مین ہٹن کے اسٹیٹ ہوسپٹل میں موسیقی کے ذریعے سے علاج کا باقاعدہ ریکارڈ محفوظ کیا گیا ہے اور اعداد وشمار سے ظاہر ہوا ہے کہ موسیقی علاج سے اڑتیس فی صد مریضوں کو شفاء کامل اور تینتیس فی صد مریضوں کو معتد بہ فائدہ حاصل ہوا۔ ماہرین کا دعوے ہے کہ تجربے سے تحقیقاً" معلوم ہو گیا ہے کہ موسیقی غیرارادی عضلات کی قوت اور تناؤ کو زیادہ اور انقباضی عضلات کو قوی کرتی ہے۔ ایک روسی ماہر چشم کا تجرباتی بیان ہے کہ موسیقی کے اثرات سے بصارت کو بھی پچیس فی صد بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ سریلی آوازوں سے عضلات چشم کو تحریک پہنچتی ہے۔ دندانساز تو بہت پہلے سے برمے کی دل خراش

آواز سے ذہن کو ہٹا دینے کے لئے موسیقی کو کام میں لا رہے ہیں۔ امراض دماغ میں موسیقی کا تجربہ کرنے پر معلوم ہوا ہے کہ مریض نرم ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ چنانچہ اب موسیقی کو دماغی امراض دور کرنے کے لئے استعمال کرنے کی بھی مستقل تجویز ہو رہی ہے۔ جیل خانوں میں موسیقی کا تجربہ کیا گیا تو ظاہر ہوا کہ چند مشہور بے رحم ڈاکو متاثر ہو کر رونے لگے اور ان کی درندگی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔

لندن کے ایک ڈاکٹر والٹر دانشے نے اپنے ایک مضمون بعنوان "گانا اور گانے کے فعلیاتی اثرات" میں یہ نظریہ پیش کیا کہ "یرقان"۔ "عوارضی جگر" اور سوء ہضم میں گانا بہت مفید ہوتا ہے۔ کھانے اور سونے کی طرح ہماری روز مرہ زندگی میں گانا بھی ایک ضروری چیز ہے جس کے لئے ہر روز کم از کم آدھ گھنٹہ ضرور وقف کرنا چاہیے۔ جدید ماہر نفسیات نے ثابت کر دیا ہے کہ گانا دوران خون پر نہایت مفید اثر رکھتا ہے۔ وہ خون کے بہاؤ کو تیز کر دیتا ہے۔ بافتوں کو تازہ قوت حیات بخشتا ہے۔ سمیات اور فضلات کو خارج کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آج کل صحت کو بازار سے خریدنا پڑتا ہے۔ وہ غیر فطری ذریعہ ہے۔ دراصل حصول صحت کے لئے فطری اور قدرتی ذرائع بہترین ہوتے ہیں اور گانا انہی ذریعوں میں سے ایک نہایت آسان اور بہترین قدرتی ذریعہ ہے۔ مشہور مذہبی رسالہ "دین ودنیا" (دہلی) کی اشاعت اکتوبر ۱۹۵۴ء میں مندرج یہ خبر تم تمام مذہبی لوگوں نے پڑھی ہی ہو گی کہ:۔

"سویڈن کے دارالسلطنت اسٹاک ہالم میں ایک عجیب وغریب ہسپتال کھولا گیا ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل انوکھا ہے۔ اس ہسپتال کی خصوصیات یہ ہے کہ اس میں دوا کے بجائے مریضوں کا علاج گانے سے کیا جاتا ہے"

"اس ہسپتال میں مختلف امراض کے مریضوں کے لئے علیحدہ علیحدہ کمرے ہیں۔ جن میں ان مریضوں کی بیماریوں کے مطابق نغمے ہر وقت گونجتے رہتے ہیں اور مریضوں پر ان نغموں کا بہت ہی اچھا اثر پڑتا ہے"

"سویڈن کے نامور ڈاکٹر پوٹاک اس جدید طریقہ علاج کے ماہر ہیں ان

کا کہنا ہے کہ وہ محض غذا اور موسیقی کے ذریعے سے خطرناک سے خطرناک مریضوں کو تندرست کر سکتے ہیں"

امریکہ کے ایک ہسپتال میں پیانو بجانے والے استاد کی خدمات حاصل کر کے نسیان کے ایک مریض پر تجربہ کیا گیا تو یہ دیکھ کر لوگوں کو حیرت ہوئی کہ اس کا حافظہ درست ہو گیا۔ علاج کے سلسلہ میں سب سے اہم مسئلہ زخموں کا تھا۔ بڑے آپریشن کلوروفارم (GHLORO FORM) سنگھائے بغیر ممکن نہ تھے آج کل بھی چھوٹے آپریشن تو زخم کے آس پاس کے حصہ جسم کو سن اور بے حس کر کے' کامیاب کر لئے جاتے ہیں مگر اس میں ڈاکٹروں کو وقت یہ محسوس ہوتی تھی کہ مریض اپنی آنکھوں سے ساری حرکتیں دیکھتا رہتا تھا اور اگرچہ وہ آپریشن کی تکلیف محسوس نہ کرتا تھا۔ مگر نفسیاتی طور پر ساری کارروائیوں کے مشاہدے سے اس کے قلب پر خاص اثر پڑتا تھا۔ لہٰذا وہ اس خیال میں تھے کہ کوئی مفید تر سبیل نکلے۔ چنانچہ تازہ ترین خبر سنئے۔

"آپریشن کی تکلیف سے بچانے کے لئے گانے سنائے جاتے ہیں"

نیویارک ۳۰ جولائی' سینٹ لوئی اسپتال میں جن مریضوں کے معمولی آپریشن کئے جاتے ہیں۔ انہیں آپریشن کے درمیان ٹیپ ریکارڈ (TAPE RECORD) کے ذریعہ' ان کے دل پسند گانے سنائے جاتے ہیں۔ واشنگٹن یونیورسٹی کے ڈاکٹر ڈی۔کلاف نے یہ طریقہ رائج کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مریض گانا سننے میں اتنا منہمک ہوتا ہے کہ آپریشن کی میز پر اسے تکلیف کا احساس نہیں ہوتا"

(روزنامہ "سیاست جدید" (کانپور) مورخہ ۴-۸-۱)

تاہم ڈاکٹر یہ دیکھ کر کہ مریض کے کان تو موسیقی کی طرف ہوتے تھے۔ مگر آنکھ آپریشن یا ڈاکٹروں کی طرف' اس فکر میں تھے کہ مریضوں کی آنکھوں کو بھی کسی دوسری طرف متوجہ کر دینے کی سبیل نکل آئے تاکہ وہ آپریشن کی جانب سے مطلقاً بے توجہ ہو جائیں۔ یہ مشکل بھی اب حل ہو گئی ہے۔ ذیل کی خبر ملاحظہ ہو:

"رنگین موسیقی" ایک حیرت انگیز ایجاد

"رنگین موسیقی" کے نام سے ایک مشین سوویٹ یونین میں تیار کی گئی جو ۱۹۶۱ء میں سوویٹ تجارتی نمائش کے موقع پر لندن میں دکھائی گئی ..... روسی ماہر لیونیف نے یہ مشین ڈیزائن کی تھی۔ رنگین موسیقی کی یہ مشین اس وقت ماسکو میں نمائش کے لئے رکھی ہوئی ہے"

("ہماری زبان" (علی گڑھ) مورخہ ۲۲-۸-۱) صفحہ نمبر۱۰)

اس سلسلے میں موجد لیو تیست کا ایک مضمون بھی شائع ہوا ہے جس میں اس ایجاد اور مشین پر مختصراً" روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ "آواز" متحرک ہے۔ موسیقار اپنی مرضی کے مطابق اس میں اتار چڑھاؤ پیدا کرتا ہے۔ برخلاف اس کے مادی اعتبار سے "رنگ" میں ٹھہراؤ اور جمود پایا جاتا ہے۔ ان دونوں کا امتزاج مشکل نظر آتا تھا۔ مگر ٹیکنیکل ترقی کی بدولت اس امتزاج وملاپ کی شکل نکل آئی۔ ایسی مشینیں ایجاد ہو گئیں جن کی مدد سے ہر قسم کی رنگین شعاعیں پیدا ہو جا سکتی ہیں۔ جس وجہ سے ان میں طرح طرح کے امتزاج پیدا کئے جا سکتے تھے اور پردے پر ان کا اتار چڑھاؤ ان کی سرزش اور تھرتھری دکھائی جا سکتی تھی۔ مشہور روسی سائنسدان پاولوف نے کتوں پر تجربہ کر کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ انسانی جسم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اندرونی رابطہ اور آہنگ پیدا کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت موجود ہے کیونکہ اس میں حواس خمسہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور جب ایک متاثر ہوتا ہے تو سب پر کچھ نہ کچھ اثر پڑتا ہے۔ روشنی اور رنگ کا اثر سماعت پر اور آواز ونغمہ کا اثر بصارت پر پڑتا ہے چنانچہ یہ طے پایا کہ رنگ اور موسیقی میں رابطہ اور آہنگ قائم کرنا ممکن ہے مگر مسئلہ یہ تھا کہ اس رابطہ ومطابقت پیدا کرنے کی صورت کیا ہو؟ آخر ماہرین نفسیات' ماہرین عضویات' روشنی کی لہروں کے ماہرین اور الکٹرونک سائنس کے علماء اس نتیجے پر پہنچے کہ انسان کی دیکھنے اور سننے کی قوت اور اعضاء کا اس طرح مطالعہ اور تجزیہ کرنا ہو گا کہ آواز کو رنگ کی زبان میں ترجمہ کیا جا سکے۔ چنانچہ یہ مشین اس طرح تیار ہوئی کہ موسیقی کی آواز ایک مائیکرو فون میں جاتی ہے۔ پھر وہ ایک الکٹرونک مشین میں پہنچتی ہے جہاں اس کا برقی تجزیہ ہوتا ہے اور وہیں آواز کے مطابق رنگوں کا فیصلہ ہو جاتا ہے اور پھر منتخب رنگوں کی شعاعیں پردے پر آتی ہیں نغمے کا سر بدلا اور رنگ بدل

گئے۔ اس طور پر نغمہ کو صرف کان سے سنا ہی نہیں جاتا بلکہ پردے پر آنکھوں سے دیکھا بھی جاتا ہے۔ ہر چند کہ رنگین موسیقی ابھی بچپن کی منزل میں ہے۔ مگر آگے چل کر "رنگین موسیقی" ڈاکٹروں کے لئے آپریشن کے سلسلے میں بہترین معاون ثابت ہونے والی ہے کیونکہ اس کی ایجاد سے بے ہوشی اور بے حسی کی ضرورت نہیں رہے گی۔

ان حقائق سے ظاہر ہے کہ موسیقی بالعموم جذباتی امراض کے لئے سب سے زیادہ مفید ثابت ہوگی اس لئے کہ موسیقی کا تعلق انسان کے فطری جذبے سے ہے اور اب انسان کی قید لگانا یوں بھی بیکار ہو گیا ہے کیونکہ حیوانوں پر بھی اس کا ویسا ہی اثر ثابت ہوا ہے جیسا انسانوں پر۔ انسان پر موسیقی کے اثرات کا پہلے سے لوگوں کو علم تھا۔ اسی لئے موسیقی کی تقسیم ہوئی تھی۔ کہ کس ماحول میں کون سا راگ درست ہو گا۔ مسرت والم دونوں کے لئے جداجدا موسیقی تھی۔ حزنیہ اور طربیہ اور فطرت انسانی پر اس کا اثر یوں مرتب ہوتا تھا کہ انسان رونے اور ہنسنے لگتا تھا۔ فوج میں جو باجے شامل کئے گئے تھے وہ اسی تجربہ کی بنا پر کہ موسیقی کے اثر سے انسان جوش میں آجاتا ہے۔ سکندر کے سامنے ایک مرتبہ ٹموتھیس نے ایسا نغمہ چھیڑا کہ اس کے اثر سے سکندر پر کالہ آتش بن گیا' حالانکہ وجہ کچھ نہ تھی۔ یہ صرف موسیقی کا اثر تھا۔ نیند لانے کی غرض سے بوڑھوں' جوانوں اور بچوں کے لئے موسیقی کا استعمال آپ کو ہر جگہ ملے گا۔ بچوں کی لوریاں کیا ہیں؟ انہیں بہلانے اور سلانے کا نغمہ۔ ٹیگور کے بارے میں آپ نے سنا ہو گا کہ وہ "شانتی نکیتن میں نغموں ہی کے ذریعے سے سوتا بھی تھا اور جاگتا بھی تھا۔ غرض موسیقی کا تعلق فطرت انسانی سے ہے اور یہ چیز انسانوں کے علم میں پہلے آ چکی تھی۔ البتہ امراض میں موسیقی کا استعمال عام نہ تھا۔ یعنی یہ سب تجربات نئے نہیں بلکہ استعمال میں نہ تھے۔ فیثا غورث اور اس کے شاگردوں نے موسیقی کے ذریعے سے جسمانی اور دماغی امراض کا جو علاج کیا تھا وہ تاریخ میں درج ہے۔

موسیقی کے سحرکارانہ اثرات کا صرف قرآن ہی ذاکر نہیں کہ:۔

ولقد اتینا داود منا فضلا طیجبال اوبی معہ والطیر۔ (سبا۔۲)

ترجمہ "اور ہم نے داؤد علیہ السلام کو اپنی طرف سے خاص یہ فضل عطا کیا تھا کہ اے پہاڑوں اور پرندو! تم داؤد علیہ السلام کا ساتھ دو" (یعنی حیوانات ہی نہیں جمادات بھی موسیقی سے متاثر ہوتے ہیں)

بلکہ "توراۃ" سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جسمانی اور دماغی امراض کے علاج کے لئے خود حضرت داؤد بھی موسیقی کو استعمال کرتے تھے۔ "سموئیل اول" باب آیت ۲۳ میں ہے کہ:۔

"سو جب وہ بری روح' خدا کی طرف سے ساؤل پر چڑھتی تھی تو داؤد بربط لے کر ہاتھ سے بجاتا تھا اور ساؤل کو راحت ہوتی اور وہ بحال ہو جاتا تھا اور وہ بری روح اس پر سے اتر جاتی تھی"

شیکسپئر بھی جو جذبات انسانی کا بہترین مصور ہے' موسیقی کے بہترین اثرات کا معترف تھا۔ بہرکیف قرآن شریعت اسلامی کا اصولی قانون ہے اور اس نے موسیقی یا رقص کو ہرگز حرام قرار نہیں دیا بلکہ وہ حضرت داؤد علیہ السلام کا قصہ بار بار بیان کر کے مسلمانوں کو یہ اشارہ کرتا ہے کہ وہ موسیقی ضرور سیکھیں اور اس سے مفید کام لیں۔ قرآن نے بڑی سختی کے ساتھ اس بات سے روکا ہے کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حرام نہ کیا ہو اسے لوگ اپنے پر حرام کرلیں اور خدا نے جو حد مقرر کر دی ہے اس سے تجاوز کریں:

یاایھا الذین امنوالا تحرموا طیبت مااحل اللہ لکم ولا تعتدوا ط ان اللہ لا یحب المعتدین۔ (مائدہ۔۱۲)

ترجمہ "اے ایمان والو! جو چیزیں تمہارے لئے تمہارے پروردگار نے حلال کی ہیں' ان میں جو عمدہ چیزیں ہیں انہیں اپنے پر حرام نہ کرو اور اللہ نے جو حد قائم کر دی ہے اس سے آگے نہ بڑھو خدائی حدود پھاندنے والے کو اللہ تعالیٰ ہرگز پسند نہیں کرتا"

خود "صحیح بخاری" کی ایک روایت ہے:۔

"حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ حضورؐ میرے پاس تشریف لائے اس وقت میرے پاس دو باندیاں بعاث کا گانا گا رہی تھیں۔ آپ بستر پر لیٹ گئے اور منہ پھیر لیا۔ اتنے میں حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے اور مجھے جھڑک کر فرمایا کہ "شیطان کا راگ اور رسول کے سامنے؟" آپ نے ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا "رہنے دو" اور اس کے بعد حضور غافل سو گئے تو میں نے باندیوں کو اشارہ کیا اور وہ نکل کر چلی گئیں"۔ (روایت نمبر ۴۹۸ تجرید البخاری ۲۰)

بعاث عرب کے اس قلعے کا نام ہے جہاں اوس وخزرج کی مشہور ۱۲۰ سالہ طویل جنگ لڑی گئی تھی اور آنحضرتؐ نے بڑی کوشش سے ختم کرائی تھی۔ اس لئے حضرت ابوبکرؓ نے جاہلیت کی۔ اس ناہنجار جنگ کے سلسلے کے گانے کو "شیطان کا راگ قرار دیا اور حضور کو تکلیف ہونے کی وجہ سے روکنا چاہا۔ مگر خود ذات رسالتؐ نے انہیں منع کرنے سے روک دیا۔ چنانچہ گانا بدستور ہوتا رہا تاآنکہ حضورؐ غافل سو گئے۔ پھر نیند میں خلل پڑنے کے خیال سے گانا روک دیا گیا۔ اگر موسیقی فی نفسہ واقعتہ" اسلام میں حرام یا ممنوع ہوتی تو آنحضرتؐ ابوبکرؓ کو ہرگز نہ جھڑکتے بلکہ حضرت عائشہؓ کو ڈانٹتے۔ خود حضرت عائشہؓ ایسا نہ کرتیں۔ اس لئے اس روایت سے بھی موسیقی حرام قرار نہیں پاتی۔ آنحضرتؐ تو رحمتہ العٰلمین اور سراپا رحم وکرم تھے۔ انہوں نے اگر موسیقی کو ممنوع نہیں قرار دیا تو کوئی تعجب نہیں۔ حضرت عمر کے بارے میں علامہ شبلی نعمانی نے الفاروق میں لکھا ہے کہ ان کا۔

"مزاج قدرتی طور پر نہایت تند، تیز اور زود مشتعل واقع ہوا تھا۔ جاہلیت کے زمانہ میں تو وہ قہر مجسم تھے۔ لیکن اسلام کے بعد بھی مدتوں تک اس کا اثر نہیں گیا۔"

مگر اسی عبارت کے ایک صفحہ سے پہلے لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ۔

"ایک دفعہ حضرت عبداللہ ابن عباس سے رات بھر اشعار پڑھوایا کئے جب صبح ہونے لگی تو کہا کہ اب قرآن پڑھو محدث ابن جوزی نے "سیرۃ العمرین" میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ رات کو گشت کر رہے تھے۔ ایک طرف

سے گانے کی آواز آئی۔ ادھر متوجہ ہوئے اور دیر تک کھڑے سنتے رہے۔ ایک دفعہ ... لوگوں نے رباح سے حدی گانے کی فرمائش کی۔ وہ حضرت عمرؓ کے خیال سے رکے۔ لیکن جب عمرؓ نے کچھ ناراضگی نہ ظاہر کی تو رباح نے گانا شروع کیا۔ حضرت عمرؓ بھی سنتے رہے۔ جب صبح ہو چلی تو فرمایا کہ "بس اب خدا کے ذکر کا وقت ہے"۔ ایک دفعہ سفرحج میں ایک سوار گاتا جاتا تھا۔ لوگوں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ "آپ اس کو منع نہیں کرتے" فرمایا کہ گانا شترسواروں کا زاد راہ ہے۔" خوات بن جبیر کا بیان ہے کہ ایک دفعہ سفر میں' میں حضرت عمرؓ کے ساتھ تھا۔ ابوعبیدہ اور عبدالرحمٰن بن عوف بھی ہمرکاب تھے۔ لوگوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ ضرر کے اشعار گاؤ۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا' بہتر یہ ہے کہ یہ خود اپنے اشعار گائیں۔ چنانچہ میں نے گانا شروع کیا اور ساری رات گاتا رہا"۔

غور فرمایئے کہ خلیفہ ثانی کے عہد میں مدینہ میں رات رات بھر گانا ہوتا تھا اور امیرالمومنین حضرت عمرؓ بھی سنتے تھے مگر آج یہ گانا قطعاً" ممنوع اور کلیتاً" حرام بتایا جاتا ہے اور اس کو خدا و رسول کے سر دھرا جاتا ہے۔

عرب میں اسلام سے پہلے بھی موسیقی کا رواج تھا مگر وہ متمدن نہیں غیر مہذب تھے۔ اس لئے اُسے فن کی حیثیت سے باضابطہ کوئی خاص ترقی نہ دی گئی تھی اسلام کی آمد کے بعد عہد رسالت و دور خلافت راشدہ' استحکام سلطنت میں گزرا مگر عہد بنی امیہ میں جبکہ استحکام سلطنت سے مسلمان ایک گونہ فارغ ہو چکے تھے۔ بہ نسبت دوسرے علوم وفنون کے موسیقی کو سب سے پہلے مسلمانوں کی توجہ ملی۔ "طوس" مدینہ کا پہلا مغنی ہے جس نے ساز اور تال کی پابندی کے ساتھ گانے کو رواج دیا اور اپنے عہد کا بہترین مغنی ہوا۔ اس کے بعد اموی دربار کا سب سے بڑا مغنی سعید ابن مسجاح مشہور ہوا۔ الکندی اور اس کے شاگرد فارابی نے موسیقی کو درجہ کمال پر پہنچا دیا تھا۔ اس طرح کہ یورپ اور ایشیا دونوں الکندی وفارابی کے کملات کے سامنے سر بسجود ہیں۔ ازمنہ وسطیٰ کے سب سے بڑے مترجم جیرارڈ نے الکندی کی کئی کتابوں کا ترجمہ کرنا فخر خیال کیا تھا۔ اور یورپ کے دور نشاۃ ثانیہ کے ایک مشہور فلسفی کارڈن نے الکندی کو

ان بارہ اشخاص میں سے ایک شمار کیا ہے جو سب سے زیادہ نکتہ رس اور دقیقہ سنج تھے۔ یہ دونوں بالکل تیسری صدی ہجری کے نہایت نامور اور مشہور مسلمان ماہر موسیقی ہوئے ہیں۔ مصر کے مشہور مصنف عباس محمود اپنی کتاب "فارابی" میں لکھتے ہیں:۔

"فن موسیقی پر فارابی نے جو کچھ لکھا ہے۔ وہ ہر اعتبار سے یگانہ اور فرید ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس فن پر اس کی کیسی گہری نظر اور وسیع نگاہ تھی اور اس کے اسرار و رموز کو اس نے کس طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور اس میں کیسی کیسی عجیب اور یکتا ایجادیں اس نے کی تھیں"

مسٹر جی فارمر (G. FARMER) لکھتا ہے:۔

"فارابی جہاں فلسفے میں بجا طور پر معلم ثانی کہلائے جانے کا مستحق تھا۔ وہاں موسیقی میں بالکل جائز اور صحیح طور پر وہ اس کا مستحق ہے کہ معلم اول مانا جائے اس کی کتاب "الموسیقی الکبیر" اس فن میں اپنا جواب نہیں رکھتی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس فن میں وہ آخری کتاب ہے تو ذرا مبالغہ نہ ہو گا۔ بلکہ صرف ایک صداقت کا اظہار ہو گا۔ موسیقی میں فارابی کی امامت سب لوگ تسلیم کرتے ہیں عام اس سے کہ وہ کوئی ہو اور کہیں کا ہو"۔

کتاب الاغانی (مصنفہ ابوالفرج علی بن حسین بن محمد۔ وفات ۳۵۶ھ) مرد و عورت ماہرین موسیقی کے ذکر سے بھری پڑی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے موسیقی کو مردود' حرام اور خلاف شریعت نہیں سمجھا تھا۔ مسلمانوں نے علم موسیقی میں جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ ان سے کوئی بھی صاحب علم بے خبر نہیں اور یورپ' ایران' مصر اور ہندوستان کی موسیقی نے جو بہترین اثرات اور خوشگوار تبدیلیاں قبول کیں انکا اعتراف سبھی کو ہے۔ اور یہ خدمات انجام دینے والے پیشہ ور عام گویے نہ تھے بلکہ بڑے بڑے علماء بڑے بڑے محدثین' بڑے بڑے سجادہ نشین' بڑے بڑے مفتی' قاری اور شیخ بھی تھے۔ یہاں پھر یہ سمجھ لیجئے کہ میں یہ نہیں کہتا' چونکہ ان اکابرین نے موسیقی میں حصہ لیا تھا۔ اس لئے اسلام میں موسیقی جائز ہے۔ بلکہ میرے کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ اسلام میں چونکہ موسیقی ہرگز حرام نہیں بلکہ قرآن نے

حضرت داؤد علیہ السلام کی موسیقی کا ذکر کر کے اس کے جائز ہونے کا اشارہ کیا تھا' اس لئے ان اکابرین نے موسیقی کو اپنایا تھا اور آج بھی جو لوگ اس فن میں مہارت رکھتے ہیں وہ درست ہیں کیونکہ قرآن علم موسیقی کے جائز ہونے پر گواہ ہے اور وہ ہرگز اس فطری جذبہ انسانی پر کوئی قید نہیں لگاتا۔ کیونکہ موسیقی محض جذباتی تسکین کا ذریعہ نہیں بلکہ انسان کی ذہنی اور اخلاقی زندگی کے لئے ایک بہت اہم قوت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض برگزیدہ انسانوں نے موسیقی کو دینی کام میں بطور خاص لایا۔ کنفیوشس چینی پیغمبر' کا تو خیال تھا کہ اس سے وحشی اور بداخلاق قوموں اور بدکردار اشخاص کو تہذیب دی جا سکتی ہے۔

علامہ ابوالکلام آزاد نے جب ہندوستان کی "راگ ناٹک اکیڈمی" کی صدارت قبول کی تو مذہبی حلقوں میں کچھ چہ میگوئیاں ہوئیں۔ شاید لوگوں کو اس کا علم نہیں کہ علامہ آزاد علم موسیقی میں خاصا شغف اور خوب دسترس رکھتے تھے۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی مشہور تصنیف "غبار خاطر" سے آخری خط مورخہ ۱۹۴۳۔۹۔۱۴ کا کچھ اقتباس پیش کر دیا جائے۔

> ۱۔ "حسن آواز میں ہو یا چہرے میں' تاج محل میں ہو یا نشاط باغ میں۔ حسن ہے اور حسن اپنا فطری مطالبہ رکھتا ہے..... میں آپ سے ایک بات کہوں؟ میں نے بارہا اپنی طبیعت کو ٹٹولا ہے۔ میں زندگی کی احتیاجوں میں سے ہر چیز کے بغیر خوش رہ سکتا ہوں لیکن موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آواز خوش میرے لئے زندگی کا سہارا' دماغی کاوشوں کا مداوا اور جسم ودل کی ساری بیماریوں کا علاج ہے"۔
>
> ۲۔ "صدر اول کے زمانے سے لے کر جس کا حال ہم "کتاب الاغانی" اور "عقد الفرید" وغیرہ میں پڑھ چکے ہیں۔ آج تک حجازیوں کا ذوق موسیقی غیر متغیر رہا۔ یہ ذوق ان کے خمیر میں کچھ اس طرح پیوست ہو گیا تھا کہ اذان کی صداؤں تک کو موسیقی کے نقشوں میں ڈھال دیا"۔
>
> ۳۔ "حقیقت یہ ہے کہ موسیقی اور شاعری ایک ہی حقیقت کے دو

مختلف جلوے ہیں اور ٹھیک ایک ہی طرح پر ظہور پذیر بھی ہوتے ہیں۔ موسیقی کے مولف الحان کے اجزاء کو وزن وتناسب کے ساتھ ترتیب دے دیتا ہے اسی طرح شاعر بھی الفاظ ومعانی کے اجزاء کو حسن ترکیب کے ساتھ جوڑ دیتا ہے، تو حاجبتی و من معنی رنگین بستم" جو حقائق شعر میں الفاظ و معنی کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ وہی موسیقی میں الحان وایقاع کا بھیس اختیار کر لیتے ہیں۔ نغمہ بھی ایک شعر ہے۔ لیکن اسے حرف و لفظ کا بھیس نہیں ملا۔ اس نے اپنی روح معنی کے لئے نواؤں کا بھیس طیار کر لیا"۔

۴۔ "کافی تصریحات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یونان کے فن موسیقی پر عربی میں کتابیں لکھی گئیں اور ریاضی کی طرح ایک شاخ کی حیثیت سے اس کا عام طور پر مطالعہ کیا گیا۔ یونانیوں نے آسمان کے بارہ فرضی برجوں کی مناسبت سے راگنیوں کی بارہ بنیادی تقسیمیں کی تھیں اور ہر راگنی کو کسی ایک برج کی طرف منسوب کر دیا تھا۔ عربوں نے بھی اسی بنیاد پر عمارت اٹھائی"

۵۔ غالباً" مسلمان بادشاہوں سے بھی پہلے مسلمان صوفیوں نے اس کی سرپرستی شروع کر دی تھی، ملتان، اجودھن، گور اور دہلی کی خانقاہوں میں وقت کے بڑے بڑے باکمال حاضر ہوتے تھے اور برکت وقبولیت کے لئے اپنا اپنا جوہر کمال پیش کرتے تھے"۔

۶۔ "کتنے ہی مقدس علماء ہیں جن کے حالات پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ گو موسیقی کے اشتغال سے دامن بچائے رہے لیکن فن کے ماہر اور نکتہ شناس تھے"۔

۷۔ "یہ خیال کہ جانور گانے سے متاثر ہوتے ہیں، دنیا کی تمام قوموں کی قدیمی روایتوں میں پایا جاتا ہے۔ توراۃ میں ہے کہ حضرت داؤد علیہ اسلام کی نغمہ سرائی پرندوں کو بے خود کر دیتی تھی۔ یونانی روایات میں بھی ایک سے زیادہ اشخاص کی نسبت ایسا ہی عقیدہ ظاہر کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے قدماء

فن نے تو اسے ایک مسلمہ حقیقت مان کر اپنی بے شمار عملیات کی بنیادیں اسی عقیدے پر استوار کی تھیں۔ سانپ' گھوڑے اور اونٹ کا تاثر عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ حدی کی لے اگر رک جاتی ہے تو محمل کی تیز رفتاری بھی رک جاتی ہے"۔

۸ ۔ "البیرونی نے "کتاب الہند" میں راگ کے ذریعے شکار کرنے کے طریقوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ خود اپنا مشاہدہ نقل کرتا ہے کہ شکاری نے ہرن کو ہاتھ سے پکڑ لیا تھا اور ہرن میں بھاگنے کی قوت باقی نہیں رہی تھی"۔

۹ ۔ "البتہ یہ ظاہر ہے کہ قوموں کے عروج و ترقی کے زمانے میں جو اشتغال تحسین فکر اور تہذیب طبع کا باعث ہوتا ہے۔ وہی دور تنزل میں فکر کے لئے آفت اور طبیعت کے لئے ہلاکت بن جاتا ہے۔ ایک ہی چیز حسن استعمال اور اعتدال عمل سے فضل و کمال کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اور سوء استعمال اور افراط و تفریط عمل سے بداخلاقی اور بد تہذیبی کا دھبا بن جاتی ہے۔ موسیقی کا ایک شوق اکبر کو تھا کہ اپنی یلغاروں کے بعد جب کمر کھولتا تو مجلس سماع و نشاط سے اس کی تھکن مٹاتا۔ اور پھر ایک شوق محمد شاہ رنگیلے کو تھا کہ جب تک محل کی عورتیں اسے دھکیل دھکیل کر پردے سے باہر نہ کر دیتیں' دیوان خانے میں قدم نہیں رکھتا ——— صفدر جنگ جب دیوان کی مہمات سے تھک جاتا تو موسیقی کے باکمالوں کو باریاب کرتا۔ اسی کی نسل میں واجد علی شاہ کا یہ حال تھا کہ جب طبلہ بجاتے بجاتے تھک جاتا تو تازہ دم ہونے کے لئے اپنے وزیر علی نقی کو باریابی کا موقع دیتا"۔

۱۰ ۔ "اس بات کی عام طور پر شہرت ہو گئی ہے کہ اسلام کا دینی مزاج فنون لطیفہ کے خلاف ہے اور موسیقی محرکات شرعیہ میں داخل ہے۔ حالانکہ اس کی اصلیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ فقہاء نے سدوسائل کے خیال سے اس بارے میں تشدد کیا اور یہ تشدد بھی باب قضا سے تھا نہ کہ باب تشریع سے۔ قضا کا میدان نہایت وسیع تھا ہر چیز جو سوئے استعمال سے کسی

مفسدے کا وسیلہ بن جائے۔ قضاء رد کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس سے تشریع کا حکم اصلی اپنی جگہ سے نہیں مل سکتا"۔

قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ ط

امام الہند کی تحریر کے اس آخری اقتباس سے ظاہر ہے کہ وہ بھی فنون لطیفہ کے اسلام میں حرام ہونے کے منکر ہیں اور فرماتے ہیں کہ فقہاء نے اگر وقت کی ضرورت کے لحاظ سے کسی چیز کو کبھی روکا ہو' یا روکیں' تو اس کی حیثیت وقتی ممانعت کی ہو گی۔ دائمی حرمت کی نہیں اور اس کی حیثیت ویسی ہی ہے جیسے حالت مرض میں معالج خورد و نوش پر پابندی عائد کر دیتا اور ممنوع قرار دے دیتا ہے اس کی حیثیت مستقلاً" حرمت کی نہ ہو گی اور فقہاء کی رائے شریعت کا مستقل حکم نہ بن جائے گی۔ فنون لطیفہ (تصویر کشی' مجسمہ سازی' رقص و موسیقی اور شاعری وغیرہ) پر شریعت اسلامیہ نے کوئی پابندی عائد نہیں کی ہے۔ پھر وہ کون ہے جو اللہ تعالٰی کی حرام نہ کی ہوئی چیز کو حرام قرار دے۔ قرآن کا قول فیصل ہے:

ولا تقولو لما تصف السنتکم الکذب ھذا حلال وھذا حرام لتفترو علی اللہ الکذب۔ (نحل ۱۵)

ترجمہ "اور جن چیزوں کے بارے میں محض تمہارا جھوٹا زبانی دعوٰی ہے ان کی نسبت یوں نہ کہہ دیا کرو کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں چیز حرام ہے جس کا حاصل یہ ہو گا کہ اللہ پر جھوٹی تہمت لگا دو گے"۔

(ترجمہ اشرف علی صاحب تھانوی)

جہاں تک کہ فنون لطیفہ کا تعلق ہے۔ میں نے اس کتاب میں بطور خاص کوئی جنسی تفریق و تقسیم یا صنفی تخصیص و تعلیم بالکل نہیں کی تھی۔ مگر میرے ایک نہایت ذی علم اہلحدیث دوست اور دوسرے ایک عاقل حنفی قدردان نے "عورت" کے مسئلے کو لے کر اپنے خطوط میں میری توجہ بعض آیات قرآنی کی طرف مبذول کرائی ہے۔ چونکہ یہ علمی مسئلہ ہے اور دوسروں کے لئے بھی بصیرت کا ذریعہ لہذا میں نے مناسب

سمجھا ہے کہ یہاں ان تحریروں کا ذکر کر دوں۔ اول الذکر مقتدر اہل حدیث دوست نے تحریر فرمایا ہے کہ:۔

"میں آپ کے سامنے قرآن کی چند آیتیں رکھتا ہوں۔ اس میں غور فرمائیں

١۔لا تبر جن تبرج الجا هلیته ٢۔ یغضضن من ا بصا ر هن ٣۔ لا یبد ین زینتهن۔

ان آیات کے اندر رقاصہ عورتیں داخل ہیں یا نہیں؟ اگر داخل نہیں ہیں تو استثناء کے لئے کوئی نص قرآنی پیش فرمائیں اور اگر داخل ہیں تو پھر ان کے لئے ثبوت رقص کہاں سے ثابت ہوتا ہے؟ اور کیا موجودہ دور میں جو سینما کے پردہ پر رقص کا مظاہرہ کیا جاتا ہے وہ روح قرآن کے موافق ہے جو ہر حال میں صحیح اخلاق اور طہارت کا قائل ہے؟ واضح رہے کہ مذکورہ بالا آیات صرف عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں اور انہی کو ان میں مخاطب کیا گیا ہے"۔

اخرالذکر نے لکھا ہے:۔

"غیر محرم عورتوں اور مردوں کا مخلوط رقص یا بصورت غیر مخلوط مردوں کا رقص عام عورتوں کو دیکھنا یا عورتوں کا رقص عام مردوں کو دیکھنا' بفحوائے آیتہ **"غض بصر"** اور **"لاتبر جن تبرج الجاهلیته الاولی"** قطعی حرام ہونا چاہیے"۔

انداز تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں حضرات موسیقی کو حرام نہیں سمجھتے البتہ رقص کو اور وہ بھی صرف عورتوں کے لئے ناجائز سمجھتے ہیں۔ بہرکیف! دونوں محترم فاضل حضرات مجھ سے زیادہ واقف ہیں کہ آج تک "تبرج" و "زینت" اور "غض بصر" کا کوئی متفقہ مفہوم متعین اور پیش نہ ہو سکا ہے اور گنجائش بحث وکلام بے پایاں موجود ہے۔ نیز میں خود بھی اس بارے میں ایک خاص رائے رکھتا ہوں مگر اس ذکر وبحث کا یہ محل نہیں۔ جہاں تک زیر بحث موضوع "رقص وموسیقی" کا تعلق ہے۔

میں یہاں صرف اتنا ہی عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ آپ حضرات "رقص وموسیقی" کو جس صنف وجنس کے لئے اور جس احاطہ وحد تک بھی روا رکھ سکتے ہوں۔ اسی صنف وحد تک کے بارے میں سہی، مگر صاف صاف یہ تسلیم تو کیجئے کہ ہاں رقص وموسیقی اسلام میں جائز ہے اور حرام نہیں؟ میری بحث تو صرف اتنی ہی ہے۔ میں ہرگز عورتوں کو ان حقوق و آزادی کا حامی وداعی نہیں جو یورپ نے انہیں دے رکھا ہے۔ یہ افراط ہے اور تباہ کن بلکہ خلاف قرآن، مگر میں ایشیا کے اس خیانت وغضب کا بھی قائل نہیں جو اس نے عورتوں کے معاملے میں جائز قرار دیا ہے۔ یہ تفریط ہے اور خلاف قرآن، آپ مردوں کے لئے رقص وموسیقی کو نصب العین بنانے کا مجاز نہیں گردانتے تو نہایت مبارک خیال ہے۔ مگر یہ تو واضح اجازت دیجئے کہ ہاں وہ فن کے لحاظ سے اس میں دلچسپی لے سکتے ہیں اور اسلام اس سے منع نہیں کرتا؟ آپ عورتوں کے اسٹیج پر گانے ناچنے کو حرام سمجھتے ہیں بہت خوب، میں آپ کا سو فیصدی ہم خیال ہوں مگر یہ تو واشگاف تسلیم کیجئے کہ ہاں وہ اپنے گھروں میں ناچ گا سکتی ہیں۔ اور یہ اسلام میں حرام نہیں؟ یہاں تو فی نفسہ رقص وموسیقی ہی کو اسلام میں حرام مطلق قرار دے دیا گیا ہے۔ موسیقی کے ریکارڈ تک سننا جرم عظیم قرار پا گیا ہے اور میں اس فتوے کو قطعی باطل سمجھتا ہوں کیونکہ قرآن نے رقص وموسیقی پر کوئی پابندی عائد نہیں کی ہے۔

رہائی نفسہ عورت ومرد کی مساوات وبرابری کی حیثیت، محرم ونامحرم کی قید، مخلوط وغیر مخلوط کی بندش اور غض بصر وغیرہ کا مسئلہ۔ تو میری کتاب کے موضوع سے اس کا کوئی سروکار نہیں۔ اس لئے میں یہاں از خود کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا تاہم بے جانہ ہو گا اگر میں کچھ علمی وعملی اشارے کر دوں۔ حضرت علامہ ابوالکلام آزاد نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "ترجمان القرآن" جلد دوم میں اس موقع کے لئے بہت کچھ لکھا ہے۔ دو اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

> ۱۔ بلاشبہ مردوں نے، اپنی ظالمانہ خود غرضیوں سے عورتوں کے بارے میں ہمیشہ ایسے ہی فیصلے کئے ہیں، لیکن قرآن کا یہ فیصلہ نہیں ہے۔ اس نے ہر جگہ مرد اور عورت دونوں کا مساویانہ حیثیت سے ذکر کیا ہے اور فضائل

وخصائل کے لحاظ سے وہ دونوں میں کسی طرح کی بھی تفریق نہیں کرتا۔ سورہ نساء میں جہاں ازدواجی زندگی کے احکام کی تشریح ہے۔ وہاں صاف صاف تصریح کر دی ہے کہ فضائل ومحاسن کے لحاظ سے دونوں یکساں طور پر اپنی اپنی راہیں رکھتے ہیں اور دونوں کے لئے ایک ہی طرح پر فضیلتوں کا دروازہ کھول دیا گیا ہے (۴/۳۱) چنانچہ جس طرح وہ نیک مردوں کے فضائل ومدارج بتلاتا ہے۔ اسی طرح نیک عورتوں کے لئے بھی بتلاتا ہے اور جس طرح بدعمل مردوں کی برائیاں بتلائی ہیں۔ اسی طرح بدعمل عورتوں کی بھی بتلائی ہیں۔ کہیں بھی دونوں میں کسی طرح کا امتیاز اس نے جائز نہیں رکھا ہے۔ مردوں کے لئے اگر فرمایا (۹/۱۱۲) تو عورتوں کے لئے بھی فرمایا (۶۶/۵) منافقوں کا ذکر کیا تو صرف مردوں ہی کا نہیں کیا دونوں جنسوں کا کیا (۹/۲۷) مومنوں کا ذکر کیا تو صرف مردوں ہی کا نہیں کیا دونوں کا کیا (۹/۲۷) مردوں اور عورتوں کی یہ اخلاقی مساوات' اس کا عام اسلوب ہے۔ ہر جگہ تم دیکھو گے کہ دونوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کرتا' ایک ہی درجہ میں رکھتا اور ایک ہی طرح پر ذکر وخطاب کرتا ہے (۳۳/۳۵) غور کرو کسی وصف میں بھی تفریق نہیں' کسی فضیلت میں بھی امتیاز' کسی بڑائی میں بھی عدم مساوات نہیں"۔ (صفحہ ۲۶۵)

۲۔ "تم نے بعض علماء کے فتوے پڑھے ہوں گے کہ مسلمانوں کو وقت کی سیاسی مجلسوں میں شریک نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس میں غیر مسلم عورتیں کھلے منہ موجود ہوتی ہیں اور اس لئے ان کی شرکت فتنہ سے خالی نہیں۔ اسی طرح یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ ان کی شراکت سے نماز باجماعت فوت ہو جاتی ہے اور یہ تقویٰ کے خلاف ہے۔ یاد رکھو' یہ تقوی اور دینداری نہیں جو ان کاموں کی مخالفت پر انہیں ابھارتی ہے۔ یہ مرض نفاق کی قسموں میں سے ایک قسم ہے اور قرآن کی شہادت اس کے لئے بس کرتی ہے"۔ (صفحہ ۹۵)

یہ بات بھی ذہن میں رکھئے کہ یہ صرف ابوالکلام آزاد کی آواز نہیں جو ہندوستانی

ہیں بلکہ دراصل "ترجمان القرآن" کی رائے ہے کہ ان رایوں کا جو اسی دور میں ٹیونس کے فاضل اہل قلم الطاہر الحداد ٹیونسی نے اپنی کتاب "قانون شریعت اور معاشرے میں ہماری عورت" میں اور خود بخد کے مشہور صاحب فکر عبد اللہ علی القاسمی بخدی نے اپنی کتاب "یہ ہیں زنجیریں" اور مصر کے مشہور ادیب خالد محمد خلیل الازہری نے اپنی کتاب "ہم یہاں سے شروع کرتے ہیں" میں پیش کی ہیں۔ آخرالذکر کتاب کو تو علماء کی ایک کمیٹی نے ایک خاص وجہ سے خلاف مذہب کہہ کر قابل ملامت قرار دیا تھا اور اسے ضبط کر لینے کا حکومت سے مطالبہ کیا گیا تھا لیکن عدالت نے فیصلہ دیا کہ اس سے اللہ کی شان کا اظہار ہوتا ہے۔ رسول کی عظمت ثابت ہوتی ہے اور عوام کے مفاد کی وکالت ہوتی ہے۔

ٹیونسی عالم نے پوری طاقت سے لکھا ہے کہ ہمیں اسلام کے ابدی حقائق کو جو دین اسلام کی بنیاد ہیں' چند ان قوانین و ضوابط سے علیحدہ کر کے دیکھنا' چاہئے۔ جو اسلام نے عارضی طور پر ضروریات پورا کرنے کے لئے مقرر کئے تھے اس کا خیال ہے کہ ٹیونسی معاشرے کی اصل خرابی کی جڑ عورتوں کی پست حیثیت ہے اور اس سے نجات کا ایک ضروری انداز یہ ہے کہ عورتوں کو تعلیم دی جائے اور زندگی کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں انہیں بھی مردوں کے برابر شریک کیا جائے۔ نجدی فاضل نے تو عورتوں کی حیثیت کو معاشرے میں مساوی قرار دیتے ہوئے مردوں کی خود غرضی اور ظلم پر سختی سے نکتہ چینی کی ہے۔ جس کی وجہ سے عورتوں کو آزادی و تعلیم سے محروم رکھا گیا اور تعلیمات مذہب کا نام دے کر عورت کو ایک ذلیل حیثیت دی گئی نجدی کا خیال ہے کہ صرف وہی قوم' جس کی عورتوں کو مناسب تعلیم ملتی ہے' یہ امید رکھ سکتی ہے کہ اس کے مردوں کو صحیح اور مفید تعلیم نصیب ہو سکے گی۔ اور یہ سب ہندی مصری' ٹیونسی اور نجدی آواز کی صدائے بازگشت ہے۔ شہرہ آفاق مصری مصنف مفتی محمد عبدہ' کے ممتاز شاگرد قاسم امین کی کتاب "آزادی نسواں" کی جس کی اشاعت پر علماء کی جانب سے ناراضگی کا ایک طوفان برپا کر دیا گیا تھا۔ یہ وہ کتاب ہے جس کا انگلستان' روس اور جرمنی میں ترجمہ شائع کیا گیا تھا۔ ابھی حال میں ڈاکٹر نجلا عزالدین کی کتاب "عرب دنیا" امریکہ سے شائع ہوئی ہے۔ یہ پوری عرب دنیا کی واحد خاتون

ہیں۔ جنہوں نے امریکی یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں عرب دنیا کے حالات پر نہایت عالمانہ گہری نظر ڈالی اور سیر حاصل بحث کی ہے اس کتاب کا ایک باب "عرب عورت" بھی ہے جو یوں شروع ہوا ہے۔

"مغربی عوام' خانہ نشینی اور نقاب کو عرب اور مسلمان عورت کے لئے لازم ملزوم سمجھتے ہیں اس کا احساس بہت کم ہے کہ اس رواج کے دوش بدوش' آزادی کی ایک طولانی روایت بھی تھی جو اچھی طرح جڑ پکڑے ہوئے تھی"۔

کتاب کا اختتام ان الفاظ پر ہوا ہے۔

اگر عرب تہذیب کی تشکیل جدید ہو جائے تو اس میں دنیا کے لئے ایک ایسا پیغمبر نظر آئے گا جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا.......... اس کی بنیادی روح اور اخلاقیات کی اہمیت کے ذریعہ جسے اسلام نے ہر موضوع میں داخل کر دیا ہے خواہ وہ سائنس ہو' اقتصادیات ہو یا سیاست' اس تہذیب جدید کا عدم توازن دور کیا جا سکتا ہے جس میں زیادہ زور سائنس پر دیا جاتا ہے۔ "خیر الامور اوسطہا" کا اصول اعتدال اس میں افراط روا ہے نہ تفریط جو عرب روایت کا مقبول ترین' نصب العین ہے۔ مبالغے اور افراط کا مانع ہے اور انتہا پسندی سے روکنے کا مؤثر ذریعہ" انہوں نے عرب عورتوں کے سلسلے میں ہر وہ بات کہی ہے جو کہنے کی ہے۔ انہوں نے عہد جدید کے ساتھ ساتھ اسلام کے عہد اول پر بھی کافی کچھ لکھا ہے۔ مثلاً"

(۱) "اسلام نے عورت کو ایک مستقل ہستی تسلیم کیا ہے اسے مردوں کا دم چھلہ قرار نہیں دیا۔"

(۲) "اسلام کی پہلی صدی عربوں کی توسیع کا عہد تھی اور اس نے لوگوں کو انفرادی و اجتماعی' بہادری کے کاموں پر ابھارا۔ ان عورتوں کے لاتعداد واقعات ہیں' جو مردوں کے پہلو بہ پہلو بہادری سے لڑیں"۔

(۳) ء"ان دنوں عورتیں چار دیواری میں نہیں رکھی جاتی تھیں۔ نہ نقاب ڈالے رہتی تھیں' بلکہ مردوں کے ساتھ پبلک تقریبات میں شریک ہوا کرتی تھیں.....

اس کی آزادی پر یہ پابندیاں معاشی اور معاشرتی اثرات کے تحت' جو عربوں اور مسلمانوں کی ابتدائی معاشرہ کے لئے غیر ملکی تھے' بعد کے عہد میں آئیں۔"

(۴) "عورتیں جامع مسجدوں میں تقریر کرتیں جن میں مشہور مرد موجود ہوتے اور ان سے اسناد یا اجازت نامے حاصل کرتے تاکہ جس نصاب میں انہوں نے شرکت کی تھی اسے دوسروں کو سکھائیں"۔

ڈاکٹر نجلا نے بتایا ہے کہ اس وقت پوری عرب دنیا میں۔

"عورتیں تمام پیشوں میں داخل ہو چکی ہیں اور کامیابی کے ساتھ طبابت وکالت اور صحافت کے مشاغل میں مصروف ہیں مگر ان کا بڑا میدان تعلیم ہے ہزاروں عورتیں' عرب ملکوں کے تعلیمی نظام میں جو وسعت اختیار کرتا جاتا ہے۔ تعلیم دے رہی ہیں......... ان کی بے شمار انجمنیں ہیں جو فلاح معاشرہ کے لئے بہت اچھا اور ضروری کام سرانجام دے رہی ہیں......... اور اس کی تشہیر بہت کم کرتی ہیں"۔

آخر میں یہ اقتباس بھی قابل ملاحظہ ہے۔

"فنون لطیفہ کی تعلیم' ادارہ معلمات فنون لطیفہ میں دی جاتی ہے جس میں بہت اچھے اساتذہ اور ساز و سامان ہیں۔ اسی طرح فنون لطیفہ کی مخلوط تعلیم والے اعلیٰ اسکولوں میں بھی فنون لطیفہ کی تعلیم کا انتظام ہے فن ڈراما کا مدرسہ بھی مخلوط تعلیم کا مدرسہ ہے"۔

ان سب سے قطع نظر' میرے ان محترم کرم فرماؤں سے یہ مخفی نہ ہو گا کہ جس خدا نے اسلامی معاشرہ میں دونوں کے مخصوص فرائض کو الگ کرنے کے بعد قرآن میں علمی حیثیت سے عورتوں ار مردوں کے سارے حقوق مساویانہ اور بالکل برابر عطا کئے ہیں۔ وہی خدا عملی اعتبار سے بھی اس مساوات و برابری کے اصولی حق اور نظر نواز منظر کو مسلمانوں کے سامنے ہزاروں برس سے عبرت و بصیرت کے لئے حج کے موقع پر پیش کرتا چلا آتا ہے' جس سے یہ ساری نظری بحث بیکار قرار پاتی ہے۔ ہر سال دنیا آفتاب کی زر پاش روشنی میں کھلی آنکھوں سے دیکھتی چلی آتی ہے کہ سادہ پوشاک میں بلا کوئی بجتے والا زیور پہنے' کھلے منہ لاکھوں لاکھ' غیر محرم مردوں کے دوش بدوش ہر

طبقہ و عمر اور ہر ملک و خطہ کی مسلمان عورتیں' خدا کے گھر کا مخلوط طواف کرتی ہیں اس موقع پر جب کہ خدائی نگاہ کے سامنے' خدا کے گھر کے پاس خدا کے رسولؐ کے بتائے ہوئے طریقے پر' خدا کے بندے' خدا کے احکام کی پیروی کرتے ہیں۔ محرم و نا محرم مخلوط و غیر مخلوط' مساوات و عدم مساوات اور غض بصر و غیرہ کی بحث و تکرار پانی ہو کر بہہ جاتی اور غبار بن کر اڑ جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس مبارک محل پر اسلام میں عورت کی جو صحیح پوزیشن ہے' اس کے جو مساویانہ حق ہیں اور اس کا جو مرتبہ ہے۔ اصلی شکل میں عملی حیثیت سے سامنے آجاتا ہے اور اس عملی شکل سے بہتر کوئی تحریر و تقریر روشنی نہیں ڈال سکتی۔ اس جگہ خدائی احکام اور قرآنی آیات کی اصلی تشریح اور صحیح تفسیر' بیت اللہ کے نور سے شفاف صورت میں نکھر کر از خود ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس باب میں میرا عقیدہ یہ ہے کہ قرآنی اقدار اور نسوانی وقار کو جراحت پہنچائے بغیر مسلمان عورت کے لئے بھی وہ سب کچھ جائز ہے جو ایک مسلمان مرد کے لئے جائز قرار دیا گیا ہے یا دیا جا سکتا ہے۔

شعر و شاعری

شعر کا شمار بھی فنون لطیفہ ہی میں ہے اور بقول علامہ اقبال رقص و موسیقی سے خاص طور پر وابستہ:۔

شعر سے روشن ہے جان جبرئیل و اہرمن
رقص و موسیقی سے ہے سوز و سرور انجمن
فاش یوں کرتا ہے' اک چینی حکیم اسرار فن
شعر گویا روح موسیقی ہے' رقص اس کا بدن

اگرچہ اس پر کسی مذہبی پابندی عائد نہیں جیسی دیگر فنون لطیفہ پر۔ کیونکہ اس معاملے میں روایات بھی خلاف ہیں۔ پھر بھی ایک طبقہ اس کا مخالف ضرور ہے اور اس بارے میں وہ قرآن پیش کرتا ہے۔ جس کی دو آیتوں میں شعرا کی مذمت اور شاعری کے نبی کے شایان شان نہ ہونے کا ذکر ہے۔ چونکہ ان دونوں آیتوں کو غلط سمجھا گیا ہے۔ اور محترم علامہ غلام احمد پرویز نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "معراج انسانیت" (صفحہ ۳۰۸ تا صفحہ ۳۱۰) میں ان دونوں آیتوں کو نہایت عمدہ طریقے پر سمجھایا ہے۔ اس لئے میں صرف اسی مقتدر تحریر کا ضروری اقتباس پیش کر دینا کافی اور تسلی بخش سمجھتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"مخالفین' حضورؐ کے متعلق یہ بھی لکھتے ہیں کہ آپ ایک شاعر ہیں اس لئے آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ حقیقت پر مبنی نہیں اور نہ ہی اس قابل کہ اس پر کسی وقت سنجیدگی سے غور کیا جائے۔ قرآن کریم نے اس کی تردید کی اور فرمایا کہ:۔

وما علمنه الشعر وما ینبغی له ط (۳۶/۶۹)

ترجمہ "اور دیکھو! ہم نے محمد کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ ہی شاعری

اس کے لئے مناسب ہو سکتی ہے"

یعنی یہ کہ آپ شاعر نہیں اس لئے کہ شاعری ایک پیغمبر کے شایان شان ہی نہیں۔ اس سے ظاہر مترشح ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے شعروشاعری کی مخالفت کی ہے اور اسے مسلک پیغمبری کے خلاف قرار دیا ہے۔

"زبان اظہار مدعا کا ذریعہ ہے اور نوع انسانی کے لئے بہت بڑا امتیاز۔ اس اظہار مدعا کے لئے انسانوں نے دو انداز اختیار کئے ہیں۔ ایک تو وہ جس میں ہم روزمرہ باتیں کرتے ہیں اسے نثر کہتے ہیں۔ دوسرے شعر۔ شعر کیا ہے؟ نثر کے الفاظ کو ایک خاص ترتیب میں رکھ دیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے نظم اور نثر الفاظ کی ترتیب کے دو مختلف اسلوب ہیں' قرآن کریم جو زندگی کے حقائق پیش کرتا ہے ایسی نیچی سطح پر نہیں اتر سکتا کہ ان دو اسالیب بیان میں سے ایک کی ایسی مذمت کرے کہ وہ کسی بلند شخصیت کے شایان شان ہی نہ رہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ جب قرآن کریم نے یہ کہا کہ شاعری رسولؐ کے شایان شان نہیں تو اس سے مقصود الفاظ کی وہ خاص ترتیب نہیں جس سے شعر موزون ہو جاتا ہے بلکہ ایک خاص نفسیاتی کیفیت ہے جسے اس نے شاعری سے تعبیر کیا ہے۔ یہ نفسیاتی کیفیت یا مسلک حیات کیا ہے؟ اس کی قرآن نے خود ہی دوسرے مقام پر تشریح کر دی ہے۔ قرآن کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ انسان کی زندگی کا ایک خاص نصب العین ہے اور اس نصب العین کا حصول اس کی تمام جدوجہد کا مقصود۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اس کے نزدیک سفر زندگی میں صحیح منزل کے تعین کا نام ہے۔ ایمان اور اس منزل تک پہنچنے کی کوشش کا نام اعمال صالحہ۔ ایمان و عمل کی زندگی اس کے نزدیک انسانیت کی زندگی ہے۔ لہٰذا ایک مومن کی زندگی اور رسولؐ کے شایان شان اسلوب حیات۔

اس کے برعکس ایک دوسرا اسلوب زندگی ہے جس میں نہ انسان کی آنکھوں کے سامنے صحیح نصب العین ہوتا ہے نہ دل میں اس نصب العین کے حصول کی تڑپ۔ اس کے جذبات اس کا معبود ہوتے ہیں اور ان کی تسکین اس کی زندگی کا منتہیٰ۔ یہ جذبات اس کی ناک میں نکیل ڈالے اسے زندگی کی مختلف راہوں پر ادھر ادھر لئے پھرتے ہیں۔

کبھی تصورات کی ان حسین وادیوں میں ' کبھی تخیلات کے ان نگاہ فریب مناظر کی طرف۔ چونکہ زندگی کا نصب العین نہیں ہوتا۔ اس لئے آج جذبات کی رو میں کچھ کہہ رہے ہیں۔ کل کچھ اور جس قسم کا جذبہ دل میں موج زن ہوا اسی قسم کی آواز زبان پر آ گئی۔ چونکہ جذبات کے اظہار کے لئے شعر کی زبان زیادہ موزوں سمجھی گئی ہے۔ اس لئے جذبات پرستی کی اس نہج کی زندگی کا نام قرآن نے شاعری رکھا ہے جو ایک مومن کی زندگی کے بالکل برعکس زندگی ہے۔ یہ دو مختلف اسالیب حیات ہیں جن کا تقابل قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے:۔

والشعراء یتبعھم الغاون. الم تر انھم فی کل واد یھیمون. وانھم یقولون مالا یفعلون. (۲۶/۲۲۴)

ترجمہ "اور شاعروں کی پیروی ہمیشہ گم کردہ راہ لوگ کیا کرتے ہیں (اے پیغمبر) تم نے دیکھا نہیں کہ وہ (روز) ہر (نئی) وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ اور یہ کہ وہ لوگ وہ باتیں کہتے ہیں جو خود کرتے نہیں ہیں؟"

"یعنی نہ ان کے فکر کا صحیح مرکز متعین ہے اور نہ ان کے قول اور عمل میں تطابق۔ یہ ہے نفسیات شاعر۔ اور وہ اسلوب حیات جس کی خصوصیت' پریشانی فکر و نظر' آوارگی' قلب و نگاہ اور فقدان کردار و عمل ہے ــــ اس کے برعکس ایک دوسرا انداز حیات ہے جس میں زندگی کا نصب العین متعین ہے اور انسان کا ہر قدم اس نصب العین کی طرف اٹھتا ہے:

الا الذین امنوا وعملوا الصلحت وذکروا اللہ کثیرا۔

ترجمہ "(ہاں) سو ان لوگوں کے جو (پیغام حق پر) یقین لے آئے ہیں اور جنہوں نے نیک کام کئے اور اللہ کو بہت یاد کیا"

"سورہ شعراء کی ان آیات کے دونوں حصوں کو ایک مرتبہ پھر دیکھئے ان کے درمیان جو "الا" (مستثنیٰ) آیا ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ مسلم شعراء ہدایت وسعادت کی راہ پر ہیں اس لئے قرآن کے نزدیک محبوب و مرغوب ــــ اور غیر مسلم

شعراء ضلالت وغوایت پر ہیں۔ اس لئے مغضوب و مبغوض ـــ مفہوم اس سے یہ ہے کہ جو لوگ اول الذکر انداز زندگی اختیار کئے ہوئے ہیں وہ غلط روش پر جا رہے ہیں لیکن جو دوسرا انداز اختیار کئے ہیں وہ صحیح راستے پر چل رہے ہیں۔ قرآنی انداز زندگی اختیار کرنے والا اپنے مدعا کا اظہار نظم میں بھی کرے تو جائز اور درست ـــــ غیر قرآنی اسلوب حیات اختیار کرنے والا اپنا مفہوم نثر میں ادا کرے تو بھی غلط قرآن اسالیب زندگی سے بحث کرتا ہے نہ کہ طرق اظہار مدعا سے۔ لہذا قرآن نے جب شاعری کو غوایت کی راہ کہا ہے تو اس سے مفہوم وہ نفسیاتی کیفیت ہے جو انسان کو غلط روش زندگی پر لے جاتی اور فکر و عمل کی دنیا میں کہیں کا نہیں چھوڑتی"

یہ ہے علامہ موصوف کی تحریر اور اب بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن میں فی نفسہ شاعری کی مذمت نہیں' اسی لئے خود رسول اللہ صلعم حضرت حسانؓ سے منبر پر بٹھا کر شعر سنتے تھے۔

چونکہ شعر وشاعری کا شمار لوگوں نے' تفریح' کھیل کود اور لہوولعب میں کر کے اسے ناپسندیدہ فعل قرار دیا ہے اس لئے میں فی نفسہ کھیلوں کے سلسلے میں بھی' یہیں پر کچھ کہہ دینا چاہتا ہوں۔ کھیل دو قسم کے ہوتے ہیں ۔ ایک ورزشی' جو اعضاء وجوارح میں اضافہ وطاقت سے تعلق رکھتے ہیں اور دوسرے غیر ورزشی' جن کا سروکار ذہن ودماغ کی تربیت وترقی سے ہوتا ہے اور لوگ بیٹھ کر کھیلتے ہیں۔ ورزشی کھیل تو گویا مسلمانوں پر فرض ہیں:۔

یا یہا الذین امنو لیبلو نکم اللہ بشیء من الصید تنا لہ ایدیکم و رما حکم لیعلم اللہ من یخا فہ بالغیب فمن اعتدی بعد ذالک فلہ عذاب علیم۔ (مائدہ۔ ۳)

ترجمہ "اے ایمان والو! اللہ کچھ شکار کے سلسلے میں تم کو ضرور آزمائے گا جن تک تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے پہنچ سکتے ہیں۔ تاکہ اللہ معلوم کرلے کہ کون اس سے بغیر دیکھے ڈرتا ہے۔ سو جو کوئی اس کے بعد حد سے نکلے گا اس کے لئے دردناک سزا ہے"

غور فرمائیے' یہ ورزشی کھیلوں ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس طور پر کہ اس سے کچھ فائدہ بھی ہو۔ ہاتھ سے مراد شکار کا ہاتھ سے ہی پکڑنا نہیں۔ بلکہ کمپا اور جال وغیرہ سے سالم پکڑنا بھی ہے۔ اور نیزے کے شکار سے مراد ایسا شکار ہے جو زخمی کر کے حاصل کیا جائے۔ اس میں تیر' بندوق' بنسی وغیرہ سب آ جاتے ہیں پہلے سے چھوٹا اور دوسرے سے بڑا شکار بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔ اس میں وہ کھیل بھی آ جائے گے جو ورزشی ہیں' کشتی اور دوڑ وغیرہ بھی مقابلے کے شکار ہی ہیں۔ نشانہ بازی وغیرہ بھی اسی میں شکار ہو گا اس لئے کہ اس سے قوت حاصل ہوتی ہے۔

اعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ۔ (انفل۔ ۸)

ترجمہ "تم سے جس قدر بھی ممکن ہو قوت بہم پہنچائے رکھو"

حد سے نکلنے کی جو شرط عائد کی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خدائی حدود کے اندر ہو یعنی وہ جوا اور داؤ کا کھیل نہ ہو۔ مثلاً" گھوڑ دوڑ کا مقابلہ تو عین حکم الٰہی ہے مگر جب اس پر داؤ لگا دیا اور ریس کھیلنے لگے تو یہ حرام ہو گیا۔

غیر ورزشی کھیل' یعنی جو بیٹھ کر کھیلے جاتے ہیں' وہ بھی درست ہیں۔ بشرطیکہ ان میں جوا نہ ہو اور ان کھیلوں پر داؤ نہ لگاتے جائیں۔ بیٹھ کر لوگوں کی ہجو وغیبت کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ کوئی مفید کھیل وغیرہ کھیلا جائے تاکہ تفریح بھی ہو اور دماغ پر بھی زور پڑے۔ غور و فکر کی طاقت بڑھانے والے کھیل ضرور کھیلنے چاہیں مگر ہر کھیل تفریح اور کھیل تک ہی محدود رہنا چاہیے۔ انہیں تضیع اوقات کا ذریعہ یا لازمہ حیات اور نصب العین نہ بنا لینا چاہیے۔

آج گھوڑ دوڑ' تاش' چوسر اور شطرنج وغیرہ کو بھی مسلمانوں کے لئے حرام بتایا جاتا ہے۔ حالانکہ فی نفسہ ہرگز یہ کھیل حرام نہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ گھوڑ دوڑ کا رواج خود عہد نبوی میں تھا۔ اونٹنی کی دوڑ میں خود آنحضرت کی اونٹنی شریک ہوتی تھی اور کئی بار اول آئی تھی۔ زیادہ تر اس کھیل کا انتظام حضرت علیؓ کے ہاتھوں میں تھا۔ مقصود یہ تھا کہ نہ صرف انسان پر شوق اور چاق وچوبند رہیں بلکہ بہتر سے بہتر جانور بھی مسلمانوں

کے پاس رہیں۔ تاش بھی آج ناجائز کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ شاہانہ دماغی ورزش کا مظہر ہے۔ جس میں شہنشاہ' ملکہ اور اس کے خاص غلام تک عوام کے ساتھ مصروف عمل دکھائے گئے ہیں۔ چوسر اور شطرنج بھی نہایت مفید بلکہ مذہبی کھیل ہیں۔ مشہور عرب مصنف یعقوبی (وفات ۲۸۴ھ ۔ ۸۹۴ء) نے اس کی تاریخ بتائی ہے کہ یہ محض کھیل نہیں بلکہ ان کی بنیاد علم ہیئت اور حساب بلکہ مذہبی فلسفے پر ہے۔ چوسر کی بساط دراصل انقلاب روزگار کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ جس کے خانے آسانی بروج' سال کے دن اور دن کے گھنٹے ظاہر کرتے ہیں۔ اسی طرح شطرنج بھی محض لایعنی کھیل نہیں۔ یعقوبی کا بیان ہے کہ چوسر اور شطرنج دو مذہبی مکتبہ خیال کی ترجمانی کرتے ہیں۔ چوسر کے موجد نے اس کھیل کے ذریعے سے ہندوستانی راجے کو یہ مذہبی فلسفہ تلقین کرنا چاہا تھا کہ انسان مجبور محض ہے۔ آسمانوں اور ستاروں کی گردش جو کچھ چاہتی ہے۔ وہ انسانوں سے کراتی ہے۔ دنیا کے میدان میں انسان کا کوئی قدم خود انسان کے ارادے اور نیت سے نہیں اٹھتا بلکہ کوئی اور ہے جو اپنے ہتھکنڈوں کے ذریعے سے جبریہ قدم اٹھواتا ہے۔ چونکہ یہ کھیل جذبہ سعی و کوشش اور ولولہ جہد و عمل' انسان سے چھین لینا چاہتا تھا۔ اس لئے دوسرے فلسفی شاطر نے اس کے رو میں شطرنج ایجاد کر کے پیش کیا اور اس کھیل کے ذریعے سے راجے کو بتایا کہ جبر کا عقیدہ باطل ہے۔ اور بادشاہ ہو یا رعایا' تمام انسان مختار ہیں اور انسان کی ہار جیت' کامیابی وناکامی اور فتح و شکست کا انحصار انسان کی اپنی دماغی فہم و فراست اور عملی جدوجہد پر ہے۔ اس لئے انسان کو ستاروں کی چال اور آسمانوں کی گردش کے تصور میں محو ہو کر بے عمل نہ ہونا چاہیے۔ بقول اقبال:

ستارہ کیا میری تقدیر کی خبر دے گا؟
وہ خود فراخی افلاک میں ہے خوار وزبوں

بلکہ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ بساط بھر' سعی و کوشش اور عملی جدوجہد میں پوری طرح حصہ لے ورنہ زندگی کی بازی میں ہار یقینی ہے۔ قرآن نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ امکانی عملی جدوجہد کے بعد خدا سے کامیابی کی دعا بھی کرنی چاہیے۔

آج مسلمانوں کا جو کمال سنا جاتا ہے وہ صرف یہ کہ فلاں نے ۹۶ گھنٹے سائیکل چلائی

اور فلاں نے سوا سو گھنٹے۔ اس کے بعد پوچھئے تو معلوم ہو کہ آپ صفر ہی صفر ہیں مگر جب ان کے دن اچھے تھے تو علم و فضل کے ساتھ وہ کھیل بھی ایسا کھیلتے تھے جو انہیں معراج عطا کرے۔ مثلاً" اسی شطرنج کو لیجئے۔ خلیفہ المکتفی (۲۸۹ھ۔ ۹۰۲ء تا ۲۹۵ھ۔ ۹۰۸ء) کے عہد میں ملاوردی ایک نہایت صاحب علم اور کئی نادر کتابوں کا مصنف، شطرنج بازی میں سب سے فائق سمجھا جاتا تھا۔ اور خیال کیا جاتا تھا کہ اسے شکست دینے والا پردہ زمین پر کوئی موجود نہیں۔ مگر جب ابوبکر محمد بن یحییٰ نے، جو "الصولی" کے نام سے مشہور ہے۔ (وفات ۳۳۶ھ۔ ۹۳۶ء) ملاوردی کو شطرنج میں شکست دے دی اور اسے مات کر دیا تو اس قدر شہرہ ہوا کہ المکتفی نے اس کو اپنے درباریوں میں شامل کر لیا۔ مگر یہ بھی واضح رہے کہ الصولی صرف شطرنجی نہ تھا۔ وہ اپنے عہد کا بہترین ادیب و مورخ بھی تھا۔ ادب میں اس کی کئی کتابیں مسلم ہیں اور بحیثیت مورخ، وہ عہد عباسیہ کی تاریخ کا ماہر مانا جاتا ہے۔ یا قطب الدین محمود بن مسعود بن مصلح (وفات ۷۱۰ھ۔ ۱۳۱۱ء) کو لیجئے کہ وہ اپنے دور کا بہترین شطرنج باز تھا مگر بہت بڑا فلسفی، ہیئت دان اور طبیب بھی تھا۔ اس نے "فتح المنان" کے نام سے ایک تفسیر لکھی تھی۔ زمخشری کی تفسیر "کشاف" پر حاشیہ لکھا تھا اور مشکلات القرآن، کے نام کا ایک رسالہ لکھا تھا جس میں صرف ان آیات کی تفسیر لکھی تھی جو بظاہر ایک دوسرے سے معارض معلوم ہوتی ہیں۔ فی زمانہ ایسی ہی کتاب علامہ حافظ اسلم جیراجپوری نے "نکات قرآن" کے نام سے لکھی ہے۔ جو قابل دید ہے۔ قطب الدین نے طب میں بھی کئی کتابیں خصوصاً" امراض چشم پر لکھی تھیں اور شیخ بو علی سینا کی مشہور کتاب "قانون" کو بھی از سر نو مرتب کیا تھا۔ فقہ میں بھی ایسی ہی دستگاہ رکھتا تھا کہ وہ کئی برس تک سیورس میں قاضی رہا تھا۔

شطرنج ایک عمدہ فکری کھیل ہے، لوگوں نے کہا ہے کہ یہ دو لفظ "شط" بمعنی "دریا" اور "رنج" بمعنی "فکر" سے بنا ہے، لہٰذا دریا کی سی رواں دواں وسیع و عمیق اور پیچ و خم والی "فکر" اس میں درکار ہوتی ہے۔ دراصل شطرنج کھیل کو زندگی کا کھیل سمجھنا چاہیے۔ اس کا زندگی سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ جب زندگی کی قدریں بدلتی ہیں تو اس کھیل میں تبدیل کی جاتی ہے۔ اس کا اندازہ یوں کیجئے کہ مشرقی جرمنی کے ایک ماہر

شطرنج اور لکڑی کے مجسمہ ساز نے شطرنج کی دنیا میں ایک نیا انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ شہنشاہیت لعنت ہے جو عوام پر مسلط ہو جاتی ہے اور جس نے جب شطرنج ایجاد کیا تھا تو اس نے اس وقت تقاضائے عہد کے مطابق شہنشاہیت کی لعنت کا بھی اس کھیل میں لحاظ رکھا تھا۔ مگر اب وہ دور نہیں رہا اور شطرنج میں زندگی کے مطابق تغیر و تبدل ہونا چاہیے۔ لہٰذا اسے زندگی اور رفتار عالم کے رجحان و مذاق کے مطابق بنانے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ اس نے شطرنج کی روایتی مہرے بدل دیے ہیں۔ اور ان کی جگہ سوشلسٹ نظام کی مناسبت سے نئے مہرے بنائے ہیں۔ بادشاہ کی جگہ اس نے مزدوروں کا مہرو بنایا ہے جس کے ہاتھ میں اقتصادی منصوبے ہیں اور پیادوں کی جگہ مختلف اہم صنعتوں کے کارکنوں میں تبدیل کر دی ہے۔

برخلاف اس جرمن کے' پاکستان کے مشہور عالمی شطرنج کھلاڑی سردار حکیم رب نواز خاں نے بساط ہی بدل دی ہے اور اس کا نام "ایٹمی شطرنج" رکھا ہے۔ اس ایٹمی شطرنج کی بساط سو خانے کی ہوگی۔ اور انہوں نے بادشاہ و وزیر کو تو نہیں ہٹایا مگر "بمبار" اور "ٹینک" نامی مہرے بھی سولہ پیادوں کے ساتھ رکھے ہیں ان کا کہنا ہے کہ شطرنج دو بادشاہوں کی عسکری مقابلے کی رہنمائی کرتی ہے اور جب فی زمانہ فوج کے ساتھ "بمبار" اور "ٹینک" نہ ہوں تو وہ عسکری زندگی کی پوری پوری نمائندگی کرنے والی شطرنج نہ ہوگی۔ ان کی اس جدت نے اس کھیل کو دلچسپ ہی نہیں۔ بلکہ موجودہ زندگی سے ہمکنار بھی بنا دیا ہے۔ بہرکیف! کھیل اور تفریح کوئی بھی ہو۔ ہرگز افادیت سے خالی نہیں اور کسی بھی کھیل کو مذہباً حرام نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ہاں موجودہ صورت میں یہ تمام کھیل محض جوا ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان پر داؤ لگتے ہیں اور بازیاں بدی جاتی ہیں جو ازروئے قرآن یکسر حرام ہیں۔ یا پھر وہ کھیل لے دے کر صرف تضیع اوقات کا ذریعہ بن گئے ہیں' جو اسلام میں ایک مجرمانہ فعل ہے۔ اس لئے مسلک یہ نہ ہونا چاہیے کہ فی نفسہ کھیلوں ہی کو حرام بتایا جائے بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ ان کی مضرت کو حرام بتایا جائے اور اصلاح کی طرف لوگوں کو رجوع کیا جائے۔ اگر کسی چیز کی افادیت ختم ہو جائے اور مضرت رونما ہو تو بلاشبہ اسلام میں وہ چیز حرام ہے چاہے وہ نماز روزہ ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے اسلام میں فی نفسہ کوئی کھیل حرام نہیں البتہ داؤ اور تضیع اوقات حرام

ہے۔ قرآن نے بیان کیا ہے کہ حساب وفیصلہ کے بعد جنتی اپنے شناساؤں کو جہنم میں جاتے دیکھیں گے تو پوچھیں گے کہ تمہارا یہ حشر کیوں ہوا؟ جہنمی جواب دیں گے کہ ہم دو کام نہیں کرتے تھے اور دو کام کرتے تھے' اسی وجہ سے ہمارا یہ حشر ہوا۔ کرنے والے دو کاموں میں ایک کام یہ "تضیع اوقات" بھی تھا۔

یتسا ءلون . عن المجرمين . ما سلککم فی سقر . قالوا لم نک من المصلین . ولم نک نطعم المسکین و کنا نخوض مع الخائضین . وکنا نکذب بیوم الدین . حتی اتنا الیقین (مدثر ۴۰-۳۹)

ترجمہ "مجرموں کو پوچھتے ہوں گے کہ تمہیں کیا چیز دوزخ میں کھینچ لائی؟ وہ کہیں گے کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں نہ تھے اور نہ مسکینوں کو کھانا کھلاتے تھے' بلکہ ہم بے کار باتیں بنانے والوں میں بیٹھ کر تضیع اوقات کیا کرتے تھے اور ہم کو قیامت کا یقین نہ تھا کہ کسی دن اس بارے میں سوال ہو گا' یہاں تک کہ ہمیں موت نے آلیا"

اس سے ظاہر ہوا کہ نماز کی پابندی اور حتی المقدور غریبوں کو کھلانا' پلانا جنت میں پہنچانے والے افعال ہیں۔ اور یہ سمجھ کر کہ ہم سے ہماری زندگی اور اعمال کے بارے میں کوئی پوچھنے والا نہیں' بیکار باتیں بنانے والوں اور تضیع اوقات کرنے والوں میں بیٹھ کر باتیں بنانا' جہنم میں پہنچانے والی حرکتیں ہیں۔ لہذا عام مسلمانوں کو ہر کام میں افادی پہلوؤں کو مد نظر رکھنا چاہیے' چاہے وہ کوئی کھیل ہی کیوں نہ ہو۔ اس کو تضیع اوقات کا ذریعہ ہرگز نہ بنانا چاہیے۔

حاصل کلام

اسلام میں "فنون لطیفہ" کو حرام نہیں کہا گیا' تصویر کشی' مجسمہ سازی' رقص' موسیقی' شاعری' لہوولعب نہیں بلکہ فنون لطیفہ ہیں' سنت پیغمبری ہیں' فطرت انسانی کے ناقابل تغیر جذبات کی مظہر ہیں اور اسلام دین فطرت کا علم بردار ہے پھر وہ فنون لطیفہ کو حرام کس طرح قرار دے سکتا ہے؟ اس لئے مسلمانوں کو فنون لطیفہ یعنی تصویر کشی' مجسمہ سازی' موسیقی' رقص اور شاعری میں یقیناً" بحیثیت فن اور صنعت کے ایک بلند نصب العین کے ماتحت' اسلامی حدود اور قرآنی تعلیمات کی عظمت کا لحاظ رکھتے ہوئے حصہ لینا چاہیے۔ مسلمانوں کو یہ کبھی فراموش نہ کرنا چاہیے:۔

نمود اس کی فراز خودی سے ہو تو جمیل
جو ہو نشیب میں پیدا' قبیح ونامحمود

اعتدال اور توازن اسلام کا نصب العین اور ایمان کی سرحد ہے۔ اس لئے جو بھی شوق' جو بھی فن اور جو بھی فطری تقاضا غلط راستہ اختیار کرے گا یا حد اعتدال سے بڑھے گا وہ "دین" کی حدود سے نکل کر "فحش" کی فہرست میں آجائے گا۔ علامہ اقبال نے "ضرب کلیم" میں ادبیات وفنون لطیفہ سے متعلق ایک خاص باب رکھا ہے اور سب سے پہلی نظم "دین وہنر" میں فرمایا ہے کہ:۔

سرود وشعر وسیاست' کتاب ودین وہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
ضمیر بندہ خاکی سے ہے نمود ان کی
بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسوں وافسانہ
ہوئی ہے زیر فلک امتوں کی رسوائی

خودی سے جب ادب ودین ہوئے ہیں بیگانہ

اس کے بعد انہوں نے شاعری' موسیقی' مصوری' رقص سب ہی پر اپنی رائے دی ہے اور فنون لطیفہ کا حاصل ہی یہ قرار دیا ہے کہ:

مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا؟

اقبال نے فنون لطیفہ کو حق کا معاون اور باطل کا دشمن قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں جو فن لطیف اسلامی نصب العین اور قوت عمل کو مجروح کرے۔ وہ حرام ہے ورنہ حلال۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے فنون لطیفہ اگر اس اعتبار سے ممتاز و شایان شان نہیں تو وہ بیکار محض ہیں:

اگر نوامیں ہے پوشیدہ موت کا پیغام
حرام میری نگاہوں میں نائے وچنگ ورباب

ان میں سے جس چیز کا بھی رخ تباہی کے غار کی طرف ہو جائے گا۔ جو بھی اخلاقی قدروں کو مٹانے' تمدنی حد بندیوں کو توڑنے اور انسانی واسلامی ذمہ داریوں کو فراموش کرنے کا باعث بنے گا وہ خدائی حدود پھاندنے کے شمار میں آ جائے گا۔ جس کی قرآن سخت ممانعت کرتا ہے۔ بقول حضرت علامہ غلام احمد پرویز اسلام صرف یہ ہے کہ جس چیز میں خیر کا پہلو ہو وہ لے لو اور جو شر کا پہلو ہو وہ چھوڑ دو۔ اور فی نفسہ اپنی ذات سے کوئی بھی چیز' کوئی بھی فن' کوئی بھی صنعت' کوئی بھی شوق نہ خیر ہے نہ شر۔ پانی کا ایک گلاس زندگی بخش ہے' یہ خیر ہے مگر دریا میں جا کر کود جائے تو ڈوب جائیے گا۔ یہ شر ہے۔ پانی اپنی ذات سے نہ شر ہے نہ خیر۔ اسلام کہتا ہے کہ وہ کیجئے اور یہ نہ کیجئے۔ کشتی جب تک توازن سے پانی کے اوپر ہے تو خیر اور توازن کھو کر پانی کے نیچے چلی گئی تو شر۔ فی نفسہ دریا نہ خیر ہے۔ نہ شر۔ چاہے وہ ظاہری ہو یا باطنی۔ ایمانی ہو یا اخلاقی۔ عملی ہو یا قولی۔ معاشرتی ہو یا سماجی۔ "فحش" عریانیت والے حیائی ہی نہیں' جو اسٹیج پر ننگے رقص اور اختلاط غیر تک محدود ہو' بلکہ اس کے حدود بہت وسیع ہیں۔ یہاں تک کہ قرآن کی پیروی نہ کر کے آباؤ اجداد کے غلط خیالات و تصور اور باطل اعمال و افعال

کی اندھی تقلید پر ڈٹے رہنا بھی "فحش" ہے۔ ایک جگہ آیا ہے کہ۔

واذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل اتبع ما الفینا علیہ اباءنا (بقرہ۔ ۲۱)

"اور جب کوئی ان لوگوں سے کہتا ہے کہ اللہ کے نازل کئے ہوئے قرآن کی پیروی کرو تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں بلکہ ہم تو اسی پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے"۔

دوسری جگہ ہے کہ۔

واذا فعلوا فاحشۃ قالوا وجدنا علیھا اباءنا واللہ امرنا بھا قل ان اللہ لا یامر بالفحشاء اتقولون علی اللہ ما لا تعلمون ○ (اعراف۔ ۳)

"اور جب وہ لوگ فواحش کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو یہی کرتے دیکھا ہے اور یہی اللہ کا حکم بھی ہے۔ پوچھو تو کہ اللہ تو فواحش کا حکم دیتا نہیں تو کیا خدا کے ذمہ ایسی بات لگاتے ہو جس کا تم کو علم بھی نہیں؟"

پہلی آیت میں قرآن کی پیروی نہ کرنے میں باپ دادا کی تقلید کرنے کا ذکر ہے اور دوسری آیت میں فواحش کرنے میں، باپ دادا کی تقلید کرنے کا ذکر ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ قرآن کی پیروی نہ کرنا اور اجداد پرستی بھی "فحش" ہی ہے اور "فحش" کو "حرام" کیا گیا ہے۔

قل انما حرم ربی الفواحش ما ظھر منھا وما بطن والاثم والبغی بغیر الحق وان تشرکوا باللہ ما لم ینزل بہ سلطنا وان تقولوا علی اللہ ما لا تعلمون ○ (اعراف۔ ۴)

"کہہ دو! کہ میرے پروردگار نے تمام فواحش کو حرام کر دیا ہے۔ خواہ وہ اعلانیہ ہوں یا پوشیدہ۔ اور ہر گناہ کی بات کو حرام کیا ہے اور ناحق زیادتی کرنے کو بھی اور اس امر کو بھی کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک قرار دو حالانکہ اللہ نے اس کی کوئی دلیل

نازل نہیں کی ہے اور ہاں یہ بھی حرام کیا گیا ہے کہ تم لوگ اللہ کے ذمے ایسی باتیں لگاؤ جس کا تم کو کوئی علم نہیں"۔

فنون لطیفہ بے شک جائز ہیں اور اللہ نے انہیں حرام نہیں کیا مگر عمل و تصور کی طہارت لازمی شے ہے۔ نیت بخیر ضرور ہونی چاہئے۔ اسلام کی ترقی' دین کی عظمت اور امت کی بھلائی کے لئے' قرآن کی روشنی میں جو کچھ ہو گا یا کیا جائے گا وہ جائز اور صحیح ہو گا۔ ورنہ فنون لطیفہ کا کوئی سا بھی شعبہ چاہے وہ تصویر کشی ہو یا مجسمہ سازی۔ رقص ہو یا موسیقی نہ تو فی نفسہ برا ہے اور نہ ہرگز اسلام نے ان میں سے کسی کو بھی حرام یا ناجائز یا ممنوع قرار دیا ہے کیونکہ ان کا تعلق فطرت انسانی اور تمدنی زندگی سے ایسا گہرا ہے کہ انہیں انسان سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اس لئے قرآن انہیں حرام کر ہی نہ سکتا تھا۔ اور چونکہ حرام و حلال' جائز و ناجائز' ممنوع و مباح کا مسئلہ اصولی ہے اور اسلام کے اصول کی کتاب قرآن ہے۔ اس لئے ان کی حلت و حرمت کا فیصلہ قرآن اور صرف قرآن کرے گا۔ اور خدا کی دی ہوئی اجازت کو کوئی انسان مسترد نہیں کر سکتا۔ فطری جذبے پر روایتی افسانہ حاوی نہیں ہو سکتا۔ وحی پر واہمہ بار نہیں پا سکتا اور علم و عقل کی راہ میں ظن و قیاس روڑے نہیں اٹکا سکتا۔ خود جناب رسالتماب کی یہی وصیت تھی۔

عبداللہ بن ابی اوفی سے پوچھا گیا کہ کیا حضورؐ نے وصیت فرمائی تھی؟........ جواب دیا کہ "کتاب اللہ" پر عمل کرنے کی وصیت کی تھی۔"

(روایت نمبر ۱۴۲۸ تجرید البخاری صفحہ نمبر ۲۳۶)

اور اللہ فرماتا ہے کہ۔ ان الحکم الا للہ (یوسف ۸) "حکم کسی کا بھی نہیں' سوائے اللہ کے"۔

آنحضرت صلعم قرآن کے سوا کسی اور چیز کو پکڑنے کی وصیت فرما ہی نہیں سکتے تھے' جبکہ ان کے سامنے یہ واضح حکم خداوندی موجود تھا۔

فاستمسک بالذی اوحی الیک انک علی صراط مستقیم ○ وانہ لذکر لک

ولقومک ج وسوف تسلون (زخرف۔ ۴)

"سو تم پر جو وحی کیا گیا ہے۔ اس پر ڈٹے رہو بلا شبہ تم سیدھے راستے پر ہو۔ اور یہ قرآن تمہارے لئے اور تمہاری قوم کے لئے بھی' بڑے شرف کی چیز ہے۔ اور جلد ہی تم سب سے اس سلسلے میں پرستش ہو گی"۔

اب اس کے بعد بھی ہماری سمجھ میں کچھ نہ آئے تو واقعہ یہ ہے کہ۔

کیف یھدی اللہ قوما کفروا بعد ایما نھم وشھدوا ان الرسول حق وجاء ھم البینت ط واللہ لا یھدی القوم الظلمین ○ اولئک جزاء ھم ان علیھم لعنۃ اللہ والملئکۃ والناس اجمعین خالدین فیھا لا یخفف عنھم العذاب ولا ھم ینظرون ○ (آل عمران۔ ۹)

"اب اللہ ان لوگوں کی کس طرح رہنمائی کرے جو کافر ہو رہے ہیں۔ ایمان لانے کے بعد اور اس اقرار کے بعد کہ قرآن لانے والا رسول سچا ہے اور ان کے پاس واضح احکام آچکے ہیں؟۔ اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ اپنا آپ نقصان کر لینے والوں پر سعادت کی راہ نہیں کھولتا۔ ایسے لوگوں کی سزا تو یہ ہے کہ ان پر اللہ کی بھی لعنت برستی رہے فرشتوں کی بھی اور آدمیوں کی بھی' سب کی۔ اسی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ نہ تو ان کا عذاب کبھی کم ہو گا۔ اور نہ ان کو کوئی مہلت ہی دی جائے گی۔"

دوست ایسوسی ایٹس

الکریم مارکیٹ اردو بازار' لاہور - فون : 7122981

تفسیر بیان للناس (مکمل سیٹ)	خواجہ احمد الدین	۲۰۰۰/-
تفسیر بیان للناس جلد اول	خواجہ احمد الدین	۵۰۰/-
تفسیر بیان للناس جلد دوم و سوم	خواجہ احمد الدین	۵۰۰/-
تفسیر بیان للناس جلد چہارم و پنجم	خواجہ احمد الدین	۵۵۰/-
تفسیر بیان للناس جلد ششم و ہفتم	خواجہ احمد الدین	۴۵۰/-
تفسیر منسوخ القرآن (نیا ایڈیشن)	علامہ رحمت اللہ طارق	۴۵۰/-
تاریخ فرشتہ (مکمل ۴ حصے ۲ جلد)	محمد قاسم فرشتہ	۶۰۰/-
تحریک پاکستان کی تصویری داستان	مرتب : عطاء الرحمٰن	/-
نفحات الانس	مولانا عبدالرحمٰن جامی	۳۰۰/-
دنیا کی عظیم کتابیں	مترجم : غلام رسول مہر	۳۰۰/-
عجائب المخلوقات	عماد الدین الکمونی قزوینی	۳۰۰/-
قرآن سے قرآن تک	علامہ محمد حسین عرشی	۳۲۰/-
مضامین تصوف	مولف محمد ادریس	۱۵۰/-
تاریخ طبری کے ماخذ	ڈاکٹر جواد علی / نثار احمد فاروقی	۱۰۰/-
سونے کے زیورات کی شرعی حیثیت	پروفیسر رفیع اللہ شہاب	۷۵/-
فجر الاسلام	علامہ احمد امین مصری	۳۰۰/-
وحدت الوجود ایک غیر اسلامی نظریہ	الطاف احمد اعظمی	۱۰۰/-
خطبات میر تالنبی	سر سید احمد خان	۳۰۰/-
تفسیر القرآن (مکمل)	سر سید احمد خان	۶۰۰/-
حقائق الاسلام	حافظ محمد سرور کوہاٹی	۱۵۰/-